امریکی یاترا

رضیہ بٹ





میرے سامنے میز پر ابھرے ابھرے سنہری حروف والا خوبصورت اور قیمتی ویڈنگ کارڈ پڑا تھا۔ کارڈ انگریزی میں تھا اور امریکہ سے آیا تھا۔

اس میں میری بہن ڈاکٹر شمیم کی اکلوتی بیٹی صائمہ کی شادی کی نوید تھی۔ اس کی شادی ہونے کا علم تو کئی ماہ سے تھا' لیکن بلاوے کا کارڈ دو دن ہوئے مجھے ملا تھا۔ شمیم نے صائمہ کی شادی پر مجھے مدعو کیا تھا۔ یہ کارڈ سب بہن بھائیوں کو بھیجے گئے تھے اور جانے والے تیاریوں میں بھی مصروف ہو گئے تھے۔ بات یہ نہیں تھی کہ انہیں امریکہ جانے کی لگن تھی۔ سارے بہن بھائی امریکہ دیکھ چکے تھے۔ کوئی ایک دفعہ کوئی دو دفعہ وہاں جا چکا تھا۔ اس لیے انہیں وہاں جانے اور امریکہ دیکھنے کا تجسس یقیناً نہیں تھا۔ وہ تو صرف شادی میں شرکت کے لیے وہاں جا رہے تھے۔

اس لیے

کہ

یہ شادی شمیم کی زندگی کی پہلی بڑی خوشی تھی۔ اس خوشی میں سب شریک ہونا چاہتے تھے۔

لیکن

میں

کارڈ سامنے رکھے سوچوں میں گم تھی۔ سب بہن بھائیوں میں ایک میں ہی تھی جس نے امریکہ نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹی بہن سلمٰی ناہید بھی امریکہ نہیں گئی تھی' لیکن وہ لندن

گھوم پھر آئی تھی اور اب امریکہ جانے کا بھی اسے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

مسئلہ تھا تو میرے لیے۔

دل جانے کو چاہتا بھی تھا۔ نئی سرزمین دیکھنے کی خواہش بھی تھی اور صائمہ کی شادی میں شریک ہو کر شمیم کی خوشیوں کو دوبالا کرنے کو بھی جی چاہتا تھا۔

لیکن

امریکہ جانا میرے لیے سہل نہیں تھا۔

یہ نومبر 1997ء کی بات ہے۔ تب ڈالر پینتالیس چھیالیس روپے کا تھا اور امریکہ کا صرف ٹکٹ ہی ہزار گیارہ سو ڈالر کا تھا۔

شمیم نیو جرسی میں رہتی ہے۔ وہ 1975ء میں امریکہ گئی تھی۔ اینستھیزیا کی سپیشلسٹ ہے۔ وہ بہت بڑی ڈاکٹر ہے اور مالی طور پر بے حد مضبوط اور مستحکم ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے بارہ سال چھوٹی ہے۔

میڈیکل اس نے خیبر میڈیکل کالج پشاور سے کیا تھا۔ اس کالج کے پہلے گروپ کی ڈاکٹر ہے۔ ہاؤس جاب اور اینستھیزیا میں کوالی فائے لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں کیا۔

ہمارا تعلق سیالکوٹ کے معزز کشمیری خاندان سے ہے' لیکن ہمارے والد 1922ء میں بزنس کے سلسلے میں ترک وطن کر کے پنڈی آ گئے تھے۔ پھر یہاں سے دس سال بعد پشاور شفٹ ہو گئے۔ ہم سب بہن بھائیوں کی تعلیم اور شادیاں پشاور رہ کر ہی کیں۔ سب بہن بھائیوں میں سے آٹھ کے رشتے پنجاب ہی میں طے ہوئے۔

لیکن آپا نذیرا اور شمیم کی شادیاں پشاور ہی میں ہوئیں۔

شمیم ای این ٹی سپیشلسٹ ڈاکٹر محمد اقبال سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئی۔

اقبال نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے میڈیکل کیا تھا۔ ڈاکٹر بن کر پشاور لیڈی ریڈنگ میں جاب کی۔ وہ پشاور ہی کے رہنے والے تھے۔ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے اور دس بہنوں کے واحد بھائی تھے۔

اقبال نے دوران تعلیم ایک خوبصورت نرس سے شادی کر لی تھی' جس سے ان کی

والدین سے بھی علیحدگی ہوئی۔ بدقسمتی سے اس عورت کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ نہ ہی کچھ میڈیکل وجوہ کی بنا پر بچے ہو سکتے تھے۔ اقبال چونکہ ایک اکلوتے بیٹے تھے۔ والد امیر کبیر اور صاحب جائیداد آدمی تھے۔ ان کی بیٹے سے علیحدگی زیادہ دیر نہ رہ سکی۔ بیٹے کو گھر لے آئے۔

لیکن

جب کئی سال ان کا گھر بچوں کی چہکار سے محروم رہا' تو ماں باپ نے اقبال کی دوسری شادی کرنے کا سوچا۔ خود اقبال بھی شاید بچوں کی شدت سے چاہت کر رہے تھے اس لیے دوسری شادی پر رضامند ہو گئے۔

یوں

ان کی شادی شمیم سے ہو گئی۔

گیارہ ماہ بعد شمیم کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ بہت خوبصورت اور پیارا سا بچہ۔ اس کا نام آصف رکھا گیا۔ والدین' بہنوں' رشتہ داروں اور عزیزوں کو تو جو خوشی ہوئی سو ہوئی۔ پورے ہسپتال کے عملے نے خوشی کا دیوانہ وار اظہار کیا۔ اس دن یوں لگ رہا تھا جیسے کسی خوشی کے تہوار پر جلوس نکلا ہوا ہے۔ پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ دعائیں دی جا رہی تھیں۔ خوشی سے نعرے لگائے جا رہے تھے۔

مجھے یاد ہے شمیم کی ساس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بوجھل تھیں اور وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔

''اللہ ہمارے گھر میں بھی تین مرد ہو گئے......''

چھتیس سال بعد یعنی اقبال کے بعد ان کے گھر میں آصف اقبال پیدا ہوا تھا۔ درمیانی عرصہ دس لڑکیوں پر محیط تھا۔ اب دادا' باپ اور پوتا تین مرد گھر میں ہو گئے تھے۔

آصف ابھی دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ شمیم کے ہاں صائمہ پیدا ہوئی۔ صائمہ بھی بہت پیاری گول مٹول سی بچی تھی۔

شمیم کی شادی کو تین سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ خدا نے بیٹے بیٹی سے نواز دیا۔ لیکن

وہ ان خوشیوں سے بھرپور انداز میں لطف اندوز نہ ہو سکی۔ گھر میں سوتن موجود تھی اور اقبال کی مرضی تھی کہ بچے ان کی پہلی بیوی کی گود میں ڈال دیے جائیں وہی ان کی پرورش کرے۔ شمیم جیسے پہلے جاب کر رہی ہے کرتی رہے۔ سسرال والے بھی اقبال کے حامی تھے۔

لیکن ایک ماں اپنی متاع حیات ایک دوسری عورت جو اس کی سوتن تھی' کی جھولی میں نہ ڈال سکی۔ شمیم نے ازدواجی زندگی کا لطف و سکون تو شروع ہی سے نہ پایا تھا' لیکن اب یہ نئی افتاد...... گھر میں ہر وقت کی چخ چخ' بک بک نے زندگی اجیرن کر دی۔ لڑائی جھگڑا معمول بن گیا۔ سکون پہلے ہی کہاں تھا۔ اب تو بے سکونی کی انتہا ہو گئی۔

پھر

ایک بہت بڑا سانحہ وقوع پذیر ہوا۔ صائمہ ابھی صرف آٹھ ماہ کی تھی اور آصف دو اڑھائی سال کا کہ اقبال صرف آدھ گھنٹے میں سارے دنیاوی جھنجھٹوں سے آزاد ہو گئے۔ چار بجے انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور ساڑھے چار وہ سب سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔

شمیم ازدواجی زندگی کے تین سال پورے ہونے سے پہلے ہی بیوگی کی چادر اوڑھ بیٹھی۔

اب اس کے مصائب' تکالیف اور ذہنی کوفتوں کا ایک اور دور شروع ہو گیا۔ سسرال کی بہت بڑی جائیداد اور مال و زر اس کے لیے بہت بڑی زحمت بن گئے۔ اقبال کے گھر سے اسے باہر کر دیا گیا۔ مقدمے بازیاں شروع ہو گئیں۔ بچوں کو چھیننے کے لیے دعوے دائر کیے گئے۔

اس نے بہت دکھ جھیلے۔

پھر

ان سب مصائب سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی حل اسے سوجھا کہ سسرال کی جائیداد اور دھن دولت پر لات مار دے اور اپنے بچوں کے لیے گوشۂ عافیت ڈھونڈ لے۔

یوں

وہ پشاور سے سیدھی امریکہ جا پہنچی۔ بچے کچھ دیر واحد بھائی اور رقیہ بھابی کے

پاس رہے۔ وہ امریکہ میں پاؤں جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ جب اسے جاب مل گئی اور وہ امریکہ میں ٹھیک طرح سے سیٹل ہو گئی تو بچوں کو بلا بھیجا۔ واحد بھائی اور رقیہ بھابی بچے امریکہ لے گئے۔

شمیم نے شروع کے ایام وہاں بھی مشکلوں سے دوچار ہو کر کاٹے۔ چھوٹے چھوٹے دو بچوں کا ساتھ اور اس دیس کا معاملہ جہاں نوکری کے ساتھ گھر بار اور بچوں کا بھی سارا کام خود کرنا پڑتا تھا۔ خاصا مشکل تھا۔

لیکن

یہ مشکل پشاور کی مشکلوں سے آسان تھی۔ بھلے اسے سسرال کی دولت نہ ملی' لیکن اس کی دولت اس کے بچے اس کے پاس تھے۔ جنہیں اس نے پالا پوسا۔ پڑھایا لکھایا' اچھے انسٹی ٹیوٹ سے تعلیم دلوائی۔

مشکلیں حل ہونے ہی کے لیے ہوتی ہیں۔ شمیم نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ بچوں کے لیے ڈھال بنی...... یوں اپنی اور بچوں کی زندگی بنالی۔

بچے شادی کے قابل ہو گئے۔ آصف اپنی خالہ زاد آمنہ سے شادی کا خواہشمند تھا۔ ایک دفعہ پاکستان آیا تو آمنہ سے شادی کر لی۔ اس شادی میں شمیم شریک نہ تھی...... جس کا اسے بہت دکھ تھا۔ بہرحال آصف آمنہ کو لے کر امریکہ چلا گیا...... حالات آہستہ آہستہ نارمل ہو گئے۔ ماں بیٹے میں جو شکر رنجی پیدا ہوئی تھی' دور ہو گئی۔

میں نے شمیم کا تذکرہ اور تعارف اس لیے کرایا ہے کہ بتا دوں صائمہ کی شادی شمیم کی زندگی کی پہلی بڑی خوشی تھی اور اس بہن کی خوشی میں شریک نہ ہونا اچھی بات نہ تھی۔ ہم بہن بھائیوں کے سوا اس کا تھا ہی کون۔ میری بڑی دونوں بہنیں آپا رشیدہ اور آپا نذیر فوت ہو چکی تھیں۔ ماں باپ تھے نہیں۔ اب میں ہی بڑی تھی سب میں۔ اس لیے شادی میں شرکت فرض کی طرح لازمی تھی۔

لیکن

پھر وہی سوچ...... شادی پہ جانا آسان نہیں تھا۔ بہت بڑا خرچہ تھا۔

بٹ صاحب ایک سال پہلے فوت ہو چکے تھے۔ آمدنی کا بڑا سلسلہ کٹ چکا تھا۔
اب جو کچھ پاس تھا اسے سینت سنبھال کر ہی رکھنا تھا۔

پھر

پھر

کیا کروں؟

شمیم کو یہیں سے شادی کی مبارک باد دے دوں؟

شادی میں شرکت کے لیے جانے والوں کے ہاتھ تحفہ بھیج دوں؟

کچھ سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔

کئی دن اپنی سوچوں کی نذر ہو گئے۔

کبھی سوچتی امریکہ جانے کی ہمت کر ہی لوں...... پیسہ آنی جانی چیز ہے' لیکن یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔ شمیم کی خوشیوں کو دیکھنے ان میں شریک ہونے اور اسے خوشیاں دینے کا موقع۔

کبھی پلان بناتی کہ یہیں سے لمبا چوڑا فون کر کے مبارک باد دے دوں گی اور صائمہ کے لیے اچھا سا تحفہ بھجوا دوں گی۔

میری کوئی سوچ بھی مثبت نتائج کی حامل نہ ہوتی۔ اس پر سب بیٹیوں کا اصرار کہ میں ضرور امریکہ جاؤں...... امریکہ دیکھنے کے لیے تو لوگ موقعے کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ آپ کو موقع مل رہا ہے اور آپ کشمکش و پیچ میں ہیں۔

میں نے اپنے مالی حالات کی تفصیل کبھی بیٹیوں کو بھی نہیں بتائی۔ اس لیے ان کی باتوں کا گول مول جواب دے دیتی۔

میں کشمکش اور تذبذب ہی سے گزر رہی تھی کہ راولپنڈی سے میرے چھوٹے بھائی بریگیڈیئر خالد رشید کا فون آ گیا۔

خالد کئی دفعہ امریکہ جا چکا تھا۔ اس کا اور شمیم کا اپنا حساب کتاب تھا۔ جب وہ امریکہ جاتا تو شمیم سے ڈالر لے کر خرچ کر لیتا۔ جب شمیم پاکستان آتی تو پاکستانی روپیہ

خالد سے لے لیتی۔ یوں جمع تفریق ان کی اپنی تھی۔ ویسے طریق یہی تھا۔

خالد کا فون آیا' علیک سلیک اور خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد وہ بولا۔

''آپا آپ نے امریکہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔''

''نہیں بھئی'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا ''میں تو نہیں جا رہی۔''

''کیوں۔''

''کیوں کا کیا جواب دوں خالد۔''

''آپا شمو نے تاکید کی ہے۔ آپ نے ضرور جانا ہے۔'' وہ بولا۔ شمیم کو ہم لوگ پیار کے نام 'شمو' سے پکارتے ہیں......

''دیکھوں گی۔''

''اب دیکھنے کے لیے کتنے دن رہ گئے ہیں۔ آپ تیاری کریں۔ گڈی' نسیمی اور آپ تینوں بہنیں اور رقیہ بھابی کے ساتھ اختر بھائی بھی جائیں گے۔''

میں کچھ دیر چپ رہی

تو

وہ بولا ''شمو آپ سب کے ٹکٹ دے رہی ہے آنے جانے کے۔''

''شمو ٹکٹ دے رہی ہے؟''

''ہاں۔ اس نے مجھے فون کر دیا ہے کہ آپ سب کے ٹکٹ خرید لوں۔ سو آپ جانے کی تیاری کریں۔''

''ہوں۔''

''آپ کا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے نا۔''

''ہاں۔''

''ویزے کے لیے آپ کو پنڈی آنا پڑے گا......''

''وہ تو آنا پڑے گا۔ پہلے جانے کا تو سوچ لوں۔''

''اب کیا سوچنا ہے۔ ٹکٹ فری مل جائیں گے۔ باقی کیا؟''

"باقی بھی بہت کچھ ہے۔"

"بس مجھے نہیں پتہ۔ آپ پانچوں کے ٹکٹ میں خرید لوں گا۔ آپ تیاریاں شروع کریں......"

"اچھا......"

اس کے بعد ادھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔

اب میری سوچوں کا رخ اور سمت مڑ گیا۔ ٹکٹ فری ملنے کے باوجود بھی کافی خرچہ تھا۔ شادی پہ جانے کے لیے اپنی تیاری۔ پھر وہاں لے جانے کے لیے تحفے تحائف...... ان دنوں میری نواسی بشرہ بھی نیوجرسی میں تھی۔ ڈاکٹر بشرہ کی شادی فاران (انجینئر) سے ہوئی تھی، جو دس بارہ سال سے امریکہ میں مقیم تھے۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی بشرہ بھی امریکہ چلی گئی تھی۔ اس کا بچہ بھی ہونے والا تھا۔

دوسری نواسی ریشم بھی امریکہ میں تھی۔ وہ کیلیفورنیا کے شہر سان ڈیگو میں رہتی تھی...... اسے وہاں گئے اڑھائی تین سال ہو رہے تھے۔ ریشم روبی اور حسنین کی بیٹی ہے۔ روبی اور حسنین دونوں نے کہہ دیا تھا کہ اگر میں امریکہ گئی تو ریشم سے ضرور مل کر آؤں گی۔ ہوسکتا ہے ریشم بھی شادی میں شریک ہو۔ اگر وہ نہ آئی تو مجھے اس سے ملنے ضرور جانا ہوگا۔

اب دیکھیں بشرہ تو خیر نیوجرسی میں تھی۔ ریشم انتہائی جنوب مغرب میں۔ نیویارک سے سان ڈیگو کافی زیادہ دور تھا۔

اس کے علاوہ چھوٹی بہن نسیمی کی دو بیٹیاں آمنہ اور حمیرا بھی نیویارک اور نیوجرسی میں تھیں۔ میرے دیور اصغر کی بیٹی صائمہ بھی نیویارک میں تھی۔ کسی کے ہاں بھی خالی ہاتھ نہ جا سکتی تھی۔ مفت کا ٹکٹ ہونے کے باوجود کافی پیسے چاہئیں تھے۔

لیکن

خیر

آخر

میں نے اپنے آپ کو "ارادے باندھتا ہوں توڑ دیتا ہوں" والی کیفیت سے نکالا اور امریکہ جانے کا ارادہ کر ہی لیا۔

اب ویزے کا مسئلہ تھا۔ ان دنوں ویزے آسانی سے نہ لگتے تھے۔ ویزے کے لیے پنڈی امریکن ایمبیسی کے ویزا سیکشن میں جانا پڑتا تھا۔ میں نے پاسپورٹ نکالا اور پنڈی جانے کی تیاری کرنے لگی۔



میں اپنا پاسپورٹ اور دیگر ضروری مطلوبہ کاغذات لے کر پنڈی واحد بھائی کے ہاں پہنچ گئی۔ میرا یہ مرحوم بھائی ان دنوں ٹھیک ٹھاک صحت مند تھا۔ میں جب بھی پنڈی جاتی واحد کے ہاں ہی پہلے جاتی۔ واحد اور رقیہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے استقبال کرتے۔ واحد مجھ سے چھوٹا تھا' لیکن ہمیشہ اس طرح پیش آتا تھا جیسے بھائی نہیں مشفق باپ ہے۔ وہ بے اولاد تھا' لیکن اس نے اپنی محبتیں اور شفقتیں بہن بھائیوں اور ان کے بچوں پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ خدا اسے پہلو پہلو جنت دے آمین۔

ہاں

تو

میں پنڈی پہنچی۔ رقیہ کا پروگرام بھی بن چکا تھا۔ واحد نہیں جا رہا تھا۔ رقیہ اور وہ پہلے دو دفعہ امریکہ ہو آئے تھے۔ آصف اور صائمہ چونکہ بچپن میں کچھ عرصہ ان کے پاس رہے تھے۔ اس لیے وہ انہیں اپنے حقیقی بچوں ہی کی طرح جانتے تھے۔ واحد کو چونکہ کچھ عرصہ پہلے معمولی سی دل کی تکلیف ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ اتنے لمبے سفر پر جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔

گوجرانوالہ سے نسیمی جا رہی تھی۔ لاہور ہی سے چھوٹی بہن گڈی (سلمٰی ناہید) اور اس کے بیٹے احمد نے جانا تھا۔ احمد ڈاکٹر بن چکا تھا۔ امریکہ میں ہائیر سٹڈیز کے لیے U.S.M.L.E کا امتحان پاس کرنا ضروری ہوتا ہے۔ احمد نے سٹیپ ون بنکاک سے کر لیا تھا۔ اب سٹیپ ٹو کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ امریکہ جا کر امتحان دینا چاہتا تھا۔ ماشاءاللہ بے حد

ذہین اور لائق ہے...... امتحان اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ ویزے کا تھا۔ اس امتحان کے پاس کر لینے پر اسے وہاں ریزیڈنسی مل سکتی تھی۔

رقیہ اور نسیمی کے لیے ویزا ملنے کا بہت امکان تھا۔ دونوں دو دو دفعہ امریکہ ہو آئی تھیں...... جا کر واپس آ جانے والوں کے لیے ویزے کی زیادہ پرابلم نہیں ہوتی۔

میرا' گڈی اور احمد کا ویزا الگنا نہ اور ہاں کے بین بین تھا۔ ان دنوں امریکن ویزا آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ خاص کر نوجوانوں کو...... اور پھر ڈاکٹرز کے لیے ویزا حاصل کرنا بہت ہی مشکل تھا۔

میں پنڈی پہنچی۔ تو واحد نے مسکرا کر کہا" واہ آپا۔ اک نئی دنیا دیکھنے کا آپ کو ایسا نادر موقع مل رہا تھا اور آپ شش و پنج میں تھیں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔"

"بڑی باتیں سوچنے کی ہوتی ہیں میرے بھائی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آپا۔ پر ایسے موقعے بار بار نہیں ملتے اور خیر اب تو شمو نے ٹکٹ دینے کا کہہ کر مسئلہ حل کر دیا ہے۔"

"ہاں۔ کسی حد تک۔"

"ویسے میں بھی پہلے ڈانواں ڈول ہی تھا' لیکن صائمہ کی شادی میں ہم دونوں میں سے ایک کی شرکت تو ضروری ہی تھی۔"

واحد پہلے پشاور میں تھا۔ اباجی کا بزنس پوری طرح چلا رہا تھا' لیکن جب سے دل کی تکلیف ہوئی۔ اس نے بزنس بند کر دیا تھا۔ پیسہ سمیٹ سماٹ کر قومی بچت سکیم میں لگا دیا تھا۔

میرے باقی تینوں بھائی جنرل ڈاکٹر منظور' بریگیڈیئر خالد اور میجر سعید پنڈی ہی میں سیٹل تھے۔ انہوں نے واحد کو بھی پنڈی بلا لیا۔ بیماری سستی کے وقت پنڈی میں رہتے ہوئے وہ اس کی دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ منظور کی وجہ سے پنڈی میں اسے سہولت بھی کافی تھی۔ سعید کا بیٹا ڈاکٹر سمیع اور بنی ڈاکٹر ثوبیہ بھی یہاں ضرورت کے وقت اس کے پاس جا سکتے تھے۔ بہرحال یہ الگ بات کہ پنڈی آ کر خدا نے اسے اتنی اچھی صحت دی کہ کسی کو

تکلیف اٹھانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

میں اور واحد کافی دیر یہی باتیں کرتے رہے۔ باقی سب بہن بھائی اتنے آسودہ حال تھے کہ کھلے بندوں خرچ کر سکتے تھے۔ ہم دونوں ہی تھے جنہیں سنبھل کر احتیاط سے قدم اٹھانا پڑتا تھا۔

بہرحال

رقیہ نے تو جانا ہی تھا اور اب میں بھی تیار ہو گئی تھی۔ ٹکٹ نے واقعی بڑی حد تک ہمارا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

"میں تو ویزے کے لیے آئی ہوں۔" دوسرے دن میں نے رقیہ سے کہا "تم بھی نکلوا اپنا پاسپورٹ۔ دونوں اکٹھے ہی ویزا لگوانے چلتے ہیں۔"

رقیہ بولی "آپا میرا تو ابھی پاسپورٹ بننا ہے۔"

"تمہارا پاسپورٹ کہاں گیا۔"

"ایکسپائر ہو چکا کب کا۔ پھر بنوایا ہی نہیں تھا۔"

"اچھا......"

"کوئی بات نہیں واحد آٹھ دن میں پاسپورٹ بنوا دیں گے۔ پھر یہ پرانا پاسپورٹ بھی ساتھ لگا دیں گے۔ تاکہ ایمبیسی والے دیکھ لیں کہ میں دو دفعہ امریکہ جا کر واپس آ چکی ہوں۔"

"ہاں بھئی۔ تمہارا ویزا لگنا تو یقینی ہے۔"

"انشاء اللہ آپ کا بھی لگ جائے گا......"

"اب جانے کے لیے رختِ سفر باندھ ہی لیا ہے تو ویزا بھی مل جانا چاہیے۔"

"مل جائے گا۔"

"ضروری بھی نہیں۔"

"اے ہے۔ ضروری کیوں نہیں...... آپ انہیں کہہ دیجیے گا کہ میری بیوہ بہن کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہے اور میں نے ضرور شرکت کرنی ہے۔"

ہم دونوں اس بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑیں......

"آپ کب چلیں گی ویزے کے لیے۔"

"کل چلے چلتے ہیں۔ تمہارا تو پاسپورٹ ابھی بنا ہی نہیں، بنے گا تو جاؤ گی نا۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے کل ہم دونوں چلتے ہیں۔ آپ اکیلی تو نہیں جائیں گی۔"

"اکیلی کہاں جاؤں گی۔ مجھے تو پتا ہی نہیں کہاں جانا ہے۔"

"میں جو ہوں۔ مجھے امریکن ایمبیسی کے ویزا سیکشن کی جگہ کا پتا ہے۔ میں اور آپ کل چلیں گے۔"

"جائیں گے کیسے۔"

"سعدیہ ہمیں اسلام آباد جاتے ہوئے چھوڑ دے گی۔ واپسی پر پک کر لے گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

دوسرے دن صبح صبح ہمیں خالد کی چھوٹی بیٹی سعدیہ لینے آ گئی اور ہم دونوں اس کے ساتھ چل دیں۔

سعدیہ نے ہمیں امریکن ایمبیسی کے ویزا سیکشن کی عمارت کے باہر اتارا اور خود اسلام آباد چلی گئی۔ واپسی کا پتا نہیں تھا کہ کس وقت فارغ ہوں گے۔ اس لیے ہم نے اسے منع کر دیا، ہم ٹیکسی لے کر واپس جا سکتے تھے۔ واحد کی گاڑی تو تھی، لیکن ان دنوں ڈاکٹر نے اسے ڈرائیونگ سے منع کیا ہوا تھا۔ میں ڈرائیو کر سکتی تھی، لیکن پنڈی میں اور وہ بھی دوسرے کی گاڑی پر ڈرائیو کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے گاڑی نہیں لائے تھے، سعدیہ کے ساتھ پروگرام بنا تھا۔

چلو پہنچ تو گئے۔ واپسی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اصل مسئلہ تو تھا ویزا لگنے کا۔

ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے کافی لوگ پہنچ چکے تھے۔ ایمبیسی کے باہر بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ لوگ کھڑے تھے۔ کچھ خواتین پتھروں کی نشست بنا کر بیٹھی تھیں کچھ کے ساتھ بچے تھے، جو ابھی سے تنگ پڑ گئے تھے۔ نہ تو کوئی بنچ پڑے تھے۔ نہ ہی

سائے کے لیے کوئی ٹینٹ تھے۔ یہ ستمبر کا آخر یا اکتوبر کا شروع تھا' اور دھوپ میں ابھی حدت کافی ہوتی تھی۔

ان دنوں کراچی کی امریکن ایمبیسی بند کر دی گئی تھی۔ دو امریکنوں کو گاڑی پر فائر کر کے جب سے قتل کر دیا گیا تھا' ایمبیسی بند تھی۔ اب ملک بھر سے ویزے کے لیے لوگوں کو اسلام آباد آنا پڑتا تھا۔

کراچی کے کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ بیزاری کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ کراچی سے آنا' ہوٹل میں ٹھہرنا' ویزا ملے نہ ملے' پھر واپس جانا خاصا مشکل مرحلہ تھا۔ ضرورتمند لوگ اپنا وقت مشکل سزا کی طرح کاٹ رہے تھے۔

وقت گزارنے کے لیے میں اور رقیہ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ ویزا لینے کے لیے دوسرے شہروں سے آنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں اکثریت ان کی تھی جن کی شادیاں ہونے کے بعد شوہر امریکہ چلے گئے تھے اور اب بیویاں ویزے کے لیے سرگرداں تھیں۔ کسی کی شادی کو چھ ماہ' کسی کو سال اور ایک کو تو چار سال ہو گئے تھے۔ ابھی تک ویزا نہ مل سکا تھا۔ تین سال کا بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ شادی شدہ "بیچاریاں" اکیلی نہیں آئی ہوئی تھیں۔ کسی کے ساتھ باپ تھا' کسی کے ساتھ بھائی۔ دو ایک کی مائیں بھی تھیں۔ ایک نو بیاہتا لڑکی جس کی گود میں بچی تھی' اپنی شادی کو کوس بھی رہی تھی۔ شاید اس نے امریکہ جانے کے لالچ میں کسی پاکستانی رشتے کو ٹھکرا دیا تھا...... خاوند کے ساتھ ہی جانے کا امکان تھا' لیکن ویزا نہ ملا تھا۔ اب دوسری کوشش کر رہی تھی۔ پریشان بھی تھی روہانسی بھی اور غصے میں بھی' لیکن کر کیا سکتی تھی۔ معاملہ تو حالات اور امریکنوں کے رحم و کرم پہ تھا۔

اسی طرح چند معمر والدین بھی تھے۔ جن کے بچے امریکہ میں تھے اور وہ ان سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ جیتے جی بچوں کے پاس جانے اور رہنے کی خواہش تھی۔ ویزا ملنے کی زیرِ لب دعائیں مانگ رہے تھے۔

پڑھے لکھے نوجوان بھی تھے۔ کوئی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانے کے لیے

بیتاب تھا۔ کوئی نوکری پانے کے لیے۔ کسی نے بزنس کرنا تھا۔ غرضیکہ رنگا رنگ لوگ تھے' جو پورے پاکستان سے دیارِ غیر میں جانے کی بیتابیوں کو گلے لگائے مضطربانہ گھوم پھر رہے تھے...... ایمبیسی کے ویزا سیکشن کے کھلنے کے انتظار میں تھے۔ غالباً دس بجے اندر بلایا جاتا تھا۔ جہاں فارم جمع کروانے کے بعد ایک ہال میں جا کر بیٹھنا تھا۔

وقت پر اندر سے بلائے جانے پر دروازہ کھول دیا گیا اور مجھے حیرت ہوئی کہ ویزا کے لیے اپلائی کرنے والے بڑی تنظیم سے لائنیں بنا کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے اگلے کو دھکا دے کر اپنے لیے جگہ نہ بنائی۔ نہ ہی کسی نے تو تو میں میں کی کہ میں پہلے آیا تھا اور میری جگہ آگے ہونی چاہیے۔ نہ لڑائی نہ ہی جھگڑا۔ بس سب بڑے آرام سے لائن میں لگ گئے اور ایک ایک کر کے دروازے کے اندر داخل ہونے لگے۔

رقیہ ایک پتھریلے چبوترے پر درخت کے نیچے عورتوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ویزا لینے والوں کے ساتھ جو لوگ آئے تھے' وہ باہر میدان ہی میں تھے۔ کوئی بیٹھا تھا۔ کوئی اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ جن کی بیٹیاں اپنے شوہروں کے پاس جانے کے لیے ویزا لینے کی امید میں اندر گئی تھیں۔ وہ ان کے لیے گھومتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دعائیں کر رہے تھے۔

میں نے بھی لائن میں لگنے سے پہلے ہنس کر رقیہ سے کہا "دعا کرنا میرا ویزا لگ جائے۔"

"انشاءاللہ لگ جائے گا......"

"اتنی پُر یقین ہو۔"

"اللہ کی مہربانی ہے۔"

وہ ہنسی اور میں لائن میں جا کھڑی ہوئی۔

آہستہ

آہستہ

لوگ اپنے اپنے ڈاکومنٹس بغلوں میں دبائے' بریف کیسوں میں رکھے اور سینوں سے لگائے اندر جانے لگے۔

میری باری بھی آئی۔ میں نے اپنی فائل ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ بینک اکاؤنٹ اور انکم ٹیکس کے کاغذات کے ساتھ پاسپورٹ اور ویزا فیس وغیرہ تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر دائیں ہاتھ کے دروازے سے لوگ باہر نکل رہے تھے۔

وہ ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ جس کے ایک طرف ویزا فیس اور فارم جمع کرانے کے لیے کمرہ تھا۔ شیشے کی کھڑکی میں کاغذ اندر دینے کے لیے جگہ بنی تھی۔ اپنی باری پر میں نے بھی فیس جمع کرائی جو اس وقت آٹھ سو روپے تھی۔ اس سے فارغ ہو کر ہم ہال کے باہر بنچوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ کھڑے تھے کچھ ٹہل رہے تھے۔ بیتابی کا عالم چہروں سے عیاں تھا۔

پھر

باری باری ہال میں بلایا گیا۔ خاصا بڑا ہال تھا جس میں کرسیاں بچھی تھیں...... کافی لوگ بیٹھ چکے تھے۔ اس ہال کے سامنے اور بائیں جانب کھڑکیاں تھیں جن میں ویزے کے لیے کارروائی کرنے والے بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی شیشے تھے جن میں کاغذات اندر دینے کے لیے جگہ بنی تھی۔ کھڑکیوں کے اوپر نمبر لکھے تھے۔ غالباً ایک سے دس نمبر کھڑکیوں کے تھے۔

ہال میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ والی پہلی کھڑکی میں پاسپورٹ دینا ہوتا تھا۔ وہاں ایک پاکستانی بیٹھا تھا۔ باقی سب کھڑکیوں میں شیشوں کے پیچھے امریکنوں کے چہرے نظر آ رہے تھے۔

میں نے بھی پاسپورٹ دیا اور ساتھ فارم بھی۔

"آپ انگریزی میں انٹرویو دینا چاہیں گی یا اردو میں۔"

میں نے فوراً جواب دیا "اردو میں......"

"اپنی جگہ پر تشریف رکھیے۔" اس نے پاسپورٹ لے کر کہا۔ "آپ رائٹر ہیں نا۔"

"جی......" میں بولی۔

میں کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ دائیں بائیں آگے پیچھے ساری سیٹیں پر تھیں۔

جس شخص کو انٹرویو اور کاغذات چیک کرنے کے لیے بلانا مقصود ہوتا۔ اس کا نام

پکارا جاتا اور کہا جاتا فلاں نمبر کھڑکی کے سامنے حاضر ہو جائے۔ بعض لوگوں کا انٹرویو منٹوں میں نپٹایا جا رہا تھا۔ بعض کا کافی دیر میں۔ کاغذات کی جانچ پڑتال بھی ہو رہی تھی......

جن کو ویزا دینا ہوتا ان کو کہہ دیا جاتا کہ دوپہر تین بجے آ کر پاسپورٹ لے جائیں۔ ورنہ انٹرویو کے بعد ہی پاسپورٹ واپس کر کے مایوس لوگوں کو باہر واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ ان کی جگہ باہر سے اور لوگ آ کر سیٹوں پر بیٹھ جاتے تھے۔

کافی دیر بعد میرا نام پکارا گیا اور کھڑکی نمبر دو پر آنے کے لیے کہا گیا۔

میں اپنی فائل لے کر اٹھی اور سیٹوں کے درمیان سے جگہ بناتی کھڑکی نمبر دو کے سامنے آ گئی۔

شیشے کے پیچھے ایک امریکن عورت جو اردو بول رہی تھی بیٹھی تھی۔ میرا پاسپورٹ اس کے پاس تھا۔

"رضیہ بٹ۔" اس نے کہا۔

"جی ہاں۔" میں بولی۔

"امریکہ کیوں جانا چاہتی ہیں......"

"امریکہ دیکھنے کے لیے۔"

"رائٹر ہیں۔"

"جی۔ اردو کی رائٹر۔"

"بچے کتنے ہیں......اور کہاں کہاں سیٹل ہیں۔"

"پانچ بیٹیاں......پانچوں شادی شدہ ہیں......سب پاکستان ہی میں ہیں......"

"شوہر۔"

"فوت ہو چکے ہیں......"

"ٹھیک ہے......آپ تین بجے آ کر اپنا پاسپورٹ لے جائیں......"

"شکریہ۔" میری اندرونی خوشی میرے چہرے سے ہویدا تھی۔ تین بجے پاسپورٹ لینے کا مطلب تھا ویزا مل گیا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور آہستگی سے سر ہلایا۔ میں کھڑکی سے ہٹی اور دوسرے دروازے سے باہر نکل آئی۔ باہر چند لوگ جو ریجیکٹ ہو چکے تھے۔ اپنے غم اور غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ کسی کے پیپرز پورے نہ تھے۔ کسی کے کاغذات میں کوئی بات قابل اعتراض تھی۔ کسی کا بینک بیلنس ان کے معیار کا نہ تھا۔ پتہ نہیں کس کس بات پہ یہ لوگ ریجیکٹ ہوئے تلملا رہے تھے۔

لیکن

میری طرح کے لوگ خوشگوار موڈ میں باہر آ رہے تھے۔ تین بجے بلائے جانے کا مطلب واضح تھا کہ ویزا مل گیا۔

میں باہر نکلی۔ رقیہ لپک کر میری طرف آئی۔

"کیا ہوا؟"

"پاسپورٹ رکھ لیا ہے انہوں نے تین بجے واپس لینے کے لیے بلایا ہے۔"

"تو ہو گیا کام۔"

"لگتا تو یہی ہے۔"

کچھ امیدواروں کے ساتھ آنے والے لوگ میرے اردگرد جمع ہو گئے اور مجھ پر مختلف سوالات کرنے لگے۔

"انٹرویو میں کیا پوچھا۔"

"کاغذات پر کوئی اعتراض نہیں ہوا ہو گا؟"

"ساری چیزیں پوری ہوں گی......؟"

میں ان کے سوالوں پر مسکرائی' جواب دیے۔ مجھے اپنی فائل یاد آئی۔ وہ تو میرے ہاتھ میں پکڑی رہ گئی تھی۔ اسے دیکھنے کی اس نے ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔

-------O-------

اس وقت بارہ بجے تھے۔ ابھی کافی لوگ اپنی اپنی باری کے انتظار میں لائن میں لگے کھڑے تھے۔ صبح صبح یہاں پہنچنے کا یہ فائدہ تو ہو گیا تھا کہ کام بارہ بجے تک نپٹ گیا تھا لیکن اب تین بجے تک انتظار بھی کرنا تھا۔

"اب کیا کریں۔" میں نے رقیہ سے کہا۔ "تین ساڑھے تین گھنٹے یہاں کیسے گزاریں گے......"

"اور مجھے تو بھوک بھی لگ رہی ہے۔ یہاں تو کھانے کے لیے کچھ نہیں ملے گا۔" رقیہ بولی۔

"یہاں کوئی چھوٹی موٹی ٹک شاپ ضرور ہونی چاہیے۔ اتنی دور دور سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ چائے چھوڑ پانی کا بندوبست بھی نہیں......"

"گرمی سردی سے بچاؤ کے لیے شامیانے ہی لگا دیں۔ بیٹھنے کی جگہ نہیں۔ دھوپ میں میرا تو سر گھوم گیا......"

"تو پھر۔ اب یہ وقت کیسے گزاریں۔"

"ٹیکسی لے کر گھر چلتے ہیں۔ کھانا کھا کے آ جائیں گے۔"

"نہیں رقیہ گھر آنے جانے میں بہت وقت لگ جائے گا...... آتے آتے دیر نہ ہو جائے۔"

"تو پھر آبپارہ مارکیٹ چلتے ہیں۔ وہ قریب ہی ہے۔ کھانا کسی ریسٹورنٹ سے کھا لیں گے۔ کچھ دکانیں دیکھ لیں گے۔ میں نے شوز لینے ہیں......"

"یہ ٹھیک ہے۔ٹیکسی تو یہاں سے مل جائے گی۔"

"ٹیکسیاں سڑک پر سے متواتر آ جا رہی ہیں۔"

ہم دونوں پیدل چلتی سڑک پر پہنچیں۔ چند منٹ میں ہی ٹیکسی مل گئی اور ہم اسلام آباد کی پرانی آبپارہ مارکیٹ کی طرف چل دیں۔

ہم نے تین گھنٹے گزارنا تھے۔

سب سے پہلے تو ہم نے ایک ٹیلیفون بوتھ سے گھر واحد کو فون کر کے صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بہت خوش ہوا کہ ویزے کا مسئلہ حل ہو گیا۔

"یہ تو اب تین بجے وہاں جا کر ہی پتہ چلے گا کہ ویزا لگا یا نہیں۔"

"نہیں آپا۔ آپ کا ویزا پکا لگ گیا۔ بس اب آپ تو امریکہ سدھاریں۔"

میں ہنس پڑی۔

رقیہ نے بھی واحد سے بات کی۔ اسے بتایا کہ ہم لوگ دیر ہی سے گھر پہنچیں گے۔ وہ فکر نہ کرے۔

خیر

ہم نے کھانا کھایا' چائے پی۔ پھر دو ایک جوتوں کی دکانیں دیکھیں۔ رقیہ نے کورٹ شوز خریدے۔ ہم وقت گزارنے کے لیے ویسے ہی مارکیٹ کی دکانیں دیکھتے رہے۔ ونڈو شاپنگ کو انجوائے کرتے رہے۔

سوا تین ہم پھر وہیں پہنچ چکے تھے۔ اب صبح کی طرح بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ صرف وہی لوگ آئے تھے جنہیں تین بجے بلایا گیا تھا۔ یعنی جنہیں ویزا مل رہا تھا۔ یہ لوگ بہت خوش تھے۔ تین چار نوجوان سٹوڈنٹس بھی تھے جنہیں ویزا مل رہا تھا۔ ان کی خوشی تو دیدنی تھی۔

مجھے وہ خوبصورت سی لڑکی جس کے ساتھ کوئی ڈیڑھ سال کا بچہ بھی تھا' نہیں بھولتی۔ اس کے ماں باپ بھی ساتھ تھے۔ وہ سب کتنے خوش تھے بتا نہیں سکتی۔ ماں بار بار بیٹی کا ماتھا چوم رہی تھی۔ باپ سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر دعائیں دے رہا تھا۔ لڑکی بھی ہنستی

مسکراتی۔ کبھی اس کی آنکھیں بھر آتیں۔

میں اور رقیہ ان کے قریب گئے اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ پتہ چلا کہ لڑکی کی شادی کو تقریباً اڑھائی سال گزر چکے ہیں۔ شادی کے ایک ماہ بعد اس کا شوہر امریکہ چلا گیا تھا۔ اسے اب تک ویزا نہیں ملا تھا۔ نہ ہی شوہر واپس آ سکا تھا۔ اس دفعہ اس کی قسمت کی یاوری تھی جو ویزا مل گیا تھا۔

"میرے بیٹے نے اپنے بابا کو ابھی تک نہیں دیکھا۔ نہ ہی انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا ہے۔ اب......اب۔"

اس کی آواز فرط جذبات سے بھرا گئی تھی۔ ماں نے اسے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا "شکر ہے میری بیٹی کے انتظار کے دن ختم ہو گئے۔ اب یہ اپنے گھر اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ رہے گی۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے......"

ایک درخت کے نیچے دو عمر رسیدہ میاں بیوی بیٹھے کچھ ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ ان کا بیٹا امریکہ میں تھا اور پانچ سال سے ماں باپ کو اپنے پاس بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب یہ کوشش بارآور ہوئی تھی۔ ان دونوں کو ویزا مل رہا تھا۔ پانچ سال بعد اپنے اکلوتے بیٹے سے ملنے کے تصور ہی سے وہ سرشار ہو رہے تھے۔

میرا تو ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ویزا مل گیا تو خوشی ہوئی۔ نہ ملتا تو فکر کی بات بھی نہ تھی' لیکن جن لوگوں کی ضرورتیں تھیں انہیں ویزا مل رہا تھا تو ان کی خوشیاں دیدنی تھیں۔

کوئی ساڑھے چار بجے کے قریب میں اپنا پاسپورٹ لے کر باہر آئی۔ رقیہ مجھ سے لپٹ گئی۔ مبارکباد دی...... "چلیں آپ تو امریکہ پہنچ ہی جائیں گی......"

"اب تمہارا بھی لگ جائے گا انشاءاللہ۔"

"خدا کرے ہم جتنے لوگ صائمہ کی شادی میں شرکت کے متمنی ہیں سب کا ویزا لگ جائے۔"

"آمین......شمو کے ہاں سب اکٹھے ہوں گے' مزہ آئے گا۔"

"واقعی۔"

باتیں کرتیں ہم پھر سڑک تک آ ئیں۔ ٹیکسی لی اور گھر آ گئے۔

میرا ایک سال کا ملٹی پل ویزا لگا تھا۔

رات خالد بھی آ گیا...... ویزا لگنے کی مبارک دی۔ پھر پاسپورٹ دیکھ کر بولا۔

"آپا آپ کا تو ملٹی پل ویزا لگا ہے ایک سال کا۔ آپ دوبارہ بھی جا سکتی ہیں۔"

"ایک بار ہو آؤں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔"

"چلیں بھائی اب آپ بھی پاسپورٹ بنوائیں۔" اس نے رقیہ سے کہا۔

"ایک ہفتے میں بنالوں گا۔" واحد نے کہا۔

"پرانا پاسپورٹ بھی ساتھ لگا دینا۔" خالد بولا۔

"وہ سب کرلوں گا......" اس نے کہا۔

"بس ان سب کے ویزے لگ جائیں تو میں ٹکٹ خرید لوں گا......" خالد بولا۔

"نسیمی بھی چند دنوں تک ویزے کے لیے آ رہی ہے...... گڈی اور احمد بھی......"

واحد نے کہا

"احمد کا معاملہ مشکوک ہے۔ ڈاکٹرز کو ویزا ملنا آسان نہیں۔ خاص کر ینگ ڈاکٹرز کو۔ ابھی اسی سال تو وہ ڈاکٹر بنا ہے......"

"ٹرائی کرنے میں کیا ہرج ہے۔ صائمہ کی شادی کے سلسلے میں وہ بھی نکل جائے۔"

"ہاں قسمت کی بات ہے۔"

"وہ ماشاء اللہ بہت لکی ہے۔"

کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر خالد چلا گیا اور ہم بھی بستروں میں پڑ گئے۔ رقیہ اور میں سارے دن کے تھکے ہارے تھے۔

دوسرے دن میں لاہور واپس آ گئی۔ میرے ویزا لگنے کی خبر تو پنڈی سے واحد نے ان کو فون پر دے دی تھی۔ سب بہت خوش ہوئے۔

نسیمی کا ویزا بھی لگ گیا اور گڈی اور احمد کا بھی۔ احمد کا ویزا لگنے کی سب کو بہت خوشی تھی۔

اب سب تیاریوں میں لگ گئے۔ نیو جرسی میں ان دنوں کافی سردی تھی۔ برفباری بھی نومبر دسمبر میں ہوتی تھی۔ اس لیے گرم کپڑے ساتھ لے جانا تھے۔ شادی کے لیے ریشمی کپڑے بھی درکار تھے۔ پھر وہاں صائمہ کے لیے تحفے بھی لے کر جانا تھے۔ اس کے علاوہ بھی جن جن کے ہاں جانا تھا۔ کوئی نہ کوئی تحفہ تو لے جانا ہی تھا۔ بشرہ نیو جرسی میں تھی۔ میری بہت پیاری نواسی اور بہت ہی اچھی دوست۔ نومبر کے آخر میں اس کے بچے بھی ڈیو تھا اور پھر دوسری نواسی ریشم بھی امریکہ میں تھی۔ اسے ملے تو دو اڑھائی سال ہو گئے تھے۔ بشرہ کی طرح وہ بھی میری جگری دوست تھی۔ میری چار نواسیاں ہیں، لیکن ان سے نانی کے رشتے سے کہیں پیارا دوستی کا رشتہ ہے۔

اور بھی بھانجیاں، بھتیجیاں وہاں تھیں۔ اس لیے چھوٹی موٹی کوئی نہ کوئی چیز تو انہیں بھی دینا تھی۔

میں نے پہلے تو اپنا بینک بیلنس دیکھا۔ حساب لگایا کہ میں کل کتنا خرچ کرنے کی متحمل ہوں۔ بے حساب خرچ نہیں کر سکتی تھی۔

بہرحال

تحفے تحائف خریدنے کے لیے رقم الگ کی اور ساتھ لے جانے کے لیے ڈالر خریدنے کے لیے الگ۔

گڈی اور میں تحائف خریدنے کے لیے اکٹھے ہی بازار گئے۔ شیمو نے تو منع کر دیا تھا کہ کوئی چیز نہ لائی جائے۔ امریکہ میں ہر چیز ملتی ہے۔ ہر ملک کی اونچی شلٹی وہاں ہر رنگ میں موجود ہے، لیکن یہ بات اپنی جگہ ہم نے اپنے دستور اور رواج کے مطابق تو کچھ نہ کچھ لینا ہی تھا۔ صرف صائمہ ہی کے لیے نہیں اوروں کے لیے بھی۔

☆

ہم دونوں نے دو چار دفعہ بازاروں کے چکر لگائے اور حسب حیثیت تحفے تحائف خرید لیے۔ ہماری تیاریاں چند دن ہی میں مکمل ہو گئیں۔

خالد نے خود تو شادی سے چند دن پہلے ہی جانا تھا کیونکہ وہ چند ماہ پہلے امریکہ

سے ہو آیا تھا۔ ہماری سیٹیں دسمبر کے اوائل کی ہوئیں۔ نسیمی اور میری سیٹیں کویت ایئرویز کی فلائٹ پر بک ہوئیں۔ گڈی اور احمد اپنے کسی ذاتی کام کی وجہ سے چند دن بعد آنے والے تھے۔ ویسے ان کی سیٹیں بھی پی آئی اے میں نہ ملیں اور کویت ایئرویز ہی کی ہوئیں۔

میں اور نسیمی نے یکم دسمبر کو لاہور سے فلائی کرنا تھا۔

لیکن

عین وقت پر مجھے ایک ہفتے کے لیے رکنا پڑا۔ نسیمی اکیلی چلی گئی۔ میں نے خالد کو سیٹ کی تبدیلی کے لیے ٹکٹ واپس بھیجا۔ شکر کی بات کہ 6 تاریخ کی سیٹ مل گئی۔ صرف ایک ہی سیٹ خالی تھی۔ پورا جہاز پہلے سے بک تھا۔

سیٹ تو مل گئی۔ تیاری بھی مکمل تھی۔ سردی کے پیش نظر گرم کپڑے کوٹ سویٹر شالیں بھی رکھ لی تھیں۔ ایک مسافر دو سوٹ کیس جن کا وزن 60 کلو تک ہو اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ وزن کا بھی مسئلہ نہ تھا۔ میں نے پرس کے علاوہ ایک بڑا ہینڈ بیگ بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس میں بھی کافی چیزیں ٹھونسی تھیں۔ کوٹ بازو پر ڈالنا تھا۔ فری کا خوبصورت کوٹ میں نے اپنی بیٹی فری سے مستعار لیا تھا۔ لاہور میں تو کوٹ پہننے کی سردیوں میں ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس لیے میرے پاس کوٹ تھا ہی نہیں۔ فری سعودی عرب سے اپنے لیے دو تین کوٹ لائی ہوئی تھی۔ وہ مری اور ایبٹ آباد پوسٹنگ کے دوران چند سال رہی تھی۔ یہ کوٹ کام آ گئے تھے۔ فری کا کوٹ مجھے بھی پھنس پھنسا کر آ گیا۔ ساتھ لے جانا ضروری تھا کہ دسمبر کا مہینہ تھا اور نیوجرسی میں درجہ حرارت کئی دفعہ منفی میں بھی چلا جاتا تھا۔ برفباری بھی ہوتی تھی۔

بہر حال فری کے کوٹ نے مسئلہ حل کر دیا۔

چیزیں تو سب تیار تھیں لیکن اب مجھے اکیلے امریکہ جانا تھا۔ کویت ایئرویز کا جہاز سیدھا امریکہ نہیں جاتا تھا۔ ہمیں کویت سے دوسرا جہاز لینا تھا۔ بس ذرا اسی سے لگ رہا تھا کہ اکیلی جا رہی ہوں۔ جہاز بدلنا پڑے گا۔ دیار غیر!...... کیا کروں گی۔ کیسے کروں گی۔

6 دسمبر کو میں لاہور ایئرپورٹ پر تھی۔ بیٹیاں اور داماد نعیم ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئے ہوئے تھے۔ ان دنوں فری اور نعیم میرے ہاں ہی رہ رہے تھے۔ کیونکہ ایک سال پہلے

بٹ صاحب فوت ہو گئے تھے۔

اور

میں

اکیلی رہ گئی تھی۔

میں بظاہر بڑی حوصلہ مند نظر آ رہی تھی' لیکن اندر سے دل ڈول رہا تھا۔ فلائٹ سیدھی امریکہ جانا ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔

یہ جو کویت پر جہاز بدلنا اور وہاں گھنٹہ بھر رکنا تھا ٹیڑھا معاملہ تھا۔ اندرون ملک تو میں نے پشاور سے لے کر کراچی تک کافی اکیلے ہوائی سفر کیے تھے۔

لیکن

بیرون ملک اکیلے جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ دو دفعہ عمرے کے لیے گئی تھی' لیکن دونوں دفعہ اپنوں کا قافلہ ساتھ تھا۔

اب؟

خیر جانا تو تھا ہی......

فلائٹ صبح پانچ بجے جانا تھی' لیکن بیرون ملک جانے کے لیے ایئرپورٹ پر دو اڑھائی گھنٹے پہلے پہنچنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ بھی رات کے تقریباً اڑھائی بجے ایئرپورٹ پہنچے۔ سامان ٹرالی پر رکھا اور میں سب سے مل کر الوداع کہتے ہوئے چیک ان ہو گئی۔

ان دنوں لاہور ایئرپورٹ کی رینوویشن ہو رہی تھی۔ ٹکٹ اور سامان بک کرانے کے لیے ابھی وہی پہلے والا ہی ہال تھا۔ لاؤنج بھی وہی تھا۔ ان دنوں صرف بیرون ملک کے مسافروں والا لاؤنج زیر تعمیر تھا۔ میں اسی طرف چل دی۔

میں نے کاؤنٹر پر جا کر ٹکٹ دکھایا۔ یہاں سامان بھی چیک ہونا تھا۔ میرے دونوں سوٹ کیس اتنے بھرے ہوئے تھے کہ انہیں کھول کر پھر بند کرنا انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔

میں نے چیک کرنے والے آفیسر اور اس کے ساتھ کھڑی عملے کی عورت سے کہا "میرا سامان الارم گیٹ سے گزر چکا ہے۔ مشین سے بھی چیک ہو چکا ہے۔ اب آپ نے

کیا چیک کرنا ہے۔"

"جی ہی۔" کسٹم آفیسر بولا" یہ ہماری ڈیوٹی ہے آپ کا سامان کھلے گا......"

"تو پھر ایک بات سنئے۔"

"جی۔"

"بے شک سامان کھولئے۔ ایک ایک چیز دیکھیئے۔ لیکن یہ سامان پھر بند بھی آپ ہی کریں گے۔ مجھ سے تو یہ کام دوبارہ نہیں ہو سکے گا......"

وہ مسکرانے لگا۔ اتنے میں دوسرے کاؤنٹر سے ایک خاتون جو میری طرف مسلسل دیکھ رہی تھیں ادھر آئیں اور بولیں" آپ رضیہ بٹ ہیں......"

"جی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ذوالفقار آپ کے داماد ہیں......"

"جی ہاں...... کراچی میں ہیں۔ پی آئی اے سٹے پر چیز آفیسر ہیں۔"

"میں جانتی ہوں......"

پھر اس نے آفیسر سے کہا" یہ بہت معروف رائٹر رضیہ بٹ ہیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ ساتھ کھڑی خاتون کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولی" چلئے آپ کا سامان نہیں کھولتے......"

"شکریہ۔" میں اب مسکرا کر بولی" بے شک کھول لیجئے۔ لیکن میری شرط ہے کہ بند بھی آپ کو ہی کرنا پڑے گا......"

یوں چیکنگ کا معاملہ ختم ہو گیا۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز تو تھی نہیں جو میں چیکنگ سے گھبراتی۔ گھبراہٹ تو صرف تھی کہ سوٹ کیسوں کے پیٹوں میں ٹھونسا سامان ایک دفعہ بکھر گیا تو سمیٹے گا کون۔

اب سامان بکنگ کے لیے دوسرے کاؤنٹر پر جانا تھا۔ دونوں بکس بک کر کے مجھے رسید دے دی گئی۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ بورڈنگ کارڈ بھی یہیں سے ملا۔

اب دو تین مسافر اور بھی آ گئے تھے۔ ایک آدمی کے سوٹ کیس تو چیکنگ کرنے

والوں نے پورے کے پورے کاؤنٹر پر بکھیر دیئے تھے۔ بیچارہ پریشان ہو کر ان کو دیکھ رہا تھا۔ کسٹم والے ایک ایک چیز چیک کر رہے تھے۔

ایک دوسری خاتون کا سامان بھی اسی طرح چیک ہوا۔ ہاں ایک نیا شادی شدہ جوڑا آیا۔ انہوں نے آفیسر سے ہاتھ ملایا۔ شاید دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ان کا سامان بکنگ کے کاؤنٹر پر میرے سامان کی طرح بغیر چیک کیے ہی بھیج دیا گیا۔

سامان میں کوئی مشکوک چیز ہونے کا امکان نہیں تھا۔ کیونکہ چیک ان ہوتے ہی سامان جب بیلٹ سے گزرتا ہے اور پھر آلات سے چیک ہوتا ہے تو پتہ چل جاتا ہے کہ سامان مشکوک ہے یا نہیں۔

پھر بھی

اچھی بات...... ڈیوٹی کی صحیح ادائیگی بری بات نہیں۔ بے اصولی ہم لوگ اپنی سہل پسندی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس بھی ہوا...... ہم جیسے لوگ بھی جب اپنی سہولت کے لیے قانون کا رخ موڑ لیتے ہیں۔ تو پھر دوسرے لوگوں کو نشانہ بنانے کا ہمیں حق نہیں پہنچتا۔

جہاز رن وے پر تیار کھڑا تھا۔ اس لاؤنج میں ہمیں زیادہ دیر ٹھہرنا نہ پڑا۔ میں ایک بازو پر کوٹ ڈالے دوسرے ہاتھ سے بڑا سا بیگ اٹھائے ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکائے جہاز تک جا پہنچی۔ بورڈنگ کارڈ کی لاؤنج سے باہر نکلتے اور جہاز میں سوار ہونے سے پہلے چیکنگ ہوئی۔

پونے پانچ بجے میں جہاز کے اندر اپنی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ کویت ہم نے کوئی دس بجے پہنچنا تھا' لیکن ہم چونکہ مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرنے والے تھے۔ سورج کا سفر بھی اسی طرف تھا۔ اس لیے ٹائم کا فرق پڑ جاتا تھا۔

میں نے بڑا بیگ سیٹ کے اوپر والے کیبنٹ میں رکھا۔ بٹوہ نکال کر گود میں رکھا۔ کوٹ سیٹ کی پشت پر ڈال دیا۔ لاؤنج سے جہاز تک آتے ٹھنڈ لگی تھی' لیکن اب جہاز خاصا کوزی تھا۔ چند منٹوں میں سردی کا احساس ختم ہو گیا۔ مسافر بھی کافی آ گئے تھے۔

-------O-------

جہاز بھر گیا۔ زیادہ لوگ کویت جانے والے تھے۔ کچھ لندن اور امریکہ کے مسافر تھے۔ میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نگاہ آگے پیچھے دوڑائی۔ جہاز بہت بڑا نہیں تھا۔ لیکن بھر چکا تھا۔ چند سیٹیں خالی تھیں۔ جن پر قدرے دیر سے آنے والے مسافر بیٹھ رہے تھے۔ حسب معمول جہاز میں لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کسی کو کوئی واقف کار مل گیا تھا۔ کوئی ایسے ہی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے صاحب سے علیک سلیک کے بعد گفتگو کر رہا تھا۔ کچھ بچے تھے جو جب سے جہاز میں آئے تھے۔ اچھل کود اور شور مچانے میں مصروف تھے۔ کچھ اخباریں کھول رہے تھے یوں کاغذوں کی سرسراہٹ خاموشی کو توڑ رہی تھی۔

جہاز کی اڑان کا وقت پانچ بجکر پینتالیس منٹ تھا۔ سب مسافر اپنی اپنی سیٹیں لے چکے تو جہاز کے دروازے بند کر دیے گئے۔ تمام کویتی ایئر ہوسٹس درمیانی پردہ ہٹا کر باہر نکل آئیں۔ یہ خوبصورت اور تازہ دم نوجوان لڑکیاں تھیں۔ نیلے کوٹ اور سکرٹ پہنے ہوئے تھے۔ بال باب کٹ تھے۔ میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ انگریزی کم بولتی اور سمجھتی تھیں۔ سٹیورڈز بھی آ گئے۔ انہوں نے سامان والی کیبنٹوں کے دروازے بند کیے...... ہر مسافر سے بیلٹ باندھنے کی استدعا کی...... ایئر ہوسٹسز بھی ان کے ساتھ یہی کام کر رہی تھیں۔

جہاز کے انجن کھول دیے گئے......

اب سفر پر روانہ ہونے والی دعا عربی زبان ہی میں پڑھی گئی۔ پھر ایئر ہوسٹسز اور سٹیورڈز نے جہاز میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا مظاہرہ کیا۔ خدانخواستہ کسی حادثے کی

صورت میں کیا کرنا تھا۔ آکسیجن کم ہو جائے تو اوپر سے گرنے والے ماسک کو کس طرح استعمال کرنا تھا۔ لائف جیکٹ جو ہر سیٹ کے نیچے رکھی تھی۔ اسے کب اور کیسے استعمال کرنا ہے اور ہنگامی حالت میں کن دروازوں سے باہر نکلنا ہے۔

یہ احتیاطی تدابیر ہر فلائٹ پر بتائی جاتی ہیں۔

پھر اناؤنسمنٹ ہوئی کہ جہاز ٹھیک پانچ بجکر پینتالیس منٹ پر ٹیک آف کرے گا اور ہم تیس ہزار فٹ کی بلندی پر سے اڑتے ہوئے سفر جاری رکھیں گے۔

اس کے بعد جہاز میں حرکت ہوئی۔ کچھ دیر جہاز پیچھے کی طرف چلا۔ پھر آگے تیزی سے بڑھا...... رن وے پر دوڑتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ اڑان لی۔ فضا میں اٹھنا شروع ہوا...... پھر ''گھاں'' کی سی تیز آواز کے ساتھ فضا میں اونچا اٹھ گیا۔ لاہور سے کویت کی فلائٹ چار گھنٹے بیس منٹ کی تھی۔

مجھے سیٹ کھڑکی کے ساتھ ملی تھی۔ گاہے گاہے میں باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ اتنی اونچائی پر سے نیچے دیکھتے ہوئے کچھ خاص چیز نظر نہ آتی تھی۔ جہاز ریگستانوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ کہیں اندھیرا' کہیں روشنی۔ یہ منظر بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ کہیں کہیں بادل بھی تھے اور جب بادل دبیز ہو جاتے تو اور کچھ نظر نہ آتا۔ صرف یہی لگتا کہ ہم بادلوں کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔

باہر فضا خوبصورت تھی۔ کہیں بادل چھٹ جاتے تو ریت کے ٹیلے دکھائی پڑتے۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے جو جسامت میں جانے کتنے بڑے ہوں گے...... میں یہ مناظر دیکھ تو رہی تھی۔ لیکن دل میں ڈر موجود تھا۔ ''کویت سے دوسرا جہاز کیسے لوں گی......''

سات بجے کے قریب ناشتہ کے لیے ایئر ہوسٹسز ٹرالیاں گھسیٹتی آ گئیں۔ بند ڈبوں میں بند مکھن اور پیسٹری وغیرہ تھی۔ چائے کے لیے خالی کپ ٹرے میں ڈبوں کے ساتھ رکھے تھے۔ گتے کے گلاس پانی کے لیے۔ کاغذی نیپکن۔ چھری کانٹا اور چمچ پلاسٹک کے ڈسپوزیبل۔ چینی اور نمک کی بند پڑیاں۔ تلے ہوئے انڈے جو سرو کرتے کرتے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

ناشتے کے ساتھ چائے اور کافی تھی۔ میں نے کافی پی۔ ناشتہ ختم کیا۔ ٹرے واپس اٹھالی گئی......

اب پھر میں

اور

میرا خوف

جوں جوں ہمارا سفر خاتمے کے قریب آرہا تھا۔ میرا خوف بڑھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ یہ مرحلہ بخیر سر ہو جائے۔

میں نے کھڑکی بند کر کے گردن سیٹ کی پشت پر ڈال دی۔ میری اگلی سیٹ پر دو آدمی مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے۔

میں نے غور سے ان کی باتیں سنیں تو پتہ چلا دونوں امریکہ جا رہے ہیں۔ بس میرے اندر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے سوچ لیا کہ یہ دونوں جس طرف جائیں گے اور جو عمل کریں گے میں بھی وہی کروں گی اور کویت ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد انہی پر نظر رکھوں گی...... جدھر جدھر وہ جائیں گے میں بھی پیچھے پیچھے چلی جاؤں گی۔

کچھ تسلی سی ہوگئی۔

میرے برابر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ اس سے اب تک کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ نہ ہی اس نے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک انگریزی ناول تھا۔ جسے وہ شاید سفر میں وقت گزارنے کے لیے کبھی پڑھنے لگتا' کبھی گود میں رکھ کر آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کی پشت پر ڈال دیتا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر چھبیس ستائیس سال ہوگی۔ ناک نقشہ اچھا تھا۔ چہرے سے شرافت جھلکتی تھی۔

پتہ نہیں کیسے اس کے ہاتھ سے کتاب گری اور میرے گھٹنے پر آ پڑی۔

''سوری آنٹی'' اس نے گھبرا کر کہا۔''میں شاید اونگھ گیا تھا۔ کتاب گر گئی اور آپ کے گھٹنے......''

''کوئی بات نہیں......'' میں نے ملائمت سے کہا'' لگتا ہے رات بھر جاگے ہو۔''

''تقریباً جاگتا ہی رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ فلائٹ جو پکڑنا تھی۔ میں گوجرانوالہ سے آ رہا ہوں...... بس آتے آتے ہی میں رات بیت گئی۔ سو ہی نہیں سکا......''

''کہاں جا رہے ہیں......''

میرا دل چاہ رہا تھا وہ کہے'' امریکہ......'' تاکہ مجھے پوری تسلی ہو جائے اور میرے دل سے کویت پر جہاز بدلنے کا خوف نہ رہے۔

لیکن

وہ بولا'' اٹلی''

''اٹلی'' میں نے دہرایا۔

''جی آنٹی......'' وہ بولا۔'' اور آپ؟''

''میں امریکہ جا رہی ہوں...... زندگی میں پہلی دفعہ اور وہ بھی کویت ایئرویز سے۔ کویت میں جہاز بدلنا ہے اور میں ڈر رہی ہوں کہ کیا کروں گی۔ پہلے نہ تو کبھی کویت آئی ہوں نہ ہی امریکہ......''

وہ ہولے سے مسکرایا اور بولا'' پی آئی اے سے کیوں نہیں گئیں۔''

''ٹکٹ نہیں ملا......''

''کہاں رہتی ہیں۔''

''لاہور......''

ہم آہستہ آہستہ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔

میں نے اپنے متعلق دوران سفر کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میں کون ہوں۔ لیکن آج میرا دل چاہا کہ اس نوجوان سے اپنا تعارف کروا ہی دوں۔ شاید کہ مجھے جان لے تو کویت پہنچ کر میری کچھ مدد کر ہی دے۔

جب اس نے میرا نام سنا تو خوشی سے چہکتا ہوا بولا۔ ''آپ سے ملنا تو میرے لیے باعث سعادت ہے۔ میں نے ایف۔اے۔ بی۔اے تک آپ کو بہت پڑھا ہے۔ خدایا...... میں کتنا خوش ہوں...... آج آپ میرے اتنے قریب بیٹھی ہیں......''

وہ تعریفی کلمات ادا کرتا رہا اور میں خوش ہوتی رہی کہ اب تو یہ نوجوان میری ضرور مدد کرے گا۔

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے کہا ''بیٹے مجھے بھی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ میں اکیلی سفر کر رہی تھی۔ پہلی بار کویت یا امریکہ جا رہی ہوں۔ ڈر رہی تھی کہ کویت جو جہاز بدلنا ہے وہ کیسے بدلوں گی......''

''اوہ آنٹی'' وہ بولا ''فکر کرنے کی تو کوئی بات نہیں۔ جگہ جگہ پر معلومات ملتی ہیں۔ ہر جگہ لکھا ہوتا ہے کس گیٹ میں جانا ہے...... لیکن خیر فکر نہ کریں۔ میں آپ کو امریکہ جانے والے جہاز میں بٹھا دوں گا......''

''آپ نے تو اٹلی جانا ہے......''

''میرا کویت میں Stay ڈیڑھ گھنٹے کا ہے۔ میں بہ سہولت آپ کو جہاز تک پہنچا سکتا ہوں۔ بورڈنگ کارڈ بھی لے دوں گا اور جہاز تک بھی پہنچا دوں گا۔ آپ مطمئن رہیے......''

''جیتے رہو بیٹا۔ تم نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا......''

اس نے مجھے ہر طرح سے تسلی دی اور مطمئن کر دیا۔

پھر ہم دونوں اپنے اپنے شہر، خاندان اور کام کاج کی باتیں کرنے لگے۔

اب میں بے فکر تھی۔

مطمئن تھی۔

ڈر و خوف ختم ہو گیا تھا۔

جہاز تیز رفتاری سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر جا رہا تھا۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ اب اگلی سیٹ پر بیٹھے امریکہ جانے والے مسافروں پر نظر رکھنے کی

مجھے ضرورت نہ تھی۔

جہاز کی رفتار کچھ کم ہونے لگی اور وہ بلندی سے نیچے آنے لگا۔ ساتھ ہی انگریزی میں اناؤنسمنٹ ہوئی کہ ہم لوگ چند منٹ میں کویت ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جہاز میں ہلچل شروع ہو گئی۔ لوگ اپنا اپنا سامان ہاتھوں میں پکڑنے لگے۔ اوپر والی کیبنٹوں سے بیگ، بریف کیس اور بنڈل وغیرہ اتارنے لگے۔

میرا بیگ بھی اوپر تھا۔ میں نے اس لڑکے سے کہا ''پلیز میرا بیگ اوپر سے اتار دیں/ سامنے ہی پڑا ہے۔''

اس نے میرا براؤن بیگ اتار کر نیچے رکھ لیا اور بولا ''آنٹی آپ آرام سے بیٹھی رہیں۔ میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔ دوسرے جہاز میں آپ کو بٹھانے کی میری ذمہ داری ہے۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''شکریہ نہیں آنٹی۔'' وہ بولا ''میں آپ کے بچوں کی طرح ہوں۔ مجھے بس اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا...... دعا کیجیے جس کام کے لیے میں اٹلی جا رہا ہوں ہو جائے۔''

''انشاء اللہ ہو جائے گا...... میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ دعاؤں میں بھی اور یادوں میں بھی......''

''شکریہ آنٹی۔''

اب جہاز کویت کے رن وے پر اتر گیا تھا اور تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ کچھ لوگ ابھی سے باہر نکلنے کی بے تابی میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ آرام سے بیٹھے تھے۔

کویت کا ہوائی اڈہ کافی بڑا تھا۔ جگہ جگہ جہاز کھڑے تھے۔ رن وے بھی خاصا بڑا لگتا تھا۔

شہر کویت ریاست کویت کا دارالخلافہ بھی ہے۔ یہ سمندر اور صحرا کے درمیان واقع ہے۔ خلیج کویت کی بندرگاہ ہے، جو پرشین گلف کے ایک سرے پر واقع ہے۔ کویت کو الکویت

بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے ساحلی ریگستانوں میں تیل کے ذخائر ہیں' جن کے دریافت ہونے کی وجہ سے کویت امیر ترین ریاست ہے۔ تیل کی مصنوعات بھی اس کی دولت کے اضافے کا باعث ہیں۔ علاوہ ازیں خلیج سے اعلیٰ قسم کے قیمتی پرلز موتی بھی ملتے ہیں' جو دنیا بھر میں خوبصورت اور قیمتی ہونے کے لیے مشہور ہیں۔

کویت میں تیل کی دریافت 1937ء میں ہوئی تھی اور اس کی ایکسپورٹ 1946ء سے شروع ہوئی جس سے دولت کی ریل پیل شروع ہوگئی۔ اب کویت ایک ماڈرن ریاست ہے۔ کویت شہر میں یونیورسٹی' سکول' کالج اور ٹیچر ٹریننگ سنٹر قائم ہیں۔ یہاں ایک سٹیٹ میوزیم بھی ہے۔ دوسری ورلڈ وار کے بعد کویت میں توسیع ہونا شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ یہاں پٹرولیم انڈسٹری قائم ہو چکی تھی۔ کویت کو 1990ء میں عراقی حملے سے کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

کویت کو ال حرمین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

یہاں موسم گرما مئی سے اکتوبر تک ہوتا ہے۔ پھر بارشیں شروع ہو جاتی ہیں' جس سے موسم خوشگوار رہتا ہے۔ یہاں کی زبان عربی ہے اور مذہب اسلام ہے۔ دوسرے ممالک سے لوگ یہاں نوکری کے لیے آتے ہیں۔ پہلے ہر مکتب فکر کے لیے یہاں کام کرنے کا میدان بہت وسیع تھا لیکن اب کویت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی نہیں رہی اس لیے ان کے اپنے لوگ پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر کے اپنے ملک کی خدمت کے لیے موجود ہیں۔ پھر بھی دوسرے ملکوں کے لوگ بھی یہاں خدمات انجام دیتے ہیں۔

کویت کا سکہ دینار ہے۔

لوگ خوشحال ہیں۔ ملک میں تفریح گاہیں ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں بھی کویت خود کفیل ہے۔ اپنے اخبار بھی نکلتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سٹیشن بھی ہیں۔

یہاں تعلیم حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ مرد و خواتین تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ لندن' امریکہ اور کئی دوسرے ممالک میں بھی یہاں سے طالب علم سرکاری خرچے پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔

ہمارا جہاز اب آہستہ آہستہ جیٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب جہاز کا دروازہ جیٹی کے دروازے میں فٹ ہو جاتا ہے تو دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جہاز منزل مقصود پر پہنچ کر رک گیا ہوتا ہے۔

جیٹی اس ٹنل کو کہتے ہیں' جس میں جہاز کا دروازہ کھلتا ہے اور لوگ اتر کر اس ٹنل سے گزرتے ہوئے جہاز کے لاؤنج میں جا پہنچتے ہیں۔ یہ سسٹم کراچی میں بھی ہے لیکن ابھی پشاور' لاہور' پنڈی اور دیگر شہروں میں جہاں ہوائی اڈے ہیں یہ سسٹم نہیں ہے۔ یہاں جہاز رن وے پر ٹرمینل کے قریب رک جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ سیڑھی لگائی جاتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور لوگ باہر نکلتے ہیں۔ جہاز لاؤنج کے قریب کھڑا ہو تو لوگ پیدل اندر چلے جاتے ہیں۔ ورنہ ائیر فیلڈ میں مسافروں کو لاؤنج تک لے جانے کے لیے گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔

جیٹی سے اندر لاؤنج میں جانا بہت سہل ہے۔ نہ گاڑیوں میں بیٹھنے کی تکلیف' نہ ہی کہیں سیڑھیاں اترنے چڑھنے کا مسئلہ۔ جہاز سے سیدھا لاؤنج میں جا پہنچتے ہیں۔ میں بھی اس نوجوان کے ساتھ جب باہر نکلنے والوں کا ہجوم قدرے کم ہوا تو سیٹ سے اٹھی۔ اپنی چیزیں اٹھائیں اور جیٹی سے ہوتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔ ہمارا جہاز کویت کے وقت کے مطابق 8 بجے پہنچا تھا۔

لاؤنج بہت بڑا اور کافی لمبا تھا۔ صاف ستھرا۔ ہر چیز چمک دمک رہی تھی۔ جیٹی سے نکلنے والے دروازوں پر نمبر لکھے تھے۔ ہم 29 نمبر دروازے سے لاؤنج میں آئے تھے۔

لاؤنج میں کئی چھوٹی بڑی ڈیوٹی فری شاپس تھیں۔ چاکلیٹس اور دیگر سویٹس' شاپس پر عام پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی چیزیں تھیں۔ گھڑیاں' کرسٹل کے ڈیکوریشن پیسز' الیکٹرانک کا بے شمار سامان' کاسمیٹکس' برتن غرضیکہ ہر طرح کا سامان سٹوروں میں موجود تھا...... پرفیومز اور آرٹیفیشل جیولری کی تو بہت ساری دکانیں تھیں۔

میں اس نوجوان کے ساتھ چل رہی تھی اور ارد گرد کی چیزیں بھی دیکھ رہی تھی۔

"آنٹی۔" وہ بولا۔

"جی۔"

"کوئی چیز خریدنا ہو تو......"

"نہیں۔ نہیں" میں جلدی سے بولی "مجھے کچھ نہیں لینا۔ میں تو ویسے ہی چیزیں دیکھ رہی ہوں۔"

"ایک گھنٹہ یہاں آپ کا Stay ہوگا۔ کچھ کھانا پینا ہو تو کھا سکتی ہیں۔"

"ناشتہ کر لیا تھا۔ اب ضرورت نہیں۔"

ہم دونوں چلتے جا رہے تھے۔ گیٹ نمبر 101 سے جیٹی میں داخل ہو کر مجھے امریکہ جانے والے بڑے جہاز میں بیٹھنا تھا۔

لاؤنج کے درمیان ہی میں ایک چوکور جنگلے کے اندر عملے کی عورتیں اور مرد مختلف کھڑکیوں کے سامنے کھڑے مختلف فلائٹس والوں کے ٹکٹ دیکھ دیکھ کر بورڈنگ کارڈز ایشو کر رہے تھے۔

مجھے ایک بینچ پر بٹھا کر اس نوجوان نے مجھ سے میرا ٹکٹ لیا اور جنگلے میں بنی کھڑکی سے اندر کر دیا۔

چند منٹ بعد وہ میرا بورڈنگ کارڈ لے کر آ گیا۔

میں نے ٹکٹ اور بورڈنگ کارڈ احتیاط سے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھے اور نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔

"آپ نے گیٹ نمبر 101 سے اندر جانا ہے۔ میں آپ کو گیٹ تک پہنچا دوں گا۔ آپ اندر جا کر جہاز میں بیٹھ جائیے گا۔ آپ کی سیٹ کھڑکی کے ساتھ ہے۔"

"تمہاری بڑی مہربانی۔"

"آنٹی مہربانی کیسی۔ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ میں آپ کے کسی کام آیا۔"

چند منٹ ہم باتیں کرتے رہے پھر وہ کہیں سے کافی لے آیا۔ ہم دونوں نے

باتیں کرتے ہوئے کافی پی۔ پھر کچھ دیر ہم لاؤنج میں گھومتے رہے......

جب لوگ وقت ہونے پر گیٹ نمبر 101 کی طرف جانے لگے تو ہم بھی چل دیئے۔ کافی دور جانا پڑا۔ اس نوجوان نے میرا بیگ اٹھایا ہوا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر وہ مسکرا کر بولا "بس اب آپ اندر چلی جائیے۔" میں نے اس کی پشت تھپک کر اسے پیار دیا۔ شکریہ ادا کیا اور اندر چلی گئی...... وہ واپس مڑ گیا۔



میں جہاز کے اندر بڑے اطمینان سے داخل ہوئی۔ ایئر ہوسٹس نے جو دروازے پر کھڑی تھی' میرا بورڈنگ کارڈ دیکھا۔ اس پر سیٹ نمبر دیکھا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے مجھے میری سیٹ دکھائی۔

میں نے شکریہ ادا کیا۔ کندھے پر ہینڈ بیگ کا سٹریپ' بازو پر کوٹ اور دوسرے ہاتھ سے بیگ اٹھائے میں آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ جہاز کی سیٹوں پر لوگ آ کر بیٹھنے لگے۔ جہاز نے لندن ہیتھرو ایئرپورٹ پر صفائی کے لیے گھنٹہ بھر رکنا تھا۔ اس لیے کافی سواریاں لندن کی تھیں۔ کویتی لوگ بھی تھے اور پاکستانی' ہندوستانی بھی۔ کچھ چینی اور امریکن بھی یہاں سے سوار ہوئے۔ اب میرے برابر والی سیٹ پر ایک چینی مرد بیٹھا تھا۔ گوجرانوالہ کا وہ نوجوان جس نے میری مدد کی تھی' لاؤنج میں اٹلی کی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ چینی آدمی سے کوئی بات چیت تو ہو نہ سکتی تھی۔ اس نے ہلکی سی خیر مقدمی مسکراہٹ مجھ پر ڈالی۔ میں نے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور بس..... لندن تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ میں زیادہ تر کھڑکی سے باہر ہی دیکھتی رہی۔ جہاز ہزاروں فٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ کوئی زمینی شے تو نظر آنا ممکن ہی نہ تھی۔ ہاں کہیں کہیں کچھ ٹیلے ٹیلے..... کبھی نیلا پانی نظر آ جاتا۔ بعض جگہ بادلوں کی وجہ سے یہ مناظر بھی نظروں سے اوجھل کر دیتیں۔

دوپہر کا کھانا جہاز ہی میں سرو ہوا۔ ایئر ہوسٹس اپنی اپنی ٹرالیاں سیٹوں کے درمیان والی خالی جگہوں پر گھسیٹتی لا رہی تھیں۔ وہ ہر مسافر سے پوچھ پوچھ کر کھانا دے رہی تھیں۔ کوئی انگلش فوڈ لے رہا تھا۔ کوئی کونٹی نینٹل..... وہی ٹرے میں رکھے فوڈ کے ڈبے۔

چھری کانٹے اور نیپکن۔ نمک' کالی مرچ کی چھوٹی پڑیاں۔ گتے کا گلاس۔ ڈسپوزیبل پیالیوں میں سلاد کے چند ٹکڑے اور میٹھا..... ہر ایک کے سامنے اگلی سیٹ کے ساتھ لگی چھوٹی سی ''ڈائننگ ٹیبل'' کھلی تھی جس پر اس کے من پسند فوڈ کی ٹرے پڑی تھی۔ گلاسوں میں کوئی پانی لے رہا تھا۔ کوئی کوک سیون اپ' سب لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ اس چینی کی ٹرے میں انگلش فوڈ تھا۔

کھانا ختم ہوا۔ خالی ٹرے سمیٹی گئیں۔

جہاز بلندیوں پر پرواز کرتا سوئے منزل رواں تھا۔ اب اگلا سٹاپ لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر تھا۔

میں نے کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر سامنے والی سیٹ کی بیک پر لگے بیگ سے ایک میگزین نکالا اور ورق گردانی کرنے لگی..... سامنے بڑی سی سکرین پر کوئی انگلش موووی چل رہی تھی۔ کچھ لوگ ہیڈ فون لگائے گانے سننے میں مصروف ہو گئے۔

مجھے اونگھ سی آنے لگی۔ میں نے رسالہ واپس رکھ دیا۔ ہینڈ بیگ کھڑکی کی سائیڈ پر رکھ کر اسے محفوظ رکھنے کے لیے ٹیک لگالی۔ گردن سیٹ کی پشت پر ڈال دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ سونا کس نے تھا۔ بس ایسے ہی سستی سی جو اکثر کھانا کھانے کے بعد غنودگی کی صورت طاری ہوتی ہے' ہو رہی تھی۔ مجھے دوران سفر کبھی سونا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ سفر کار کا ہو' ریل گاڑی یا ہوائی جہاز کا سارا دن ساری رات جاگتے ہی گزرے گی۔ بس چند لمحوں کے لیے غنودگی طاری ہو جائے گی اور بس۔

لیکن

اب میں آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ چینی بھائی سے کوئی بات چیت تو ہو نہ سکتی تھی۔ اس لیے بوریت طاری ہو گئی تھی۔ کچھ سفر کی تکان بھی ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے جسم تھک گیا تھا۔ گو ابھی بہت لمبا سفر باقی تھا۔ پھر بھی تکان ابھی سے محسوس ہونے لگی تھی۔

کویت کے وقت کے مطابق ہم نے 9 بجے پرواز کی تھی۔ کوئی دو اڑھائی بجے لندن پہنچنا تھا۔ پاکستان اور لندن میں وقت چار گھنٹے کے فرق پر تھا۔ جب ہم لندن پہنچے

پاکستان میں چھ ساڑھے چھ بج رہے ہوتے۔ یعنی سردیوں کی رات اتر چکی تھی۔ تھکان کچھ اس وجہ سے بھی تھی۔ رات بھر بھی ٹھیک سے نیند نہ آئی تھی کہ ائیر پورٹ دو اڑھائی بجے پہنچنا تھا۔ پانچ بجے سے جہاز میں ہی بیٹھے تھے۔ کویت تھوڑا ریسٹ لے لیا تھا کہ سیٹ پر اکڑوں بیٹھے رہنے کی بجائے لاؤنج میں چل پھر لیا تھا۔ لیکن اب پھر اسی طرح سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔

بہرحال

لمبا سفر تھا۔ پی آئی اے میں سفر کر رہے ہوتے تو سترہ اٹھارہ گھنٹے میں پہنچ جاتے لیکن کویت ایئرویز نے چونکہ دو جگہ رکنا تھا اس لیے پرواز لمبی تھی اور ہمیں امریکہ پہنچنے میں تقریباً بائیس گھنٹے لگنے تھے۔

جہاز میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اناؤنسمنٹ ہوتی رہتی ہے کہ اب ہم فلاں جگہ پہ ہیں۔ فلاں خطے سے گزر رہے ہیں۔ اتنی بلندی پر جہاز جا رہا ہے۔ باہر ٹمپریچر اتنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے اور لینڈ کرنے کی بھی اناؤنسمنٹ ہوتی ہے۔

چنانچہ اناؤنسمنٹ ہوئی کہ ہم ہیتھرو ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔

میں نے جلدی سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جہاز کافی نیچے آ چکا تھا اور لندن کا شہر نظر آ رہا تھا۔ بہت خوبصورت منظر تھا۔ جب جہاز بڑی سمرخی سے بنے لال مخروطی چھتوں والے سبزے سے گھرے ایک جیسے گھروں کے اوپر سے گزرا...... جانے یہ کونسا علاقہ تھا۔

سڑکیں بھی موٹی لکیروں کی طرح نظر آ رہی تھیں اور ان پر دوڑتی بسیں اور گاڑیاں ماچس کی ڈبیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جہاز نے موڑ لیا اور آبادی کے علاقوں سے ہٹ کر دوسری طرف ہو گیا۔ اب ایئرپورٹ کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ جہاز کھڑے تھے۔ شاید مختلف ممالک کے تھے' کیونکہ جہازوں کے رنگ اور شکلیں مختلف تھیں۔

کہیں کہیں ورکشاپیں بھی تھیں۔ ڈانگریاں پہنے کام کرتے لوگوں سے یہی اندازہ ہوا تھا۔

لندن کا ہیتھرو ایئرپورٹ دنیا کے چند بے انتہا وسیع و عریض ایئرپورٹوں میں سے ایک ہے۔ یہ مصروف ترین ہوائی اڈا ہے۔ تقریباً 60 ملین مسافر سالانہ یہاں آتے اور جاتے ہیں۔ یہ لندن کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ اس طرف اگر ہوائی اڈے کی اور توسیع کی جائے تو لندن سے آنے والے مسافروں کے لیے اچھی خاصی دشواری پیدا ہو سکتی ہے۔ ایئرپورٹ کی ٹریفک مین ٹرمینل کمپلیکس میں جانے کے لیے قدرے سمٹتے ہوئے ایک روڈ ٹنل جو کہ کچھ تنگ ہے' سے گزرتی ہے۔ ایئرپورٹ کو مسافروں کی سہولت کے لیے بے انتہا پیسہ خرچ کر کے آرام دہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہیتھرو کے ابھی چار ٹرمینل ہیں۔ پانچویں کی ضرورت بھی محسوس کی جا رہی ہے تاکہ مسافروں کو سہولت میسر آ سکے۔ کیونکہ ہیتھرو ایک مصروف ترین ایئرپورٹ ہے۔ روزانہ تقریباً دو سو کے قریب بین الاقوامی فلائٹس یہاں آتی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈومیسٹک فلائٹس بھی بہت زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں۔

مسافروں کی سہولت اور آرام کے لیے ہیتھرو کے کرتا دھرتا ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ جگہ جگہ سکرینیں نصب ہیں جہاں سے لوگوں کو لحظہ بہ لحظہ فلائٹس کی معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔

ہیتھرو ایئرپورٹ پر جہاز معمول کے مطابق اترا اور آہستہ آہستہ چلتا جیٹی سے لگ گیا۔ یہاں مسافروں کو جہاز خالی کرنا تھا۔ کیونکہ یہاں صفائی کی جانی تھی اس لیے اناؤنسمنٹ کی گئی کہ مسافر اپنا سارا دستی سامان ساتھ لے کر پیسنجر لاؤنج میں جائیں۔ یہاں تقریباً ایک گھنٹہ رکنا تھا۔ چنانچہ لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے بلکہ اپنے اوپر لادے جہاز سے اترنا شروع ہوئے۔ جیٹی سے گزر کر ایک بہت بڑے کوریڈور سے ہوتے ہوئے لاؤنج میں آئے۔ یہاں چیکنگ ہوئی اور مسافروں کو ایک الگ تھلگ بہت بڑے لاؤنج جس میں صوفے اور چیئرز پڑی تھیں' ٹھہرایا گیا۔ یہاں بہت بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیاں تھیں جہاں سے لندن کا نظارہ ہو سکتا تھا۔ گو بلڈنگیں کافی دور تھیں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ نظر آ ہی رہا تھا۔ مسافروں نے سیٹیں سنبھالیں اور آرام کرنے کے لیے صوفوں پر نیم دراز ہو گئے۔ بچے کھلی

جگہ پا کر بھاگنے دوڑنے اور شور مچانے لگے۔

اس لاؤنج میں جہاز سے صرف وہی لوگ آئے تھے جنہوں نے امریکہ جانا تھا۔ لندن جانے والے لوگ دوسرے راستے سے باہر جا چکے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد مسافروں کو جہاز پر بلایا گیا۔ لاؤنج میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہر کوئی اپنا سامان اکٹھا کرنے' بچوں کو بلانے اور لاؤنج سے نکلنے کے لیے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ہم نے اسی گیٹ سے جہاز میں جانا تھا جس سے نکل کر ادھر آئے تھے۔ کیونکہ وہی جہاز امریکہ جانا تھا۔ صاف ستھرا ہو کر اور ٹینکوں میں ایندھن بھر کر تیار کھڑا تھا۔

جب لاؤنج کے مسافر اپنی اپنی سیٹیں سنبھال کر سامان وغیرہ اپنی جگہ پر رکھ کر بیٹھ چکے تو لندن سے امریکہ جانے والے مسافر اندر آنا شروع ہو گئے۔ مسافر جہاز کے اندر آتے' اپنی اپنی سیٹیں بورڈنگ کارڈ پر لکھے سیٹ نمبروں پر ایئر ہوسٹسز کی مدد سے تلاش کرتے' بیٹھ رہے تھے۔ میری نظریں ان مسافروں پر ہی لگی تھیں۔

اچانک ہی میری نظر ایک اپنی ہم عمر خاتون پر پڑی۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ وہ مسز رانا تھیں۔ لاہور میں ان کا گھر میرے گھر کے سامنے ہی تھا۔ ہماری اچھی ملنے والی تھیں۔ وہ چند ماہ پہلے لندن اپنے بیٹے کے ہاں آئی تھیں۔ اب شاید دوسرے بیٹے کے پاس امریکہ جا رہی تھیں۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھا۔ مسکرا کر ہاتھ ہلایا لیکن ابھی رش تھا...... لوگ سیٹیں تلاش کر رہے تھے' سامان رکھ رہے تھے' بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر سیٹوں پر بٹھا رہے تھے۔ اس لیے نہ تو وہ اٹھ کر میرے پاس آ سکیں اور نہ ہی میں ان تک جا سکی۔

لیکن

اب مجھے کلی اطمینان ہو گیا تھا کہ مجھے کینیڈی ایئرپورٹ پر ان کی وجہ سے کافی سہولت ہو جائے گی۔ میرے دل میں اب سے پہلے ایئرپورٹ پر اترتے' سامان لیتے' چیکنگ کے مرحلے سے گزرنے اور امریکہ میں ٹھہرنے کا ویزا لگوانے کا ڈر سا تھا جو مسز رانا کو دیکھ کر دور ہو گیا...... اب میں ان کے ساتھ آرام سے ایئرپورٹ کی ساری فارمیلیٹیز پوری کر سکتی تھی اور خدانخواستہ مجھے ایئرپورٹ پر کوئی لینے نہ آیا ہوا تو میں ان کے ساتھ جا سکتی تھی۔

مسافر بیٹھ گئے اور جہاز کی روانگی کا وقت ہوا۔ جہاز میں جو جو احتیاطی تدابیر دی جاتی ہیں' دی جانے لگیں۔ ایئر ہوسٹسز نے باقاعدہ عملی مظاہرہ کر کے دکھایا کہ مسافروں کو کیا کرنا ہے۔

جب سب کچھ ہو چکا تو میں نے اٹھ کر مسز رانا کے پاس جا کر علیک سلیک کرنے کا سوچا۔ وہ بھی شاید اسی خیال سے اٹھیں۔ مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھنے لگیں۔ ادھر سے میں ان کی طرف بڑھی۔ بڑے تپاک سے ہم گلے ملے۔ احوال پرسی کی' بچوں کی خیر و عافیت دریافت کی۔

پھر میں نے پوچھا "امریکہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

وہ بولیں "نیوجرسی۔ اپنے دوسرے بیٹے کے پاس۔"

میری تو خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں جلدی سے بولی "میں نے بھی نیوجرسی ہی جانا ہے۔"

"میں نے بیٹے کو اطلاع کر دی ہوئی ہے۔ وہ ایئرپورٹ پر آ جائے گا۔"

"میں نے بھی اطلاع تو کی ہوئی ہے۔ بشرہ مجھے لینے آئے گی۔"

بشرہ ان کی بیٹی کی سہیلی تھی اس لیے وہ اسے اچھی طرح جانتی تھیں۔

"آپ کی بہن بھی تو نیوجرسی میں ہے۔" وہ بولیں۔

"جی۔ اسی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے امریکہ جا رہی ہوں لیکن ابھی میں بشرہ کے ہاں جاؤں گی۔ اس کے بچی ہوئی ہے۔"

"اچھا...... کب؟"

"دس گیارہ دن کی ہے۔ میری بھانجی کی شادی میں تو ابھی مہینہ باقی ہے۔ میں چند دن بشرہ کے پاس رہوں گی۔"

"وہ ریزیڈنسی کر رہی ہے۔"

"نہیں۔ ابھی تو اس نے U.S.M.L.E بھی پاس نہیں کیا۔ شادی ہو گئی۔ پھر سال بعد بچی آ گئی۔ اب آرام ہی سے پڑھائی شروع کرے گی۔"

"یہ تو ہے۔ ابھی بچی ہی کو پا لے گی......"

چند لمحے ہم دونوں باتیں کرتی رہیں۔ پھر جہاز رینگنے لگا۔ تو ہم نے اپنی اپنی سیٹوں کی طرف رخ کیا۔

مڑنے سے پہلے میں نے ان سے کہا" آپ بھی نیوجرسی جا رہی ہیں مجھے بڑی تسلی ہوگئی ہے۔ پہلی بار اور وہ بھی اکیلے امریکہ جا رہی ہوں۔ ڈر سا لگ رہا ہے۔"

وہ ہنس کر بولیں۔ "ڈر کیسا۔ فکر نہ کریں میں آپ کو بشرہ کے گھر تک پہنچا دوں گی۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

میں اپنی سیٹ پر آ بیٹھی اور اب اطمینان سے ایک طائرانہ سی نظر اکانومی کلاس کے مسافروں پر ڈالی۔ لندن سے زیادہ تر ہندو اور سکھ سوار ہوئے تھے۔ کچھ چینی' جاپانی بھی تھے۔ ہندوؤں' سکھوں میں چند لوگ ہی خوش شکل ہوں گے۔ ہندوؤں کی تو اکثریت بے ڈھبے سے لوگوں کی تھی۔ میں نے پاکستان سے سوار ہونے والے لوگوں کی طرف دیکھا۔ اپنے ہم وطن خوش رنگ' خوش وضع اور بہت پیارے لگے۔ ان کے چہروں پر رونق اور چمک سی تھی۔ واللہ اعلم یہ میرا حسن ظن تھا یا واقعی حقیقت۔

بہرحال

جہاز نے اب اڑان لے لی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ لندن کی آبادی نظروں سے دور ہو رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ بالکل ہی نظروں سے دور ہوگئی اور یوں لگا جیسے جہاز بادلوں کے اوپر اڑ رہا ہے لیکن یہ بادل نہیں تھے۔ سمندر تھا۔

اور

اب

امریکہ تک کی اڑان سمندر کے اوپر ہی سے تھی۔ پورے نو گھنٹے ہم نے آسمان اور سمندر کے درمیان سفر کرنا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا جو خوشگوار بھی تھا اور کچھ ڈراؤنا بھی...... ابھی روشنی تھی اس لیے میں گاہے گاہے کھڑکی سے باہر دیکھ لیتی۔ دو دفعہ بحری جہاز بھی نظر آئے۔ چونکہ ہم بہت بلندی پر محو سفر تھے اس لیے جہاز کھلونے لگ رہے تھے۔

ہم چونکہ مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے اس لیے پاکستان اور یہاں کے وقت میں گھنٹوں کا فرق آ رہا تھا۔

کویت تک پاکستان اور کویت کے وقت میں دو اڑھائی گھنٹے کا فرق تھا۔ یعنی صبح کے دس بجے کی بجائے ہم صبح آٹھ بجے کویت کے وقت کے مطابق ایئرپورٹ پر تھے۔ اسی طرح لندن پہنچتے گھڑیوں کا فرق پانچ گھنٹے پر محیط ہو چکا تھا اور اب امریکہ تک یہ وقت کا فرق 10 گھنٹے ہو جاتا تھا۔ یعنی پاکستان میں دن کے آٹھ تو یہاں رات کے 10 بجے تھے۔

خیر

سفر طے ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے سیٹ کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ لوگ جو پاکستان سے سوار ہوئے تھے' سو چکے تھے۔ انہیں اپنے پاکستانی وقت کے مطابق نیند نے گھیر لیا تھا لیکن مجھے آنکھیں بند کرنے کے باوجود نیند نہ آ رہی تھی۔ مجھے سفر خواہ گھنٹے کا ہو خواہ بیس گھنٹے کا' نیند کبھی نہیں آتی۔ اب بھی نہیں آ رہی تھی۔ طبیعت میں کچھ بیزاری کی سی کیفیت تھی۔ تکان بھی محسوس ہو رہی تھی۔ سیٹ پر پاؤں لٹکائے بیٹھ بیٹھ کر ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ برابر والی سیٹ خالی ہوتی تو میں بھی ٹانگیں اوپر کر کے سکڑ سمٹ کر لیٹ جاتی۔ جیسے ایک دو سیٹوں پر مسافر اسی انداز میں سوئے پڑے تھے۔ اب کچھ دلکشی جہاز کے اندر تھی نہ باہر...... ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور نیلا آسمان۔ کسی کسی وقت تو سوچ کر کپکپی سی آ جاتی کہ خدانخواستہ جہاز میں کچھ خرابی ہو جائے تو لینڈ کرنے کی تو کوئی جگہ ہی نہ تھی۔

سوچتے سوچتے میں جہاز کی ساخت پر غور کرنے لگی۔ ٹنوں وزنی جہاز کس روانی سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اڑا جا رہا تھا۔ کشش ثقل کے اصول کا اس پر کوئی اطلاق نہ ہوتا تھا۔ حالانکہ ذرا سی وزنی چیز بھی ہوا میں اچھالی جائے تو فوراً ہی زمین پر آن گرتی ہے۔ یہ جہاز انسانی دماغ کی صلاحیتوں کا حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ میں کافی دیر یہی سوچتی رہی۔ کیا دماغ تھے جنہوں نے یہ چیز ایجاد کی تھی۔ ایجادات میں حیرت انگیز چیزوں کو دھیان میں لائیں تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ مجھے تو حیرانی اس بات پر ہو رہی تھی کہ سب حضرت

انسان کے دماغی کرشمے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دماغ میں اتنی صلاحیتیں بھر دی ہیں جنھیں بروئے کار لا کر بندہ کیا کچھ بنا رہا ہے۔

میرا کافی وقت انہی سوچوں میں گزر گیا۔ ایئر ہوسٹسز کی ہلچل نے سیدھے ہو کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سیٹوں کے درمیانی راستوں پر ٹرالیاں گھسیٹتے مسافروں کو کھانے پینے کی چیزیں تقسیم کرتی چلی آ رہی تھیں۔ کوئی چائے لے رہا تھا کوئی کافی' گتے کے چھوٹے چھوٹے فوڈ بکس بھی دیئے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ چائے اور کافی چھوڑ ڈرنکس لے رہے تھے۔ کچھ جوس کے ڈبے مانگ رہے تھے۔

بہر حال۔ کچھ تو جمود ٹوٹا تھا اور جہاز میں کچھ زندگی بیدار ہوتی نظر آئی تھی۔ بچوں نے ہلا گلا شروع کر دیا تھا۔ چپ بیٹھے بیٹھے وہ بھی تنگ آ چکے تھے۔ کچھ تو اٹھ اٹھ کر دوڑنے بھاگنے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ مائیں پکڑ پکڑ کر سیٹوں پر بٹھا رہی تھیں...... کچھ انہیں بہلا رہی تھیں۔ کچھ ڈرا دھمکا رہی تھیں۔ ایئر ہوسٹسز نے انہیں چاکلیٹس اور ٹافیاں دیں۔ بچے خوش ہو گئے۔ اب وہ اپنی اپنی سیٹوں پر ہی اچھلنے کودنے لگے۔

بہت چھوٹے گود کے بچوں کے لیے کاٹس ہوتی ہیں جو پارٹیشن کی دیوار کے ساتھ لگائی جاتی ہیں۔ اتنے چھوٹے بچے والی ماں کو اگلی نشست دی جاتی ہے تاکہ وہ بچے کو کاٹ میں لٹا سکے۔ لمبے سفر میں اتنے چھوٹے بچوں کو گود میں لٹائے رکھنا ماؤں کے لیے مشکل امر ہے اس لیے ان کی سہولت کے پیش نظر انہیں آگے سیٹ دی جاتی ہے اور کاٹ بھی دی جاتی ہے تاکہ ماں اور بچہ آرام سے سفر کر سکیں۔

لوگ کھا پی چکے تو ایئر ہوسٹسز دوبارہ خالی ڈبے' ٹن اور ٹرے وغیرہ سمیٹنے آ گئیں۔ سب کچھ سمیٹ کر وہ ٹرالیاں واپس لے گئیں۔ اب ہلچل کم ہونے لگی۔ کچھ لوگ پھر اونگھنے لگے۔ کچھ باتیں کرنے لگے۔ کسی نے ٹی وی سکرین پر نگاہیں ڈالیں۔ کچھ ہیڈ فون لگا کر گانے سننے لگے۔ چند لوگوں نے اخبار اٹھا لیے اور کچھ رسالے اور کتابیں کھول بیٹھے۔

جہاز سوئے منزل رواں دواں تھا۔

وہی نیچے ٹھاٹھیں مارتا بحر اوقیانوس

اور

اوپر نیلا آسمان۔

اب باہر دیکھنے میں مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے پھر قدرے ریلیکس ہونے کے لیے سیٹ کی پشت سے تساہل سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کافی دیر یونہی گزر گئی۔

میں سیدھی ہو بیٹھی۔ ارد گرد ایک طائرانہ نظر مسافروں پر ڈالی۔ میری نظر مسز رانا پر پڑی۔ وہ شاید باتھ روم سے ہو کر اپنی سیٹ کی طرف آ رہی تھیں۔ مجھے مسکرا کر دیکھا' ہاتھ ہلایا۔ جواباً میں نے بھی یہی کیا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

میرا خیال تھا کہ منزل مقصود آنے والی ہے' کیونکہ چند لوگوں کو میں نے کلائی پر بندھی گھڑیاں دیکھتے پایا۔

لیکن میرا خیال غلط تھا۔ لوگ اپنا وقت اب امریکہ کے وقت سے سیٹ کر رہے تھے کیونکہ رات اتر چکی تھی۔

میں نے پھر سر پشت پر ڈال دیا اور تساہل سے آنکھیں بند کر لیں۔

شاید مجھے تکان سے اونگھ آ گئی تھی اس لیے کہ جب میری آنکھ کھلی تو اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ ہم J.F.Kennedy ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ باہر درجہ حرارت اتنا ہے۔ اپنی بیلٹس باندھ لیں۔ جہاز کے رکنے تک اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں وغیرہ وغیرہ۔ امریکہ پہنچنے پر ویلکم بھی کہا گیا...... اب لوگ مستعد اور چوکس ہو گئے تھے۔ اپنا اپنا دستی سامان اکٹھا کر رہے تھے۔

جہاز اب تیزی سے اونچائی سے نیچے آ رہا تھا لیکن فلائٹ بڑی ہموار تھی۔ جہاز نے ٹھیک وقت پر لینڈ کیا۔ پھر رینگتا ہوا اپنی جیٹی کی طرف جانے لگا...... اب تک کچھ لوگ اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ حالانکہ جہاز کے انجن بند ہونے تک انہیں بیلٹس باندھے رکھنے اور دیگر احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے اناؤنسمنٹ کی گئی تھی۔

جہاز جیٹی سے لگا۔

پھر

اس کا دروازہ کھول دیا گیا...... اور مسافر لائنیں بنانے لگے۔

میں نے بھی اپنی چیزیں اکٹھی کیں۔ اوپر والی کیبنٹ سے دستی بیگ اتارا' کوٹ پہنا' ہنڈ و کندھے پر لٹکایا اور باہر نکلنے کے لیے لائن میں لگ کر انتظار کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ لوگ باہر جانے لگے۔ لائن میں لگے لوگ آگے کھسکنے لگے۔ میں نے پھر ایک نظر سب پر ڈالی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مسز رانا کہیں نظر نہ آئیں۔ شاید وہ پہلی لائن میں تھیں اور جہاز سے باہر جا چکی تھیں۔

میں گھبرائی تو بہت لیکن جلد ہی اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جیٹی سے باہر ضرور لاؤنج ہوگا اور وہاں مسز رانا میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے انہیں پوری وضاحت سے بتا دیا تھا کہ میں پہلی بار اکیلی امریکہ آ رہی ہوں' اس لیے قدرے پریشان ہوں۔

خیر میں جہاز سے نکل کر جیٹی میں اور مسافروں کے ساتھ آئی۔ کچھ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ یہ سب لوگ ایئرپورٹ کی فارمیلٹیز پوری کر کے باہر جائیں گے۔ سب ہوائی اڈے سے باہر ہی نکلیں گے۔ مسز رانا نہ بھی ملیں تو میں ان سب باہر نکلنے والے لوگوں کا تعاقب کرتی جاؤں گی۔

چنانچہ

میں نے یہی کیا۔

مسز رانا مجھے انتظار کرتی نہ ملیں بلکہ وہ مجھ سے کافی آگے لوگوں کے جھرمٹ میں جاتی نظر آئیں۔ میں انہیں نہ تو آواز دے سکتی تھی' نہ ہی بشرہ کے گھر پہنچانے کا وعدہ یاد دلا سکتی تھی۔ ہاں ان کی اس لاپروائی پر مجھے غصہ ضرور آیا۔ وہی اپنا دل جلانے والا غصہ اور میں کر بھی کیا سکتی تھی۔

خیر

میں جہاز سے اترنے والے ہجوم کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ کبھی بڑے سے لاؤنج

سے گزرے۔ کبھی ڈھلوانی بڑے سے چوڑے کوریڈور سے۔ تھکاوٹ سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ وقت کی تبدیلی کا اثر بھی تھا۔ اس وقت پاکستان میں دن نکلا ہوا تھا۔ ہماری رات کی نیند شب بیداری کی نظر ہو گئی تھی۔ سر بھاری تھا اور چکر سے آ رہے تھے۔

بیگ کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی گھسیٹتے میں لوگوں کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ ویسے بھی جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی تختیوں پر لکھا ہوا بھی تھا۔ کہاں سامان والی بیلٹ ہے' کہاں سے ویزا لگوانا ہے' کدھر سے باہر جانا ہے۔ ان ہدایات کی رہنمائی سے حوصلہ ہوا۔ میں پہلے سامان لینے گئی۔ ٹرالیاں ساتھ ہی کھڑی تھیں۔ ہمارا سامان بیلٹ سے اتار کر رکھا ہوا تھا۔ کافی لوگ ادھر آ کر اپنا اپنا بکس' بیگ اور کارٹن وغیرہ تلاش کر کے ٹرالیوں پر رکھ رہے تھے۔

میں نے اپنے دونوں سوٹ کیس ڈھونڈے۔ زیادہ وقت نہیں ہوئی کیونکہ میں نے دونوں سوٹ کیسوں کے ہینڈلوں پر گلابی چوڑے ربن باندھے ہوئے تھے۔ یہ احتیاطی تدبیر مجھے میری بہن نسیم نے بتائی تھی۔ بڑی آسانی سے دونوں سوٹ کیس میں نے نکال لیے۔ یہ ربن نہ باندھتی تو شاید خاصی پریشانی ہوتی کیونکہ ایک ہی طرح کے کئی کئی سوٹ کیس سامان میں پڑے تھے۔

سامان ٹرالی پر رکھ کر میں دوسری طرف آ گئی۔ اس طرف لوہے کی بار والے جنگلے لگے تھے۔ درمیان میں راستے بنے تھے۔ جنگلوں کے پیچھے عملے کے آدمی میزوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ یہاں سامان وغیرہ چیک ہونا تھا اور امریکہ میں ٹھہرنے کا ویزا لگنا تھا۔

میرا سامان چیک نہیں ہوا۔ میں اگلے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی امریکی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے پاسپورٹ مانگا۔ میرا پاکستان سے ویزا ایک سال کا لگا تھا۔ یہاں ویزا چھ ماہ کا ملا۔

''کافی ہے۔'' امریکی آفیسر نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

میں نے متشکرانہ انداز میں یس کہا اور تھینکس کہتے ہوئے ٹرالی لے کر دوسری طرف آ گئی جہاں سے لوگ باہر نکل رہے تھے۔ باہر آنے جانے والوں کا رش تھا۔ روشنیوں سے رات' دن سے زیادہ روشن تھی۔

اب میں قانونی طور پر امریکہ میں داخل ہو چکی تھی۔

ٹرالی آہستہ آہستہ گھسیٹتے لوگوں کے ساتھ ساتھ میں باہر نکل آئی۔

یہاں بے انتہا لوگ کھڑے تھے۔ اپنے رشتہ داروں' دوستوں' بہن بھائیوں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ جونہی اپنے عزیز پر نظر پڑتی لوگ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے زور زور سے پکارتے ہوئے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ کوئی تلاش کر چکا تھا۔ کوئی تلاش میں تھا۔ ایک طرف بڑی سی شیشے کی دیوار تھی۔ وہاں سے بھی لوگ استقبال کرنے کے لیے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ نام لے لے کر پکار رہے تھے۔

اب میں باہر آ چکی تھی۔

بشرہ کی تلاش میں' میں نے نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ اردگرد لوگ ہی لوگ تھے۔ امریکی' چینی' جاپانی' پاکستانی' ہندوستانی' بنگلہ دیشی' افریقی غرضیکہ ہر خطہ زمین کے لوگ نظر آ رہے تھے۔

''نانی۔'' میں اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھ ہی رہی تھی کہ مجھے سامنے والے اوپر کے جنگلے سے بشرہ کی آواز آئی۔

''نانی نانی۔'' جب تک میں نے اسے دیکھ نہ لیا وہ مجھے ہاتھ ہلا ہلا کر آوازیں دیتی رہی۔ اوپر کوئی کیفے تھا جہاں وہ اور اس کا میاں فاران چائے پینے کے لیے گئے ہوئے تھے۔

میں نے اسے دیکھ ہی لیا۔

''نانی۔'' وہ خوشی سے بہکی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلایا' اس کے پہلو میں فاران کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی مسکرا کر مجھے ہاتھ ہلایا۔

''نانی السلام علیکم...... آپ یہیں کھڑی رہیں۔ اِدھر اُدھر نہ ہو جایئے گا۔ ہم نیچے آ رہے ہیں۔ فاران گاڑی لاتے ہیں۔ آپ یہیں کھڑی رہیے......''

وہ ایک ہی سانس میں اتنی باتیں کر کے پیچھے ہٹی اور ہجوم میں گم ہو گئی۔ فاران بھی چلے گئے۔ میں اس کے کہنے کے مطابق وہیں رک گئی۔

اب میں پوری طرح مطمئن تھی اور خوش بھی کہ اپنی بے حد پیاری نواسی کو ملنے والی تھی۔ بشرہ کی شادی 17 فروری 1997ء میں ہوئی تھی۔ وہ ایک ہفتے کے بعد ہی امریکہ چلی آئی تھی۔ اب اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی تھی۔ دس گیارہ دن کی بچی کو کیری کاٹ میں ڈالے وہ میرے استقبال کے لیے کینیڈی ایئرپورٹ پر موجود تھی۔

میرے پاس آتے ہی اس نے کیری کاٹ پرام میں رکھی اور مجھ سے والہانہ انداز میں لپٹ گئی۔ میں نے بھی اسے جی بھر کر پیار کیا۔ پھر اس کی بچی کو دیکھا جو کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کاٹ سے نکال کر اٹھانا چاہا تو بشرہ بولی ''نانی فاران گاڑی لے آئے ہیں۔ اسے گھر جا کر دیکھ لیجئے گا...... یہاں گاڑی زیادہ دیر رکنے نہیں دیتے' جلدی کریں۔''

میں نے ٹرالی پکڑی ہی تھی کہ فاران نے آ کر ٹرالی میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

''چلیں۔'' وہ بولا۔ ''سامان گاڑی میں فٹ کرتا ہے۔''

وہ ٹرالی گاڑی تک لے گئے۔ ہم دونوں بھی ان کی طرف بڑھ گئیں۔ بشرہ سب کا حال احوال پوچھتی جا رہی تھی۔ میں جواب دیتے ہوئے فاران کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میرے پاس دو سوٹ کیس تھے۔ جو کافی بڑے تھے۔ ایک بڑا بیگ تھا۔ بیگ اور ایک سوٹ کیس گاڑی کی ڈگی میں فٹ ہو گیا۔ دوسرے کے لیے گاڑی کے اندر جگہ نہ بن رہی تھی۔

کیونکہ

پچھلی سیٹ پر بچی کی سیٹ باندھنا تھی۔ امریکہ میں تین سال سے کم عمر بچوں کو فرنٹ سیٹ پر بٹھانا یا گود میں لے کر بیٹھنا جرم ہے۔ ان بچوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھانا یا ان کی کاٹ وغیرہ کو وہاں بیلٹ سے باندھنا ہوتا ہے۔ ان بچوں کے لیے کار کی سپیشل سیٹس بھی مل جاتی ہیں۔

اب سیٹ پر بچی کی کیری کاٹ رکھ کر بیلٹ سے فکس کرنے سے بکس رکھنے کے

لیے جگہ نہ بن رہی تھی۔ بشرہ کی اپنی اور بچی کی ٹوکری ڈائپر بیگ اور فیڈر کا بیگ بھی پڑے
تھے۔ بکس کے علاوہ ہم دونوں نے بیٹھنا بھی تھا۔ خاصا پرابلم پیدا ہوا۔

لیکن

اسے جلد ہی حل کر لیا گیا۔ دوسرا بکس اگلی سیٹ پر اس طرح رکھا کہ سکڑ سمٹ کر
میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میرا بیگ اور کوٹ پچھلی سیٹ پر فٹ ہوا۔ بشرہ بچی کے پاس پچھلی
سیٹ پر تھی۔ فاران نے سیٹ سنبھالی اور ہجوم میں سے گاڑی نکال لے گئے۔

امریکہ میں فاصلے میلوں میں نہیں وقت کے پیمانے سے ماپے جاتے ہیں۔ یعنی
بشرہ کا گھر جو یہاں سے تقریباً اسی میل دور تھا۔ یہ میل نہیں بتائے جاتے بلکہ کہا جاتا ہے کہ
بشرہ کے گھر تک پونے دو گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔

جے۔ ایف۔ کینیڈی ایئر پورٹ نیویارک میں ہے۔ یہ بے انتہا بڑا اور دنیا کے
تین چار مصروف ترین ایئر پورٹس میں سے ایک ہے۔ یہاں بھی دن رات میں سینکڑوں بین
الاقوامی اور ڈومیسٹک فلائٹس آتی جاتی ہیں۔ مختلف ایئر لائنز کے مختلف ٹرمینلز ہیں۔ اس کے
باوجود بے انتہا رش ہوتا ہے لیکن ایئر پورٹ پر اترتے ہی احساس ہوتا ہے کہ یہاں قانون کی
پابندی اور احترام کرنا لوگوں کے مزاج میں شامل ہے۔ رش کے باوجود کوئی دھکم پیل نہیں
ہوتی۔ قطار بندی دستور ہے۔ آرام سے ہر کام ہوتا ہے۔ سلیقے اور طریقے سے۔

نیویارک امریکہ کا انتہائی گنجان آباد شہر ہے۔ اسے "Big Apple" بھی کہا
جاتا ہے۔ دنیا کے کمرشل، فنانشل اور کلچرل سنٹرز یہاں پر ہیں۔ نیویارک کو پانچ حصوں میں
تقسیم کیا گیا ہے۔

(1) Queens کوینز
(2) Brooklyn بروک لین
(3) Staten Island سٹیٹن آئی لینڈ
(4) Bronks برونکس
(5) Manhattan مین ہیٹن

نیویارک تقریباً پچاس جزائر پر مشتمل ہے۔ یہ شہر امریکہ کا گیٹ وے کہلاتا ہے۔
یہاں مختلف قومیں آباد ہیں۔ 1990ء کی مردم شماری میں یہاں 52 فیصد گورے، 29 فیصد
کالے اور 7 فیصد ایشیائی آباد تھے۔ 1992ء میں اس کی آبادی 7,311,966 تھی۔ اس
کے علاقہ کوینز میں دو انٹرنیشنل ایئر پورٹ ہیں۔

جے۔ ایف۔ کینیڈی

اور

لاگوارڈیہ

دونوں مصروف ترین ہوائی اڈے ہیں۔

نیویارک مصروف ترین اور گنجان آباد شہر ہے۔ یہاں بے شمار چھوٹے بڑے
ڈیپارٹمنٹل سٹورز بڑی بڑی دکانیں، چائنیز مارکیٹیں اور ایشیائی بازار ہیں۔

نیویارک کو کپڑوں کی پروڈکشن، پینٹنگ کے میٹریل اور فوڈ پروسیسنگ میں دنیا
کے ایک لیڈر کی حیثیت حاصل ہے۔

یہاں بہت بڑی پبلک لائبریری ہے جس میں دنیا بھر کا بہت بڑا لٹریچر وغیرہ
ہے۔ اس کے علاوہ کالوں کی ہسٹری کی دستاویز بھی موجود ہیں۔

نیویارک نے امریکہ کی جنگ آزادی (1775ء-1783ء) کے اجراء میں بڑا
اہم کردار ادا کیا تھا۔

یہ نیویارک کا انتہائی مختصر سا تعارف ہے۔

ہم نے نیوجرسی جانا تھا۔ یہ سٹیٹ نیویارک سے ملحق ہے۔ نیوجرسی کا سفر
ہوئے ہمیں ہائی ویز سے گزرنا تھا۔ چھ چھ چوڑی سڑکوں والی ہائی ویز پر بڑی ٹریفک ہوتی
ہے لیکن گاڑیاں مخصوص رفتار سے قطار در قطار چلتی ہیں، اصول و قواعد کے مطابق۔

ہم بھی ہائی وے پر جا رہے تھے۔ بے انتہا چوڑی سڑکیں جن پر ایک طرف سے
ٹریفک جا رہی تھی۔ دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ ہر کوئی اپنی لین میں چلا جا رہا تھا۔
نیویارک روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ حد نگاہ تک بتیاں ہی بتیاں نظر آتی تھیں۔ اس وقت میں

تھکی ہوئی تھی۔ دماغ بھی جیسے چکرا رہا تھا۔ بشرہ سے باتیں بھی ہو رہی تھیں اس لیے راستے کی طرف کچھ خاص دھیان نہ دیا۔ کئی پل آئے اور گزرے۔ کئی ٹول ٹیکس چوکیوں پر لحہ بھر رکے ٹیکس دیا اور آگے چل دیئے۔ فاران کہیں کہیں بتا دیتے کہ اب ہم فلاں جگہ سے گزر رہے ہیں۔ فلاں برج کراس کر رہے ہیں۔ اس طرح کوئینز برج' وریزونا برج اور لنکن ٹنل سے ہم گزرے۔ لنکن ٹنل کے اوپر سے دریا گزرتا ہے اور نیچے اس ٹنل سے ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔ کئی میل لمبی ٹنل جو دریا کا بوجھ اٹھائے کھڑی ہے' خاصا عجوبہ ہے۔ یہ دریا نہیں دراصل سمندر کی ایک سٹرپ ہے جسے آبنائے کہنا چاہیے۔ اس کے نیچے ٹنل ہے جس میں ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔

نیویارک اور نیوجرسی کو جوڑی برج جو تین میل لمبا ہے اور دریائے ہڈسن کے اوپر بنا ہے' ملاتا ہے۔ یہ پل بھی قابل دید ہے۔

رات کے وقت اس برج کے اوپر سے گزرنا بڑا ہی حسین تجربہ تھا۔ دریائے ہڈسن کے کناروں پر مکانات بنے ہیں جو دریا کی ڈھلانوں پر بھی ہیں۔ رات کے وقت چمکتی روشنیوں کا عکس دریا کے پانی میں پڑ رہا تھا۔ یہ منظر اتنا خوبصورت لگ رہا تھا کہ الفاظ میں اس کی دلکشی اور خوبصورتی کو مقید کرنا مشکل لگ رہا ہے۔

بشرہ کی بچی سیٹ بیلٹ میں بندھی اپنی کاٹ میں سو رہی تھی اور ہم باتیں کر رہے تھے۔ بشرہ تو بڑی ایکسائٹڈ تھی۔ اس کا بس چلتا تو پاکستان میں رہنے والے ہر رشتہ دار' دوست' بہن بھائی' ماں باپ کے متعلق پوری تفصیل سے بات کر سکتی۔ وہ مسلسل ان کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

اور میں جواب دیئے جا رہی تھی۔

ہم باتیں کر رہے تھے۔ گاڑی چوڑی شاہراہ پر بڑے آرام سے جا رہی تھی کہ بشرہ کی بچی اٹھ گئی۔ وہ رونے لگی اور پھر روئے گئی۔

میں نے گردن موڑ کر بشرہ کو دیکھا "بشرہ بچی رو رہی ہے۔"

وہ اسے تھپک تھپک کر چپ کرا رہی تھی بولی "کوئی بات نہیں۔ ہم نیوجرسی میں

داخل ہو گئے ہیں۔ بیس منٹ کی اور ڈرائیو ہے۔"

"لیکن بچی رو رہی ہے اسے گود میں لے لو......"

"ہائے نانی نہیں۔"

"کیوں۔ کیا یہ یوں ہی روتی رہے گی......"

"چپ ہو جائے گی۔"

"اسے اٹھاتی کیوں نہیں ہو......"

وہ ہنس کر بولی "نانی یہاں بچے کو بیلٹ سے نکال کر گود میں لینا جرم ہے۔ ٹکٹ مل جاتا ہے۔" (یعنی جرمانہ ہوتا ہے)

"ہائے ہائے......" میں نے بے تحاشا روتی بچی کی طرف دیکھ کر بشرہ سے کہا "تو کیا یہ گھر تک روتی رہے گی۔"

"تھپک رہی ہوں چپ ہو جائے گی۔ فیڈر بھی نہیں لے رہی نا......"

"عجیب قانون ہے۔ بچہ رو رو کر ہلاک ہو رہا ہو۔ اور......"

"نانی۔" وہ ہنس رہی تھی۔ "قانون ہے۔ اگر بچہ چپ نہیں ہو رہا تو ہمیں دوسری لین میں جا کر گاڑی روکنا ہو گی۔ پھر اسے چپ کرا کر یا فیڈ دے کر اسی طرح بیلٹ سے باندھ کر سیٹ پر رکھنا ہو گا۔ چلتی گاڑی میں اسے نہ اٹھا کر گود میں لیا جا سکتا ہے نہ بیلٹ کھول کر کاٹ نکالی جا سکتی ہے۔"

میں نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ بچی کے رونے سے مجھے ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔

"تو پھر دوسری لین میں جا کر گاڑی کھڑی کر لو فاران۔" میں نے کہا۔

"نہیں نانی۔ چپ ہو جائے گی۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔ رکنے سے اور دیر ہو جائے گی۔"

بشرہ اسے تھپکتی رہی۔

اور

بچی

کچھ دیر بعد چپ ہو گئی۔

امریکہ بہادر کا یہ قانون مجھے آج ہی پتہ چلا تھا۔ جو میرے لیے خاصی حیرانگی بلکہ پریشانی کا باعث تھا۔

میں نے بشرہ اور فاران سے کہا ''امریکہ میں ماں باپ کے دل بچوں کی طرف سے شروع سے پتھر کر دیتے ہیں......''

وہ دونوں میری بات پر بے ساختہ ہنس پڑے۔

فاران بولے ''یہ بچوں کی سیکیورٹی کے لیے کیا جاتا ہے۔ گاڑی کی تیز رفتاری سے بچے کو گود میں لینے سے یا کیری کاٹ سے نکالنے سے دھچکا بھی لگ سکتا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

ہم گھر کی طرف رواں دواں تھے۔ سڑکوں کے کنارے راستے بتانے کے لیے جگہ جگہ بورڈ لگے تھے۔ تیروں کے نشان بنے تھے۔ لین نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ اشارے جل بجھ رہے تھے۔ ان کی مدد سے انجان آدمی بھی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔ یہاں ٹریفک کا نظام بہترین تھا۔ بڑے ہموار طریق اور ایک سی روانی سے شاہراہ کی چھ چھ سڑکوں پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ یہاں گاڑیوں کی رفتار متعین تھی۔ اگر کوئی اس حد سے تجاوز کرتا ہے تو فوراً پولیس اس کا تعاقب شروع کر کے اسے جا لیتی ہے۔ پھر ٹکٹ مل جاتا ہے۔ یعنی جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔ اردگرد سڑک کے کناروں پر کہیں پولیس نظر نہیں آتی۔ حیرانگی ہوتی ہے کہ یہ ایک دم نکل کہاں سے آتی ہے اور اسے پتہ کیسے چلتا ہے کہ فلاں گاڑی نے مقررہ حد سے تجاوز کر کے خلاف ورزی کی ہے۔

میں نے اپنا یہ سوال فاران پر کیا۔ وہ مسکرا کر بولے ''نانی یہاں کا نظام بڑا اپاور فل ہے۔ پولیس سڑک کے کناروں پر درختوں' جھاڑیوں کے پیچھے چھپی ہوتی ہے۔ ان کے پاس راڈار قسم کے آلات ہوتے ہیں۔ جو گاڑی کے پہیوں پر سرخ رنگ کی ہلکی سی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سے سپیڈ پتہ چل جاتی ہے اور وہ فوراً اپنی ''کمین گاہوں'' سے نکل کر گاڑی

پکڑنے کو دوڑ پڑتے ہیں۔ جرمانہ ہوتا ہے جو وصول بھی کیا جاتا ہے۔''

میں اس بات سے خاصی مرعوب و متاثر ہوئی۔

گاڑی اب شاہراہ سے نکل کر اسکیپا وے کے علاقے کی طرف جا رہی تھی۔ یہاں ہائی وے کی طرح تو نہیں لیکن پھر بھی خاصی چوڑی سرمئی سڑکیں تھیں۔ بتیاں روشن تھیں۔ ٹریفک نسبتاً کم ہو گئی تھی۔ اس علاقے میں بشرہ کا گھر تھا۔ کئی موڑ مڑ کر ہم بالآخر گھر تک آ ہی پہنچے۔

''لیں نانی۔ اب میں سارہ کو کیری کاٹ سے نکال رہی ہوں۔'' گاڑی رکتے ہی بشرہ نے کہا۔ ''ہمارا گھر آ گیا ہے۔''

''شکر ہے۔'' میں بولی۔

فاران نے گاڑی سے اتر کر میری طرف کا دروازہ کھولا۔ میرا سوٹ کیس نکالا۔

''اب آ جائیے۔'' انہوں نے کہا۔ ''کوٹ پہن لیں باہر بہت سردی ہے۔''

میں گاڑی سے باہر نکل آئی۔ کوٹ کندھوں پر ڈال لیا تھا۔ بشرہ اپنی بچی سارہ کو لیے میری طرف آئی۔ وہ کمبل میں لپٹی تھی۔ بشرہ نے اس کا چہرہ ذرا سا ننگا کیا اور بولی ''دیکھ لیں سارہ صاحبہ کو......''

میں نے بچی کو اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا ''بشرہ بڑی ٹھنڈ ہے۔ پہلے اسے گھر لے چلیں پھر سامان وغیرہ نکال لینا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' فاران بولے۔ بشرہ میرا بڑا سا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی ''سارہ کو اٹھا کر چل سکیں گی......''

''کیوں نہیں......'' میں نے ننھی سی کمبل میں لپٹی بچی کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں فٹ پاتھ پر آ گئیں۔ چند قدم پر ہی ان کے اپارٹمنٹس تھے۔ ایک ایک بیڈروم کے یہ اپارٹمنٹس انگریزی حرف 'یو' شیپ میں بنے تھے۔ دائیں ہاتھ تیسرا اپارٹمنٹ بشرہ کا تھا۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ کچھ اپارٹمنٹس کی بتیاں جل رہی تھیں۔ کچھ اندھیرے

میں ڈوبے تھے۔ شاید ان کے مکین ابھی گھروں کو واپس نہیں آئے تھے۔

بشرہ نے دروازہ کھولا اور میں جلدی سے بچی کو لے کر اندر داخل ہو گئی۔

بشرہ بیگ رکھتے ہوئے بولی "آپ سارہ کو رکھیں۔ میں فاران کے ساتھ باقی سامان لے آؤں۔"

اپارٹمنٹ سنٹرلی ہیٹڈ تھا۔ میں لاؤنج میں پڑے بڑے سے سفید صوفے پر بیٹھ گئی اور سارہ کو گود میں لے کر اس کے چہرے سے کمبل ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی بڑی مشابہت بشرہ سے تھی۔ لگتا تھا ننھی سی بشرہ گود میں آ گئی ہے۔ میں نے اسے پیار کیا۔

بشرہ اور فاران سامان لے آئے۔ دروازے کے قریب ہی لاؤنج کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ میں نے ایک نظر لاؤنج پر ڈالی۔ لکڑی کے فرش والا یہ لاؤنج بہت زیادہ بڑا تو نہ تھا لیکن خوبصورت تھا۔ ایک طرف بیرونی بڑے سے شیشے والی کھڑکی تھی۔ کونے میں سرسبز بڑا سا پلانٹ رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی صوفے کے سامنے ٹی وی تھا۔ درمیانی میز پر گلدان میں پھول سجے تھے۔ ایک دو کرسٹل کے ڈیکوریشن پیسز تھے۔ سامنے ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں پڑی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کچن تھا۔

لاؤنج کے ساتھ ہی بیڈروم تھا' جس کا باتھ روم سامنے ہی تھا۔ لاؤنج کے ساتھ دیوار کے اندر کی طرف سٹیپ ان وارڈ روب تھی۔ اسے سٹور بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ الماری میں گھر کا سارا فالتو سامان بند تھا۔ ایک طرف میرے سامان کے لیے بشرہ نے جگہ بنا رکھی تھی۔

یہ سنگل بیڈروم اپارٹمنٹ تھا' لیکن ایک جوڑے کی سہولت کے لیے یہاں ہر چیز موجود تھی۔ بیڈروم میں بھی خاصی بڑی وارڈ روب تھی۔ باتھ روم کے باہر جو پیج تھا اس میں دو الماریاں تھیں۔ کچن کیبنٹس میں باورچی خانے کا سارا سامان سمایا ہوا تھا۔ اپارٹمنٹ میں فرج' مائیکرو ویو اوون اور کوکنگ رینج مہیا تھے۔ چھوٹا سا گھر بڑا آرام دہ تھا۔ فائر الارم بھی لگے ہوئے تھے۔

بشرہ نے اپنا گھر خوب سجا رکھا تھا۔ بیڈروم اور لاؤنج میں چھوٹے

خوبصورت قالین ڈالے ہوئے تھے۔ بیڈ ڈریسنگ ٹیبل اور بچی کی کاٹ اووک وڈ کی تھی۔

مجھے اس کا چھوٹا سا گھر ہر سہولت اور ضرورت کی اشیاء سے آراستہ بہت اچھا لگا۔ بشرہ ڈاکٹر ہے۔ اس کے میاں انجینئر...... شادی سے پہلے بشرہ بڑی الہڑ اور لاپروا قسم کی لڑکی تھی۔ مجھے امید نہ تھی کہ اس نے گھر اتنی تن دہی اور سلیقے سے رکھا ہو گا۔

بشرہ کچن میں چلی گئی اور فاران مجھ سے راستے کا حال احوال پوچھنے لگے۔

"نانی" بشرہ نے وہیں سے پکارا۔

"جی۔"

"پہلے چائے پئیں گی یا کھانا لگا دوں۔"

"کھانا کھا کر چائے پئیں گے۔"

"ٹھیک۔ آپ دوائی لے لیں۔" پھر وہ کچن کے دروازے میں آتے ہوئے بولی "اپنی دوائیاں لائی ہیں نا۔"

"ہاں۔"

"اچھا کیا۔ یہاں بغیر ڈاکٹر کو کنسلٹ کیے دوائی نہیں ملتی اور ڈاکٹر کو دکھانا بہت مہنگا ہے۔"

میں اپنی دوائیاں ساتھ لے کر گئی تھی۔ بلڈ پریشر اور ذیابیطس کی دوائیاں۔ مجھے علم تھا کہ امریکہ میں بغیر سکیورٹی لیے علاج نہیں کروایا جا سکتا۔ مفت علاج کی سہولت وزیٹر ویزا پر آنے والوں کو نہیں ملتی۔

کھانا کھاتے ہوئے بھی ہم تینوں باتیں کرتے رہے۔ فاران اور بشرہ اپنے ماں باپ' بھائی بہنوں اور عزیز و اقارب کی خیریت بڑے تجسس سے معلوم کر رہے تھے۔

فارغ ہو کر ہم پھر صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"تمہارا گھر تو چھوٹا سا ہے۔ میرا سامان کہاں رکھو گی۔" میں نے بشرہ سے کہا۔

"یہ آپ کے دائیں ہاتھ کے پیچھے سٹیپ ان وارڈ روب ہے۔ یہ سٹور ہی سمجھیں۔ میں نے ایک طرف آپ کے سامان کے لیے جگہ بنائی ہوئی ہے۔ میں اور فاران

ابھی سارا سامان فٹ کر دیں گے۔"

"فٹ کرنے سے پہلے میرا کچھ بوجھ کم کر لو۔"

"کیا مطلب۔"

"بھئی اپنی امیوں بہنوں اور خالاؤں کی طرف سے بھیجے گئے تحائف لے لو۔"

"خوب۔"

میں نے اٹھ کر اپنا ایک بکس کھولا۔ یہ تحائف ہی سے بھرا تھا۔ بشرہ کے پہلی بچی پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے سب نے کوئی نہ کوئی گفٹ اسے بھیجا تھا۔ میں اپنی طرف سے بھی لائی تھی۔

میں نے ساری چیزیں نکال کران کے سامنے رکھ دیں۔

تحفہ چاہے معمولی سا بھی ہو۔ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بھیجنے والے کے جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔ کسی کو یاد رکھنے کا اظہار ہوتا ہے۔ بشرہ اور فاران ان جذبوں کو سمجھ رہے تھے۔ اس لیے ہر چیز کو محبت سے اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔

ان کی چیزیں نکال کر میں نے باقی چیزیں بکس میں ٹھیک طرح سے رکھیں اور سوٹ کیس بند کر دیا۔

"اور کیا کچھ تھا سوٹ کیس میں نانی۔ ہمیں دکھا ہی دیتیں۔"

میں مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ایسے ہی چھوٹے موٹے تحائف ہیں جیسے تمہیں دیئے۔ شمو، صائمہ، حمیرا، آمنہ اور ریشم کے لیے گفٹ......"

"آپ ریشم کے پاس بھی جائیں گی......" بشرہ نے حیرانگی سے کہا۔ وہ کیلیفورنیا کے شہر سان ڈیگو میں تھی۔

"وہ شاید شادی پہ آ جائے......" میں نے کہا اور پھر لمحے کے توقف کے بعد بولی "نہ آئی تو مجھے جانا پڑے گا۔ وہ بھی تو نواسی ہے اور تمہاری طرح میری دوست بھی۔ اسے ملے تو دو سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے......"

ہم باتیں بھی کرتے رہے اور بشرہ میرا سامان بھی ٹھکانے لگاتی رہی۔

"آپ بہت تھکی ہوں گی۔ جیٹ لیگ بھی ہوتا ہے۔ کوشش کریں سونے کی۔" فاران نے کہا۔

"تم لوگوں سے مل کر میں بالکل تازہ دم ہو گئی ہوں۔"

"ہائے نانی" بشرہ میرے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی "آپ نے کتنا اچھا کیا جو آ گئیں۔ ساری اداسیاں دور ہو جائیں گی۔"

میں نے اسے پیار کیا۔

اس کی بچی سو چکی تھی۔ اب وہ آرام سے میرے ساتھ لیٹی بیٹھی تھی۔ وہ کتنی اداس تھی اپنوں سے۔ میں بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شمیم کا فون آ گیا۔

علیک سلیک اور احوال پرسی کے بعد وہ بولی "آپ آئی میرے گھر تھیں۔ بشرہ آپ کو لے اڑی۔"

"تمہارے گھر ہی آئی ہوں۔" میں نے کہا "ایک ہفتہ بشرہ کے ہاں رہ لوں۔ زچگی کے وقت بھی بیچاری کے پاس کوئی نہیں تھا۔ چند دن اس کو کمپنی دے کر تمہارے ہاں آ جاؤں گی۔" وہ مصر تھی کہ میں کل ہی آپ کو لینے آ جاؤں گی۔

لیکن

میں نے اسے سمجھا دیا۔ بشرہ کی بیٹی ابھی صرف دس گیارہ دن کی تھی۔ اسے کچھ دن آرام کی تو ضرورت تھی۔ اس ملک میں لاکھ اور سہولتیں سہی۔ لیکن گھر کا کام ہر ایک کو خود کرنا پڑتا ہے۔ بچہ ہونے کے ایک دو دن بعد ہسپتال سے واپس آ کر گھر کے سارے کام خود ہی کرنا پڑتے ہیں۔ نوکروں کا تو وہاں تصور ہی نہیں۔ بے حد امیر لوگ ہی میڈ رکھنا افورڈ کر سکتے ہیں۔

فاران اٹھ کر سونے کے لیے چلے گئے۔ بشرہ بچی کو بھی اس کی کاٹ میں ڈال آئی۔

ہم بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔

پھر

بشرہ نے میرا بستر صوفے پر بنا دیا "نانی یہاں ایک ہی بیڈ روم ہے۔ ہم تو چاہتے تھے آپ وہاں سوئیں۔ ہم یہاں سو جاتے ہیں۔ لیکن سارہ کا کاٹھ کباڑ وہیں بکھرا ہے۔ فاران نے بھی صبح آفس کے لیے تیار ہونا ہوتا ہے اور......"

میں نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی "مجھے پتہ ہے تمہارا سنگل بیڈ روم اپارٹمنٹ ہے۔ یہ صوفہ کافی چوڑا ہے۔ میں آرام سے اس پر سو سکتی ہوں۔"

"سارہ رات کو دو تین بار اٹھتی ہے۔ روتی بھی بہت ہے۔ آپ کو ڈسٹرب کرے گی۔"

"تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو بشرہ۔ میں ڈسٹرب نہیں ہوؤں گی۔ تم بے فکر رہو۔ ویسے بچی اتنا روتی کیوں ہے۔"

"پتہ نہیں پیٹ میں ہوا ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ تو اتنا روتی ہے کہ فاران اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"کندھے سے لگا کر اس کی پیٹھ سہلایا کرو۔"

"کل سے آپ اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔" بشرہ نے مذاق سے تحویل پر زور دیا۔

"ٹھیک ہے۔"

میں بستر میں گھس گئی۔

"غسل خانے کی بتی جلا دیتی ہوں۔ رات اٹھنا پڑے تو......"

غسل خانہ بیڈ روم کے اندر نہیں تھا۔ لیونگ روم اور بیڈ روم کے درمیانی راستے کے ایک طرف تھا۔ اس نے بتی جلا کر دروازہ بھیڑ دیا۔

پھر

شب بخیر اور اللہ حافظ کے الفاظ کے تبادلے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

میں بستر میں لیٹ گئی۔ نرم سا کولٹ بھی اپنے اوپر ڈال لیا۔ باہر درجہ حرارت شاید منفی میں جا رہا تھا۔ لیکن گھر کے اندر خنکی نہ تھی۔ یہ کولٹ بھی اک تکلف ہی لگ رہا تھا۔

میرا خیال تھا تکان ہے۔ جلدی سو جاؤں گی۔

لیکن

کروٹیں بدل بدل کر بھی نیند آنکھوں سے دور رہی۔ ایک تو ٹائم کا فرق۔ اس وقت پاکستان میں دن تھا۔ یہاں رات۔ دوسرے جگہ کی تبدیلی۔

پتہ نہیں کس وقت میری آنکھ لگی۔

اور

پھر

اس طرح سوئی کہ نہ تو مجھے بشرہ کی بچی کے رونے نے ڈسٹرب کیا۔ نہ ہی یہ پتہ چلا کہ فاران نے کس وقت ناشتہ کیا۔

اور

کس وقت آفس گئے۔

میری جب آنکھ کھلی تو دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

اور

بشرہ بے آواز ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

--------O--------

دوسرا دن ہم نے گھر ہی میں گزارا۔ میں اور بشرہ باتیں ہی کرتے رہے۔

باتیں

جو ختم ہونے ہی میں نہ آ رہی تھیں۔ اس دوران میری بھانجیوں آمنہ اور حمیرا کے بھی فون آئے۔ دونوں بہت خوش تھیں۔ دونوں یہاں اپنے اپنے گھروں میں خوش باش تھیں، لیکن ان کی باتوں سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنوں سے بچھڑ کر وہ کافی اداس بھی تھیں اور شادی پہ ہم سب کے آنے سے وہ نہال ہو رہی تھیں۔

"میرے ہاں کب آئیں گی۔"

"بشرہ کے گھر ہی نہ بیٹھی رہیے گا۔"

"کب لینے آؤں؟۔"

دونوں کے دلی جذبات کا والہانہ پن میں محسوس کر رہی تھی۔

"ابھی میں نے یہاں تین چار ہفتے رہنا ہے۔ ہر ایک کے گھر آؤں گی اور رہوں گی بھی۔ فکر نہ کرو۔ تنگ نہ آ جانا۔"

"ہائے رضیہ خالہ...... ہم تو ترس رہے ہیں آپ سب سے ملنے کو۔ آپ کی آواز سن کر ہی اتنی خوشی ہو رہی ہے۔ جب آپ سے ملیں گے تو سوچیں ہماری خوشیوں کا کیا حال ہوگا۔"

"جیتی رہو۔" میں نے دونوں کو بہت دعائیں دیں۔

میں نے فون بند کیا تو بشرہ بولی "ابھی سب آرام سے بیٹھی رہیں۔ آپ نے

بہت دن میرے ہاں رہنا ہے......"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا "صائمہ کی شادی پہ بھی جانے دو گی یا نہیں۔"

"وہ تو ہم نے بھی جانا ہے اور ابھی تو شادی میں بہت دن ہیں۔" وہ بولی۔

"اچھا بھئی۔ دیکھیں گے۔"

"کل آپ کو گھمانے لے جاؤں گی۔ فاران اور ان کا ایک کولیگ جو سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہتا ہے پول کرتے ہیں۔ ایک دن فاران گاڑی لے جاتے ہیں وہ ان کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ ایک دن وہ اپنی گاڑی میں فاران کو لے جاتا ہے۔"

"ہوں۔"

"اس طرح مجھے ہر دوسرے دن گاڑی مل جاتی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی۔ میں اس سے آپ کو ملاؤں گی۔ انڈیا کی ہے...... میری دوست بن گئی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ ہندو ہے یا مسلمان۔"

"خود ہندو ہے۔ شوہر عیسائی۔"

"یہاں شادی کی ہے۔"

"نہیں انڈیا ہی میں شادی ہوئی۔ اس کا خاوند بھی انڈین ہے۔ میں ان سے آپ کو ملاؤں گی۔ بڑی اچھی ہے۔"

"اس کے بچے ہیں......"

"نہیں۔" بشرہ نے کہا "وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ ہے بڑی لائق۔ باتیں بھی بڑے مزے کی کرتی ہے۔ ویسے بھی جب آتی ہے میرا کوئی نہ کوئی کام کر دیتی ہے۔ سارہ کو بھی گود میں لیے بیٹھی رہتی ہے۔ پر ایک بات ہے نانی......"

"کیا۔"

"وہ اکثر کوئی اچھی چیز پکائے تو میرے لیے لے آتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں وہ شے کھانے کو میرا جی نہیں کرتا۔ کبھی کڑھی بنا کر لے آتی ہے کبھی بھجیا اور کبھی کوئی نہ کوئی مٹھائی۔"

وہ منہ بنا بنا کر بتا رہی تھی۔ میں ہنس پڑی......

"نانی امیری بنی چیزیں وہ مزے سے کھالیتی ہے بلکہ کبھی کبھی اپنے خاوند کے لیے بھی لے جاتی ہے۔"

"اچھی بات ہے بشرہ۔ پردیس میں مل جل کر ہی رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے......"

"ہاں اس نقطۂ نظر سے ہماری دوستی بہت اچھی ہے۔ ابھی شاید آ جائے۔ دوسرے تیسرے دن چکر لگا لیتی ہے۔ آپ کا اسے بھی انتظار ہے۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ اسے پتہ ہے آج آپ یہاں ہیں اس لیے ضرور آئے گی۔"

چند لمحوں بعد میں نے بشرہ سے پوچھا "کسی امریکن لڑکی سے بھی ملتی ہو۔"

"ہاں۔ دو لڑکیاں پچھلے اپارٹمنٹس میں رہتی ہیں۔ ایک تو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ کوئی تین سال سے۔ اس سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"بغیر شادی کے۔"

"اور کیا۔ یہاں یہ بری بات تھوڑا ہی ہے۔ یہ میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ لیکن شادی نہیں کی ہوتی...... ایک دوسرے کو جانچتے پرکھتے ہیں۔ پھر شادی کر لیتے ہیں۔ بعض تو ساری زندگی بغیر شادی کے گزار دیتے ہیں۔"

"توبہ۔"

بشرہ ہنس کر بولی "ابھی تو یہاں آپ بہت کچھ دیکھیں گی۔ بہت کچھ سنیں گی۔"

"اور دوسری لڑکی......"

"اس نے طلاق لے لی ہوئی ہے۔ کسی سٹور میں کام کرتی ہے۔ نانی بڑے مزے مزے کے قصے ہیں۔ آپ کو سناؤں گی۔ بڑی کہانیوں کے پلاٹ ملیں گے۔"

"واقعی" میں نے کہا۔

شام فاران آ گئے۔ ہم نے اکٹھے چائے پی۔ بشرہ نے بڑے مزے کے دہی بھلے بنائے ہوئے تھے۔

وہاں پاکستانی یا ہندوستانی کھانے لوگ گھروں ہی میں بناتے ہیں۔ ایک دو سٹور یہاں ہیں جہاں سے مصالحہ جات مل جاتے ہیں۔ ایک پورا بازار بھی ہے جہاں سے ہندوستانی پاکستانی ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ گروسری دہی بھلے چاٹ مٹھائیاں سموسے پکوڑے ہر چیز دستیاب ہے۔ پورا بازار ہی ان دکانوں کا ہے۔

"یہاں سے یہ بازار کافی دور ہے۔ اس لیے وہاں سے ہم کبھی کبھی ویسی چیزیں لینے جاتے ہیں۔ عام طور پر چیزیں گھر پہ ہی بنا لیتے ہیں۔ ویسے پارٹی کرنا ہو تو اس بازار سے ہر چیز مل جاتی ہے۔ میں آپ کو وہاں لے جاؤں گی۔ آپ کو یوں لگے گا جیسے آپ امریکہ نہیں لاہور کے کسی بازار میں گھوم پھر رہی ہیں......"

بشرہ مجھے تفصیل سے بتانے لگی۔ حلال گوشت کی بھی وہاں دکانیں تھیں۔ کئی اور جگہ سے بھی حلال گوشت مل جاتا ہے۔ مسلمان لوگ انہی دکانوں سے گوشت لیتے ہیں۔

امریکہ میں یہودی بھی بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ یہودی حلال گوشت کھاتے ہیں جسے کوشر کہتے ہیں۔ اس طرح ان کی بھی حلال گوشت کی کئی دکانیں مختلف علاقوں میں موجود ہیں۔

"بشرہ گوشت تو حلال مل جاتا ہے۔ مرغی وغیرہ......" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی مل جاتی ہیں۔ فروزن مرغی بعض مسلمان ممالک سے بھی منگوائی جاتی ہے۔ یہاں ایک مسلم پاکستانی نے سٹور اور گوشت کی دکان کھولی ہوئی ہے۔ مرغیاں بھی ہوتی ہیں۔ میں تو مہینے کی گروسری گوشت مرغی وغیرہ اسی سے لاتی ہوں۔ مچھلی تو مارکیٹ سے عام مل جاتی ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اب۔ اس پاکستانی نے اب کیٹرنگ بھی شروع کی ہے۔ شادی بیاہ یا برتھ ڈے پر تقریب منعقد کرنا ہو تو یہ آدمی جو چیز چاہیں جتنی مقدار میں چاہیں سپلائی کرتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ بڑی آسانی ہو گئی ہو گی لوگوں کو......"

"بالکل...... اس کی بریانی کوفتے اور چکن روسٹ تو بڑا مشہور ہے۔ امریکن بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کی پکائی ہوئی چیزیں......"

''ہوں۔''

''اور نانی ہر قسم کے مصالحے بھی اس کے پاس ہوتے ہیں۔اب تو شان مصالحے یہاں دستیاب ہیں۔سرخ مرچ' دھنیہ' گرم مصالحے' تیز پات' سونف' اجوائن' کلونجی' پھٹکری غرضیکہ ہر چیز مل جاتی ہے۔بریانی مصالحہ' پلاؤ مصالحہ' قورمہ مصالحہ' بھجیا مصالحہ' کیا چیز ہے جو اب یہاں نہیں ملتی۔کسٹرڈ' پڈنگ' گلاب جامن اور دیگر مٹھائیوں کے پیکٹ ملتے ہیں۔لا کر گھر میں ہر چیز تیار ہو جاتی ہے۔میں خود اب ہر چیز بنا لیتی ہوں۔کل آپ کو گلاب جامن یا رس گلے بنا کر دکھاؤں گی......''

''تم تو بڑی گھڑ ہوگئی ہو بشرہ۔'' میں نے ہنس کر کہا۔''سال سوا سال ہی میں اتنا کچھ سیکھ لیا ہے......''

بشرہ نے میڈیکل کیا تھا۔ہاؤس جاب کر رہی تھی کہ شادی ہوگئی۔پھر شادی کے اگلے ہفتے وہ امریکہ آ گئی۔کھانے پکانے اور سیکھنے کا اسے پاکستان میں تو وقت ہی نہیں ملا تھا۔یہاں آ کر سب کچھ سیکھ لیا' وہ بھی سال بھر میں' میرے لیے حیرانگی لیکن خوشی کی بات تھی۔

امریکی لوگ سور کا گوشت کھاتے ہیں۔بھینس اور بکرے کا گوشت کم ہی استعمال کرتے ہیں۔مارکیٹ میں گوشت کی دکانوں پر پورک عام پڑا ہوتا ہے۔ان میں حلال و حرام کا بھی کوئی تصور نہیں۔اس لیے مسلمان کو محتاط ہونا پڑتا ہے اور اب حلال گوشت کی مسلمانوں کی دکانیں کھل جانے سے لوگوں کو سکون حاصل ہوگیا ہے کہ انہیں ذبیحہ گوشت مل جاتا ہے۔

میری بیٹی روبی شادی کے بعد امریکہ چلی گئی تھی۔اس کی شادی 1973ء میں ہوئی تھی۔تب اتنے زیادہ ہندوستانی اور پاکستانی امریکہ میں سیٹل نہیں ہوئے تھے۔تب انہیں حلال گوشت حاصل کرنے میں خاصی دقت ہوتی تھی۔

بشرہ سے بڑی معلوماتی گفتگو ہوتی رہی۔

رات کھانا ہم تینوں نے اکٹھے کھایا۔

''بشرہ تم تو واقعی کھانا پکانے میں ماہر ہوگئی ہو......'' میں نے اس کا پکا لذیذ کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

فاران مسکرا کر بولے''ڈاکٹری بھول چکی ہے۔کک اچھی بن گئی ہے۔''

''کیوں بھول چکی ہوں جی۔''بشرہ کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

''دیکھیں نانی۔''فاران بولے''یہ' اکثر ہے اور یہاں ڈاکٹر کی قدر و قیمت یقیناً ایک کک سے بہت زیادہ ہے۔''

''تو''میں نے کہا۔

''اسے چاہیے نا کہ کچن کی مصروفیات کم کر کے U.S.M.L.E کے امتحان کی تیاری کرے۔جب تک یہ امتحان پاس نہ کرے گی اسے ریزیڈنسی نہیں ملے گی۔ریزیڈنسی کے بعد ہی جاب وغیرہ ملتی ہے۔اسے کہیں اپنی پڑھائی تو ضائع نہ کرے۔''فاران خوشگوار انداز میں سنجیدہ بات کہہ رہے تھے۔

''نانی۔''بشرہ بولی''میں جانتی ہوں مجھے U.S.M.L.E پاس کرنا ہے۔اس کے دو سٹیپ تھے۔اب سنا ہے تین ہو گئے ہیں۔خاصا مشکل امتحان ہے۔اب دیکھیں نا۔گھر داری' پھر چھوٹی سی بچی...... پڑھائی کیسے کروں......''

پھر وہ فاران کی طرف دیکھ کر بولی''میں نے آپ سے کہہ دیا ہوا ہے کہ میں اپنے بچے کو بے بی سسٹر کے پاس نہیں چھوڑنا چاہتی۔ہم نے ایک بچہ رکھنا ہے یا دو۔جب یہ بچے سکول جانے کے قابل ہو جائیں گے نا' تب میں پڑھائی کی طرف آؤں گی اور جاب کا سوچوں گی۔میں اپنے بچوں کی تربیت خود کرنا چاہتی ہوں۔''

فاران مسکرا کر چپ رہے۔

بشرہ کی باتوں میں وزن تھا۔وہ جس معاشرے میں تھی' وہاں بچوں کی صحیح تربیت ماں ہی کو کرنا چاہیے تھی۔وہ بڑی ٹیلنٹڈ ہے۔میں جانتی تھی۔جب اس نے پڑھائی کرنا ہوگی تو پورے دھیان اور تن دہی سے کرے گی۔اس کا فیصلہ بہت اچھا تھا۔وہ بچوں کی اخلاقی بنیادیں بنا کر کوئی اور کام کرنے کے حق میں تھی۔اس نے بے بی سسٹرز پر چھوڑے ہوئے دو

تین بچوں کی مثال بھی دی' جن کی تربیت کسی طور معیاری نہ ہوئی تھی۔

کھانے کے بعد بھی ہم باتیں کرتے رہے۔

فاران کمرے میں چلے گئے۔ ہم دونوں نے برتن سمیٹے۔ میز صاف کی۔ پھر کچن میں آئے۔ مل کر برتن دھوئے اور صفائی کی۔ میں چاہتی تھی بشرہ کی زیادہ سے زیادہ مدد کروں۔ میرے ہوتے وہ کچھ آرام کرلے' لیکن بشرہ مجھے کام کرنے سے منع کرتی تھی۔

"آپ کو آئے ابھی ایک ہی دن تو ہوا ہے۔ میں کام کی عادی ہو چکی ہوں۔ یہاں ہر کام خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان والی عیش نہیں کہ بیٹھ کر نوکروں پر حکم چلاتے رہیں۔"

"بشرہ۔" میں نے جواب دیا" یہاں بے شک لاکھ سہولتیں ہوں گی لیکن یہ ہر کام جو خود کرنا پڑتا ہے خاصا مشکل ہے......"

"عادت ہو جاتی ہے نانی......"

میں نے یونہی سر ہلایا......

آج میں جلدی بستر میں لیٹ گئی۔ بشرہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھی۔ پھر بچی کے رونے پر اٹھ گئی۔ شب بخیر کہا۔ باتھ روم کی بتی جلائی اور لیونگ روم کی لائٹ بند کر کے کمرے میں چلی گئی۔

بستر میں لیٹتے ہی میری آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ پھر میں جلدی سو گئی۔

رات دو ایک بار آنکھ کھلی۔ ایک دفعہ تو سارہ کے رونے سے اور دوسری دفعہ یوں ہی۔

صبح میں جلدی اٹھ گئی۔ بشرہ اور فاران ابھی سو رہے تھے۔ گھڑی دیکھی۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کی بلائنڈ ہٹا کر باہر نظر ڈالی۔ صبح بیدار ہونے والی تھی۔ نماز کا وقت تھا۔ میں نے نماز پڑھنے کا سوچا۔ پھر باتھ روم میں چلی گئی۔

آج میں نے امریکہ میں پہلی نماز ادا کی۔

ناشتے کے بعد بشرہ اور میں نے جلدی جلدی کام سمیٹے۔ آج ہمارا باہر جانے کا پروگرام تھا۔

"آج میں آپ کو ایک دو سٹوروں پر لے جاؤں گی۔" بشرہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں سارہ کو گود میں لیے لیے بولی۔

"دوپہر کا کھانا باہر ہی کھائیں گے۔ میکڈونلڈ کے برگر کھائیں گے۔"

تب میکڈونلڈ اور کے ایف سی وغیرہ پاکستان میں نہیں کھلے تھے۔ امریکہ سے جو بھی پاکستان آتا میکڈونلڈ کے برگر اور کے ایف سی کے چکن کا ضرور ذکر کرتا۔ مجھے برگر وغیرہ پسند تو نہیں لیکن میکڈونلڈ کا نام ضرور اہمیت رکھتا تھا۔ اس لیے میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب ہم گھر سے نکلے۔ میں نے سارہ کو گود میں اٹھایا ہوا تھا اور بشرہ نے اس کی کیری کاٹ۔ چھوٹا سا خوبصورت بیگ جس میں بچی کی فیڈ کا سامان اور ایک پھولدار لفافہ جس میں ڈائپر تھے' اٹھایا ہوا تھا۔

"یہ اتنا ساز و سامان ساتھ لے جا رہی ہو۔" میں نے یوشیپ اپارٹمنٹس کے درمیانی گھاس کے قطعے پر چلتے ہوئے کہا۔

"سارہ کے دودھ کا سامان ہے۔"

"تم تو خود اسے فیڈ کرتی ہو۔"

"بازار جاؤں تو دودھ کا ڈبہ' نیم گرم پانی کا تھرموس اور فیڈر وغیرہ ساتھ لے جاتی ہوں۔"

گاڑی اپارٹمنٹس کے پچھلے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ تھوڑا چلنا پڑتا تھا۔ ہم باتیں کرتی ادھر جا رہی تھیں کہ سامنے سے ایک پچیس سالہ گوری آتی دکھائی دی۔ اس نے بشرہ کو ہاتھ ہلا کر ہیلو کہا۔

بشرہ نے بھی جواباً ہیلو کہا۔

"کہاں جا رہی ہو...... اور یہ کون ہیں۔" اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جانے کی بجائے ہماری طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے جینز پر موٹا سویٹر پہن رکھا تھا۔ سر پر اونی ٹوپی اور ہاتھوں پر گرم دستانے چڑھا رکھے تھے۔

بشرہ نے میرا تعارف اس سے کرایا۔ میں نے بھی اسے ہیلو کہا۔ اس نے بھی۔ وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔

''آج آفس نہیں گئیں یا واپس آ گئی ہو۔'' بشرہ نے کہا۔

''آج میں ہوسپٹل گئی تھی۔''

''خیریت۔''

''او۔ بالکل......''

پھر

وہ خوشی سے چہکتی ہوئی امریکن لہجے میں بولی ''بشرہ میں پریگننٹ ہوں۔''

بشرہ ایک لمحہ تو جھجکی پھر بولی ''واقعی۔''

''ہاں میں چیک اپ کے لیے ہی ہوسپٹل گئی تھی۔ میرا یورائن رزلٹ پوزیٹو ہے۔''

وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔

بشرہ نے اس سے دو ایک باتیں کیں پھر بائے کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

میں بھی اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے چل دی۔

بشرہ بولی ''نانی۔ یہی وہ لڑکی ہے جو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہ رہی ہے۔''

''بوائے فرینڈ......اور......اور پریگننٹ......اتنی خوش۔''

''اور کیا۔'' بشرہ ہنسی......''دیکھ لیں۔ یہ خوش اس لیے ہے کہ اب بوائے فرینڈ کو شادی کرنے پر مجبور کر سکے گی......''

''اچھا۔''

''ہاں نانی۔ اس کی مرضی ہوئی تو شادی کرے گا ورنہ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔''

''اور یہ......''

''یہ بچہ پیدا کرے گی۔ اسے پالے گی اور سنگل پیرنٹ کہلائے گی۔''

''یہ بات معیوب نہیں۔''

''یہاں نہیں......ایسی عورتیں اور لڑکیاں یہاں بہت ملیں گی۔ ویسے پچیس چھبیس

سال کے بعد اکثر لڑکیوں کی شادی کے بندھن میں بندھ جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ تحفظ ضرور چاہتی ہیں......''

''ہو جائے تو ہو جائے۔ ورنہ کٹی پتنگ۔''

''کٹی پتنگ کہاں نانی......کسی اور سے دوستی کر لیتی ہیں۔ لڑکی لڑکے کی دوستی یہاں معیوب تھوڑی ہے۔ یہ تو ان لوگوں کے دستور کا حصہ ہے۔ لڑکی بارہ چودہ سال کی ہو جائے اور کسی کو بوائے فرینڈ نہ بنائے تو مائیں انہیں سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جاتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں نارمل نہیں سمجھی جاتیں۔''

''توبہ......''

''ابھی تو آپ بہت کچھ دیکھیں گی یہاں......''

''سب لوگ ایسے ہی ہیں......''

''نہیں نانی......یہاں اچھی فیملیز بھی ہیں۔ امریکہ کی آبادی کا 37% ایسے لوگوں پر مشتمل ہے۔ باقی 63% ایسے ہی بے در بے گھرے لوگ ہیں۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے گاڑی کے پاس آ گئے۔ بشرہ نے گاڑی کھولی، پچھلی سیٹ پر کیری کاٹ رکھ کر سارہ کو اس میں ڈالا اور پھر سیٹ بیلٹ سے کیری باندھ دی۔ سارہ رونے لگی تو اس نے چوسنی اس کے منہ میں ڈال دی۔ بچی کو خوب گرم کپڑوں میں لپیٹا ہوا تھا۔ کیونکہ باہر بے حد سردی تھی۔

بچی کو چپ کرا کے بشرہ ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھی۔ دوسری طرف کا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔ میں بھی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اپنا پرس گود میں رکھ لیا۔

بشرہ سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولی ''نانی سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔''

''کیا ضروری ہے میں بھی بیلٹ باندھوں۔''

''نانی......آپ امریکہ میں ہیں۔ پاکستان میں نہیں۔ سیٹ بیلٹ باندھنا قانوناً ضروری ہے۔''

میں نے کندھے کے اوپر سے بیلٹ لا کر سینے کے اوپر سے لے جاتے ہوئے اس کا ہک لگا دیا۔

"یاد رکھیں جب بھی گاڑی میں بیٹھیں' یہ بیلٹ لگانا ضروری ہوگا۔"

"چلو بھئی ٹھیک ہے۔"

"اس کی خلاف ورزی پر ٹکٹ (جرمانہ) مل جاتا ہے۔"

بشرہ نے گاڑی سٹارٹ کی' پارکنگ لاٹ سے نکالی۔ خاصا بڑا پارکنگ لاٹ تھا لیکن اس وقت دو ایک گاڑیاں ہی یہاں کھڑی تھیں' کیونکہ لوگ اپنے اپنے کام اور اپنی اپنی نوکریوں پر جا چکے تھے۔ وقت کی پابندی یہاں بے حد لازمی ہوتی ہے۔

ہم سڑک پر آ گئے۔ سڑک کے دونوں رویہ سنگل اور ڈبل بیڈروم اپارٹمنٹس بنے ہوئے تھے۔ کوئی چوکور' کوئی ایل شیپ۔ اپارٹمنٹس کے سامنے گھاسی میدان' کناروں پر چلنے کے لیے اینٹوں کی بنی روشیں' ترتیب سے بنے صاف ستھرے اپارٹمنٹس بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ عام مکانوں کی بیرونی دیواریں سرخ تھیں۔ جو سبزے کے ساتھ بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ سڑکیں صاف ستھری جیسے دھلی ہوئی ہوں۔ فضا صاف ستھری کوئی پلوشن نہیں۔ دھول نہ مٹی نہ گاڑیوں کا دھواں اور نہ ہی ہارنوں کی بے ربط آوازیں۔ حالانکہ بیشمار گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

چھوٹی سڑکیں پار کر کے بشرہ ہائی وے پر آ گئی۔ وہ مجھے امریکہ کے مشہور سٹور میسی پر لے جا رہی تھی۔ جو اس کے گھر سے چالیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ ہائی وے پر ٹریفک بڑی ہی ہمواری سے رواں دواں تھی۔ جگہ جگہ سگنل' اشارے' بتیاں' تیر کے نشان اور راستے بتانے کے لیے بڑے بڑے بورڈ آویزاں تھے۔ صفائی نے بے حد متاثر کیا۔

"نانی۔"

"جی۔"

"میسی سے پہلے میں آپ کو ایک اور سٹور پر لے جاتی ہوں۔"

"چلو...... جہاں جی چاہے لے چلو......"

"ون ڈالر ٹری۔"

"کیا مطلب۔"

"یہاں ہر چیز ایک ڈالر کی ملتی ہے۔"

"واقعی۔"

"ہاں...... بعض چیزیں تو بہت اچھی ہوتی ہیں۔ چل کر دیکھ لیں۔"

"دیکھ لیتے ہیں......"

"یہ ایک راؤنڈ شیپ کی مارکیٹ سمجھ لیں۔ بہت سی دکانیں ہیں۔ شاپنگ مال۔"

وہ سڑک سے اتر کر دائیں ہاتھ کے کھلے راستے پر مڑ گئی۔ پھر کئی دکانوں کے سامنے سے ہوتی ہوئی ون ڈالر ٹری کے سامنے رک گئی۔

"میں سارہ کو نکال لوں۔ آپ اسے لے کر برآمدے میں کھڑی ہوں۔ میں سامنے گاڑی پارک کر کے آ جاتی ہوں۔ اس کی بچہ گاڑی بھی نکال لوں۔"

"پرام۔"

"ہاں نانی اسے اٹھا کر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ پرام ہم ڈگی میں رکھتے ہیں۔ اس میں اسے ڈال کر سٹوروں میں گھوم پھر لیتے ہیں۔"

اس نے پرام میں سارہ کو ڈالا۔ برآمدے میں لا کر میرے حوالے کرتے ہوئے بولی' "آپ یہاں ٹھہریں۔ میں گاڑی پارک کر آؤں۔"

میں وہیں ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ لوگ آ جا رہے تھے۔ شاپنگ کے لیے دکانوں کے اندر جا رہے تھے۔ کچھ شاپنگ کے بعد واپس آ رہے تھے۔ بہت زیادہ رش نہیں تھا۔ کیونکہ لوگ کام پر گئے ہوئے تھے۔

یہ گول دائرے میں بنی بہت بڑی مارکیٹ تھی۔ بڑی بڑی شاپس تھیں۔ ان کے آگے چوڑا طویل برآمدہ۔ برآمدے کے باہر گولائی ہی میں سرمئی سڑک سنٹر میں گولائی ہی میں پارکنگ لاٹ۔ جہاں زمین پر سفید رنگ سے لائنیں بنی ہوئی تھیں۔ دو لائنوں کے درمیان گاڑی کھڑی کرنا ہوتی تھی۔ پارکنگ کا نظام بہت عمدہ تھا۔ بے ترتیبی سے کوئی گاڑی

کھڑی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر کوئی سفید لائنوں کے درمیان چھوڑی جگہ پر گاڑی پارک کرنے کا پابند تھا۔ یہ پارکنگ اس طرح تھی کہ چاہے سارا لاٹ پارکنگ سے بھرا ہو۔ لیکن کیا مجال گاڑی نکالنے والے کو کوئی دقت پیش آئے۔ گاڑی لانے اور نکالنے کے پورے راستے بنے تھے۔ سڑک کے قریب سٹوروں کے سامنے معذوروں کی گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ وہاں صرف معذور لوگ جن کے پاس باقاعدہ سرٹیفکیٹ ہو گاڑی کھڑی کر سکتے ہیں۔ اس سے ایسے لوگوں کو سہولت بھی ہوتی ہے۔ سٹور سے سامان خریدا اور سامنے ہی سڑک کے ساتھ کھڑی گاڑی میں رکھ دیا۔ ایسے افراد کے لیے گاڑیاں بھی آٹومیٹک ہوتی ہیں۔

یہ جگہ چونکہ معذور افراد کی گاڑیوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے' اس لیے یہ خالی بھی ہو تب بھی وہاں عام آدمی گاڑی کھڑی نہیں کرتا۔

میں برآمدے میں کھڑی کار پارکنگ لاٹ کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ ہمارے ملک میں ایسی بات کیوں نہیں ہوتی۔ گاڑیاں جہاں بھی کھڑی کی جاتی ہیں...... بے ترتیبی سے کوئی آگے کھڑی کر دیتا ہے کوئی پیچھے۔ بعض اوقات تو اس بے ڈھنگے انداز میں گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں کہ بوقت ضرورت گاڑی نکالنا مشکل ہو جاتی ہے۔ پیچھے گاڑی آگے گاڑی اور آپ درمیان میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگلی پچھلی گاڑیوں والے مزے سے دکانوں میں گھسے شاپنگ کر رہے ہوتے ہیں۔ انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کی وجہ سے کسی دوسرے کو کتنی پریشانی اور کوفت ہو رہی ہے۔

اور

یہاں کیا نظام تھا۔ نہ کسی کو تکلیف نہ پریشانی۔ گاڑی کھڑی کی' کام کیا' شاپنگ کی اور مزے سے گاڑی نکال کر لے گئے۔ لطف کی بات یہ کہ ہمارے ہاں کے لوگ بھی یہاں قانون کی پوری پاسداری کرتے ہیں۔ وہ لوگ...... جو پاکستان میں ٹریفک کے کسی قانون کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ یہاں بلا چون و چرا وہی کرتے ہیں جو قانون کہتا ہے۔

گاڑی سیٹ بیلٹ باندھے بغیر نہیں چلاتے۔

سپیڈ کی جتنی حد مقرر ہو' اسی پر چلتے ہیں۔

اشاروں پر رکتے ہیں۔ چاہے ارد گرد کوئی بھی دیکھنے والا نہ ہو۔

گاڑی پارکنگ لاٹ میں اسی طرح کھڑی کرتے ہیں جیسے آرڈر ہو...... سفید لائن پر گاڑی کا پہیہ نہیں آتا۔ دو لائنوں کے درمیان خالی جگہ پر گاڑی روکتے ہیں۔

معذوروں کے لیے چھوڑی ہوئی پارکنگ کی جگہ پر رش ہونے کے باوجود گاڑی کھڑی نہیں کرتے۔ یہ جگہ خالی ہے تو خالی پڑی رہنے دیتے ہیں۔

ایک ہی لین میں جا رہے ہوں تو گاڑی اوورٹیک نہیں کرتے۔

گاڑی چلاتے ہوئے سگریٹ پینا ممنوع ہے۔ اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

شراب پی کر کوئی بھی گاڑی نہیں چلا سکتا۔

مجھے سوچ سوچ کر دکھ ہو رہا تھا کہ یہ کتنی معمولی معمولی باتیں ہیں۔ ان پر عملدرآمد مشکل کام بھی نہیں۔ پھر بھی ہمارے ہاں لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ اصولوں کو توڑنا' قانون شکنی کرنا ہمارا شیوہ کیوں بن گیا ہے۔ بہ حیثیت قوم یہ کتنی معیوب بات ہے۔ آخر یہاں بھی تو یہ لوگ ہیں۔ کس قدر صاف و شفاف نظام چلا رہے ہیں۔

میں نے وہیں کھڑے کھڑے طویل گولائی میں بنے برآمدے پر نظر دوڑائی۔ صاف ستھرا برآمدہ...... کہیں کوئی کاغذ کا ٹکڑا تک نظر نہ آیا۔ کہیں پاؤں سے مسلی ہوئی سگریٹ نہ دکھائی دی۔ کوئی چھلکا' کوئی چھلکا' کوئی لفافہ' کسی چاکلیٹ کی ریپنگ کچھ بھی نہ تھا۔ جگہ جگہ برآمدوں میں سرسبز گملے تھے۔ صاف شفاف بیٹھنے کے لیے بنچ تھے اور جگہ جگہ کوڑا دان تھے' جن پر ڈھکن لگے تھے۔ سرمئی گول سڑک حد نگاہ تک صاف ستھری تھی۔ پارکنگ لاٹ بھی صاف تھا۔ کہیں پھٹی اخباروں کے ٹکڑے نہ تھے۔ کوئی مومی لفافہ ہوا سے ادھر اُدھر اڑ نہ رہا تھا۔ کوئی کوک کا ٹن نہ لڑھک رہا تھا۔ کوئی جوس کا خالی ڈبہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

صفائی اور قانون کے احترام نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

"بشرہ آ گئی۔

اور

ہم سٹوروں کے اندر گھومنے پھرنے لگے۔ ''وَن ڈالرٹری'' نامی سٹور میں ہر چیز ایک ڈالر کی تھی۔ گو یہاں قیمتی چیزیں نہ تھیں۔ عام ضرورت کی چیزیں تھیں۔ پھر بھی اتنا کچھ تھا کہ پورے سٹور کو دیکھنے میں کافی وقت لگ گیا۔ کٹلری برتن' برش' کوسمیٹکس' کاپیاں پنسلیں' کتوں کے برش' ان کے گلے میں باندھنے والے پٹے' بلیوں کی ضرورت کی چیزیں' پرندوں کے پنجرے غرضیکہ انسانوں اور ان چھوٹے موٹے جانوروں' پرندوں کی ہر چیز تھی۔ مصنوعی خوبصورت رنگارنگ پھول' خوبصورت ہینٹ کی شیشیاں' ڈیکوریشن کی چیزیں' چاکلیٹس' ٹافیاں بے شمار چیزیں تھیں' سب چیزیں اونچے اونچے سٹینڈوں میں بنے خانوں پر لائنوں میں لگی تھیں۔ اور بھی کچھ لوگ تھے جو چیزیں پسند کر رہے تھے۔ میں بار بار ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی وہ جو چیز بھی اٹھاتے دیکھتے' خریدنا نہ ہوتی تو واپس اسی جگہ اسی ترتیب سے رکھ دیتے۔ مجھے اپنے یہاں کی دکانیں یاد آ گئیں۔ جہاں اکثر گاہک چیزیں تو دیکھنے کے لیے نکال لیتے ہیں لیکن واپس رکھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ دکان یا شوروم کے ملازموں کو چیزیں بار بار ٹھیک کر کے رکھنا پڑتی ہیں۔ اللہ' کتنا نمایاں فرق تھا ہم میں اور ان لوگوں میں۔

صاف ستھری شاپ' صاف ستھری ترتیب سے پڑی چیزیں جوں کی توں چھوڑ کر ہم دونوں باہر نکلیں...... برابر میں آرٹیفیشل پھولوں کی دکان تھی جو بالکل قدرتی لگتے تھے۔ یہاں بھی وہی صفائی' وہی ترتیب...... کوئی چیز الٹ پلٹ نہ تھی۔

اسی طرح ہم نے چند اور دکانیں بھی دیکھیں۔ کپڑوں کی' بچوں کی چیزوں کی' کتابوں کی' سوئی سلائی کی چیزوں کی' کھلے کپڑے کے تھانوں کی...... سب جگہ ایک ہی فارمولا' صفائی اور ترتیب۔

گولائی میں بے شمار دکانیں تھیں۔

''نانی یہاں چھوٹی موٹی چیزیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ بڑے سٹوروں پر جانا نہیں پڑتا۔ یہ مارکیٹ ہمارے ہاں کے بازار کی طرح ہے۔ ضرورت کی ہر چیز دستیاب۔''

''ہمارے بازار اور اس میں بڑا نمایاں فرق ہے بشرہ۔ میں تو اسی سے مرعوب و متاثر ہوں۔''

''یعنی۔''

''صفائی اور ترتیب......''

''یہ تو ہے'' بشرہ نے مسکرا کر کہا۔ ''ہر آدمی کو پتہ ہے کہ دکان کی ترتیب کو کسی طور خراب نہیں کرنا...... اگر کوئی غلطی سے اِدھر کی چیز اُدھر رکھ دے تو فوراً سیل گرل آ کے اسے اسی جگہ پر رکھ دیتی ہے۔''

''شاپس میں زیادہ تر لڑکیاں ہی کام کرتی نظر آتی ہیں۔''

''ہاں شاپس ہوں یا بڑے بڑے سٹور زیادہ عورتیں ہی ان جگہوں پہ کام کرتی ہیں۔ مرد بھی ہوتے ہیں لیکن زیادہ عورتیں ہوتی ہیں......''

وہاں سے ہم واپس آ گئے۔ اب بشرہ مجھے کہیں اور لے جا رہی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ چھوٹی سڑکوں پر کچھ موٹی موٹی کالی عورتیں' کچھ گوریاں' ایسے ہی ملے جلے مرد' عورتیں پیدل بھی آ جا رہے تھے۔

ہم ''پے لیس شوز'' دیکھنے گئے۔ یہ بہت بڑی دکان نہیں تھی۔ چاروں طرف شیشے لگے تھے اور تین چار لائنوں میں اونچے ریکس کے خانوں میں زنانہ' مردانہ جوتے پڑے تھے...... ایک قدرے فربہ سی گوری عورت یہ دکان چلا رہی تھی۔ یہاں دس ڈالر اور اس سے کم میں اچھی آرام دہ جوتیاں مل جاتی تھیں۔ بڑے بڑے امیر لوگوں کے لیے تو یہ سٹور نہیں تھا۔ ہاں متوسط طبقے کے لوگ یہاں سے کورٹ شوز' جاگرز اور چپل وغیرہ خریدتے تھے۔ یہ ایک چین سٹور ہے جو تقریباً ہر شہر میں ہے۔

''نانی کوئی جوتا خرید لیں۔ سستے ہیں۔''

اس کے کہنے پر میں نے کالے شوز دس ڈالر میں خریدے جو بہت آرام دہ تھے۔

وقت کافی ہو گیا تھا۔

''پہلے کچھ کھا نہ لیں۔'' بشرہ نے کہا۔

"بھوک لگ گئی۔"

"کچھ خاص تو نہیں۔ البتہ آپ کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔"

میں چونکہ شوگر کی مریضہ تھی۔ اس لیے کھانا وقت پر کھانا پڑتا تھا۔ ذرا دیر ہوئی تو کلیجہ بیٹھنے لگتا۔ شوگر کم ہو جانا بھی تو اچھی بات نہیں ہوتی. اس لیے میں نے بھی کہا "ٹھیک ہے کچھ کھا لیتے ہیں......"

"میکڈونلڈ کے برگر کھائیں گی۔"

"کھلا دو......"

وہ گاڑی سڑک پر دوڑانے لگی۔ راستے میں ڈونٹ کی بیکری آئی۔ بشرہ نے پوچھا "نانی یہاں کے ڈونٹ بڑے مشہور ہیں۔ کھائیں گی......؟"

"بھئی میں نے زیادہ کچھ تو کھانا نہیں۔ جانتی ہو...... میں اندازاً کیلوریز کے حساب سے کھاتی ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے نانی۔ آپ کی پرہیز اور وقت پر کھانے کی عادت بہت اچھی ہے۔ اسی لیے تو ماشاءاللہ ذیابیطک ہونے کے باوجود اتنی اچھی صحت ہے۔"

"نظر نہ لگا دینا......"

"میں نے اسی لیے ماشاءاللہ کہا ہے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے رکے۔ یہ میکڈونلڈ تھا۔ صاف ستھرا جیسے دھلا دھلایا ہو...... بیس پچیس سیٹوں والا ریسٹورنٹ۔ ہم ایک میز پر بیٹھ گئے۔ سارہ اٹھ گئی تھی۔ اس کا فیڈر بشرہ نے مجھے دیتے ہوئے سارہ کو میری گود میں ڈال دیا۔ "اسے دودھ پلا دیں۔ میں برگر لے آؤں۔"

وہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف گئی۔ جہاں آرڈر لینے اور منٹوں میں سپلائی کرنے والی دو گوری جوان خوبصورت لڑکیاں کھڑی گاہکوں کا مسکرا مسکرا کر استقبال کر رہی تھیں۔ ریسٹورنٹ میں آٹھ دس ہی لوگ بیٹھے برگر کھا رہے تھے۔ دو ایک برگر اور کوک لیے باہر جا رہے تھے۔

بشرہ ٹرے میں کاغذ میں لپٹے دو برگرز دو کوک کے ٹن اور فرنچ فرائیز کے دو پیکٹ رکھے آ گئی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور بولی "سارہ کو مجھے دے دیں۔ آپ کھانا کھائیں۔ میں آپ کے لیے ڈائیٹ کوک لائی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سارہ کو دودھ پلا دوں پھر کھاتی ہوں۔ تم شروع کرو۔"

سارہ نے فیڈ ختم کی تو بشرہ نے اسے کیری کاٹ میں ڈال دیا۔

ٹرے میرے سامنے کرتے ہوئے بولی "شروع کریں۔"

"پیشتر اس کے کہ سارہ چیخ اٹھے۔ تم برگر کھا لو......"

سارہ روتی بہت تھی۔ شاید پیٹ میں ہوا بھر جاتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ چپ تھی۔

بشرہ نے اپنا برگر اٹھایا۔

میں نے بھی۔

لیکن کھانے سے پہلے بشرہ ہنس کر بولی "نانی برگر پر کلمہ پڑھ کر پھونک مار لیں۔"

"کیوں" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"چکن برگر ہے......"

"تو......"

"یہ لوگ چکن حلال تھوڑا ہی کرتے ہیں۔"

"ہائے" میں نے برگر جلدی سے ٹرے میں رکھ دیا۔

بشرہ بے اختیار ہنس کر بولی "یہاں بیف برگر لیں یا چکن برگر۔ نہ بیف ذبیحہ ہوتا ہے نہ چکن......"

"تو تم لوگ کھاتے کیوں ہو؟"

"کیا کریں۔ بس یہی کر لیتے ہیں کہ کلمہ پڑھ کر پھونک ماری اور کھا لیا۔"

"میں تو نہیں کھاؤں گی......"

وہ اصرار کرنے لگی۔ ہنستی بھی جاتی اور کھانے کو کہے بھی جاتی۔ میرے کھانے کا وقت بھی ہو رہا تھا۔

میں کافی دیر انکار کرتی رہی پھر میں نے برگر میں رکھا چکن کا کباب نکال کر ٹرے میں رکھ دیا اور بن میں رکھے سلاد مینیز اور چیز کو ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے بن کھانے لگی۔

"نانی آپ نے تو پیسے ضائع کر دیے۔"

"تم کھالو کباب۔"

"کب تک ایسا کریں گی۔ آپ نے تو کافی دیر یہاں رہنا ہے۔"

میں کوک اور بن کھاتی رہی۔

وہاں سے باہر نکلے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ صاف ستھرے لباس...... بال آراستہ ہنستے مسکراتے چہرے کالے گورے چینی جاپانی دیگر ایشیائی سب ایک جیسے ہی تھے۔ یہاں کوئی چیتھڑے اور پیوند لگا لباس میں نظر نہیں آیا۔ کسی کے بال دھول مٹی میں اٹے اور بکھرے نہ تھے۔ چہروں پر بے سکونی اور ٹینشن کی کوئی علامت نہ تھی۔ راہ چلتے ایک دوسرے کو خندہ پیشانی سے ہیلو کہتے۔ زندگی سے بیزاری کسی چہرے پر نظر نہ آتی تھی۔ مجھے اپنے ہاں کے لوگ یاد آ رہے تھے۔ گلیوں بازاروں میں پھرتے لوگ...... چہرے پر مشقت کی چھاپ بے روزگاری کی پریشانی صعوبتوں کے آثار۔ اکثر لوگ سوائے چند فیصد کو چھوڑ کر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں جب بھی بازار نکلتی ہوں تو سڑکوں پر فٹ پاتھوں پر پیدل چلنے والے میلے لباسوں والے اجڑے چہرے اور بکھرے بالوں والے لوگوں کو غور سے دیکھتی ہوں۔ ان کے چہرے ان کے حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ مجھے کبھی کسی چہرے پر دوسرے انجان کو دیکھ کر مسکراہٹ کی رمق دکھائی نہیں دی۔ شاید یہ ہمارا مزاج ہماری زندگیوں میں گھلی تلخیوں کی وجہ سے بن گیا ہے۔ میں نے تو خوشحال لوگوں کو بھی کسی اجنبی سے مسکراتے ہوئے علیک سلیک کرتے نہیں دیکھا۔ یہاں صرف انہی لوگوں سے علیک سلیک کی جاتی ہے جن سے جان پہچان ہو۔ مسکرایا بھی اسے ہی دیکھ کر جاتا ہے جسے آپ پہچانتے ہوں۔

لیکن یہاں کے لوگوں کے مزاج میں یہ چیز شامل ہے شاید۔ ون ڈالر ٹری میں

جب میں سارہ کی پرام لیے آہستہ آہستہ چل رہی تھی تو کئی عورتوں نے جھک کر سارہ کو دیکھا۔ مجھے مسکرا کر ہیلو کیا۔

خیر

اب میکڈونلڈ سے نکل کر ہم گاڑی میں آ بیٹھیں۔ سارہ پچھلی سیٹ پر باندھ دی گئی اور ہم دونوں نے بیلٹ لگالی۔

اب

بشرہ مجھے یہاں کے مشہور ترین سٹور میسی دکھانے لے جا رہی تھی۔ یہ سٹور کافی دور تھا۔ تقریباً پچیس منٹ کی ڈرائیو تھی۔ بشرہ سائیڈ لین سے نکل کر مین روڈ پر آ گئی۔ ادھر سے ہائی وے پر جانا تھا۔

ہائی وے پر کسی پیدل چلنے والے کو جانے کی اجازت نہیں۔ نہ ہی کوئی نظر بچا کر سڑک کراس کر سکتا ہے۔ یہاں گاڑیاں مخصوص تیز رفتاری سے جا آ رہی ہوتی ہیں۔ جانے والے اپنی لین میں آنے والے اپنی میں۔ گو یہاں کسی ٹریفک حادثے کا امکان تو نہیں ہوتا لیکن جب حادثہ ہو تو بہت بڑا ہوتا ہے۔ اگر اگلی گاڑی کسی وجہ سے رک گئی ہے یا ٹائر پھٹ گیا ہے تو پیچھے سے تیز رفتاری سے آنے والی دس پندرہ گاڑیاں تو ضرور ایک دوسرے سے ٹکرا کر حادثے کا سبب بنیں گی۔ کبھی کبھار ایسے حادثے ہائی وے پر ہو ہی جاتے ہیں اور گاڑیوں کی توڑ پھوڑ کے ساتھ انسانی جانیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

لیکن ایسا کبھی کبھار بلکہ سالہا سال میں ایک آدھ دفعہ ہی ہوتا ہے۔

بشرہ نے گاڑی میسی کے سامنے لا کر کھڑی کر کے مجھے سڑک پر سٹور کے سامنے والے برآمدے کے قریب جہاں سٹور کا داخلی دروازہ تھا اتارا۔ سارہ کو اس کے ساز و سامان کے ساتھ مجھے پکڑایا اور خود گاڑی پارک کرنے چل دی۔

میسی کے سامنے بے انتہا بڑا پارکنگ لاٹ تھا۔ کم از کم پانچ سات سو گاڑیوں کے پارک کرنے کی جگہ تھی۔ میسی کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا سٹور سٹرن تھا۔ دوسری طرف بھی لارڈ اینڈ ٹیلرز تھا۔ اس لیے یہاں تینوں سٹوروں کے لیے پارکنگ تھی۔ وہی سفید لائینیں ڈی

گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے ایک جیسا فاصلہ وہاں بھی سفید لائنیں...... سٹور کے عین سامنے معذوروں کی گاڑیاں پارک کرنے کے لیے چھوڑی ہوئی جگہ۔ اس جگہ سفید روغن ہی سے معذور بندے کا خاکہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ تاکہ ہر ایک کو پتہ چل سکے کہ یہاں صرف وہی لوگ گاڑی پارک کر سکتے ہیں جن کے پاس معذور ہونے کا سرٹیفکیٹ یا کارڈ ہوتا ہے۔

چونکہ یہ پارکنگ لاٹ بے انتہا بڑا تھا۔ اس لیے لاٹ نمبر ان پلیٹوں پر لکھ کر پولز پر لگائے ہوئے تھے۔ یہ پارکنگ لاٹ پانچ نمبر کی پلیٹوں پر محیط تھا۔ اس طرح سے گاڑی نکالنے میں آسانی ہوتی ہے ورنہ سینکڑوں گاڑیوں میں اپنی گاڑی ڈھونڈنا مشکل ہو جائے۔ بس جس لاٹ میں گاڑی کھڑی ہو وہ نمبر یاد رکھیں اور شاپنگ کے بعد آسانی سے گاڑی نکال لے جائیں۔ کسی کو ذرہ بھر تکلیف یا تشویش نہیں ہوتی۔

کئی دفعہ پارکنگ لاٹ بھر جاتا ہے۔ گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ اس حال میں لوگ واپس لوٹ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر گھوم پھر کر پھر آ جاتے ہیں۔ اس وقت تک کوئی نہ کوئی تو شاپنگ کر کے جا چکا ہوتا ہے اور گاڑی کے پارک کرنے کے لیے جگہ مل جاتی ہے۔

میں آج دن کی روشنی میں پہلی بار امریکی سرزمین کو دیکھ رہی تھی۔ اس رات ایئرپورٹ سے آتے ہوئے نیویارک سے نیوجرسی تک روشنیوں کی دیوالی ہی دیکھی تھی۔ بشرہ آئی تو ہم میسی کے اندر داخل ہوئے۔ اتنا بڑا اسٹور جو ایکڑوں پر محیط تھا۔ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہاں کیا کچھ نہیں تھا۔ مختلف حصوں میں مختلف چیزیں بڑے سلیقے سے رکھی اور سجائی ہوئی تھیں۔ ایک ایک حصہ ہمارے ہاں کے بڑے سے بڑے سٹور سے بڑا تھا۔ کہیں کراکری تھی، قیمتی کرسٹل کے برتن، ڈیکوریشن کی جگمگاتی چیزیں، چمکتی دمکتی کٹلری۔

کوئی حصہ زنانہ لباسوں کے لیے مختص تھا۔ کہیں مردانہ قمیصیں اور سوٹ تھے۔ کسی بہت بڑے حصے میں سویٹر اور دیگر اونی چیزیں تھیں۔ کہیں بچوں کے پہناوے تھے۔ کوئی کھلونوں کا حصہ تھا۔ کہیں عورتوں کے انڈر گارمنٹس تھے تو کہیں ہر قسم کے جوتے ریکوں پر سجے تھے۔ اور بھی بے شمار چیزیں تھیں۔

یہ نچلا حصہ تھا۔ اوپر بھی اتنا ہی طویل و عریض علاقہ تھا۔ ایسکلیٹرز سے لوگ اوپر جا رہے تھے نیچے آ رہے تھے۔ ایک طرف لفٹ بھی استعمال ہو رہی تھی۔ سیڑھیاں بھی تھیں۔

لوگ شاپنگ میں مصروف تھے۔ کاؤنٹرز پر لیڈیز کھڑی تھیں۔ کمپیوٹر سے قیمتیں لگائی جا رہی تھیں...... اس وقت خریداری کا زور تھا۔ لیکن کیا مجال کہ کہیں کوئی بدنظمی ہو۔ بے شمار لوگ چیزیں دیکھ رہے ہیں۔ منتخب کر رہے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر واپس رکھ رہے ہیں۔ کاؤنٹروں کی طرف جا رہے ہیں۔ سامان خرید کر باہر نکل رہے ہیں' نئے خریدار اندر آ رہے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو شور شرابہ ہو یا دھکم پیل ہو۔ کاؤنٹروں پر اگر رش ہے تو لوگ اپنی اپنی چیزیں اٹھائے آپوں آپ قطار میں لگ رہے ہیں۔ باری آنے پر چیز سیل گرل کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ بل بنتا ہے' ادا کرتے ہیں اور اپنی راہ لیتے ہیں۔

یہاں چوری پکڑنے کا بھی غضب کا سسٹم ہے۔ کوئی بندہ ادائیگی کے بغیر سٹور سے باہر نہیں جا سکتا۔ جا بجا ٹی وی کیمرے نصب ہیں۔ الارم سسٹم ہے۔ اگر کوئی چوری کی چیز لے کر باہر نکلے تو بیرونی دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے ایک دم ہی سٹور کی سب بتیاں روشن ہو جاتی ہیں اور الارم بج اٹھتے ہیں۔

پھر بھی

یہاں جتنا سامان' جتنی چیزیں ہوتی ہیں شاید چوری ہو ہی جاتی ہو۔ لیکن اس کا امکان نہیں ہوتا۔ عام لوگ ایماندار' کھرے' اصولوں کے پابند اور قانون کا احترام کرنے والے ہیں۔

یہاں بھی برے لوگ ہیں۔ چوریاں' ڈکیتیاں اور خلاف قانون باتیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان کا اطلاق عام شہریوں پر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ مہذب لوگوں میں شامل نہیں ہوتے۔ عوام کی اکثریت اچھے لوگوں کی ہے۔ جرائم پیشہ زیادہ تر کالے لوگ ہیں جو امریکہ کے انتہائی پس ماندہ علاقوں میں رہتے ہیں۔ جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے اپنے لیے کھانا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انتہائی گندے علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان علاقوں میں

گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے ایک جیسا فاصلہ وہاں بھی سفید لائنیں...... سٹور کے عین سامنے معذوروں کی گاڑیاں پارک کرنے کے لیے چھوڑی ہوئی جگہ۔ اس جگہ سفید روغن ہی سے معذور بندے کا خاکہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ تاکہ ہر ایک کو پتہ چل سکے کہ یہاں صرف وہی لوگ گاڑی پارک کر سکتے ہیں جن کے پاس معذور ہونے کا سرٹیفکیٹ یا کارڈ ہوتا ہے۔

چونکہ یہ پارکنگ لاٹ بے انتہا بڑا تھا۔ اس لیے لاٹ نمبر ٹن پلیٹوں پر لکھ کر پولز پر لگائے ہوئے تھے۔ یہ پارکنگ لاٹ پانچ نمبر کی پلیٹوں پر محیط تھا۔ اس طرح سے گاڑی نکالنے میں آسانی ہوتی ہے ورنہ سینکڑوں گاڑیوں میں اپنی گاڑی ڈھونڈنا مشکل ہو جائے۔ بس جس لاٹ میں گاڑی کھڑی ہو وہ نمبر یاد رکھیں اور شاپنگ کے بعد آسانی سے گاڑی نکال لے جائیں۔ کسی کو ذرہ بھر تکلیف یا تشویش نہیں ہوتی۔

کئی دفعہ پارکنگ لاٹ بھر جاتا ہے۔ گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ اس حال میں لوگ واپس لوٹ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر گھوم پھر کر پھر آ جاتے ہیں۔ اس وقت تک کوئی نہ کوئی تو شاپنگ کر کے جا چکا ہوتا ہے اور گاڑی کے پارک کرنے کے لیے جگہ مل جاتی ہے۔

میں آج دن کی روشنی میں پہلی بار امریکی سرزمین کو دیکھ رہی تھی۔ اس رات ایئرپورٹ سے آتے ہوئے نیویارک سے نیوجرسی تک روشنیوں کی دیوالی ہی دیکھی تھی۔ بشرہ آئی تو ہم میسی کے اندر داخل ہوئے۔ اتنا بڑا اسٹور جو ایکڑوں پر محیط تھا۔ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہاں کیا کچھ نہیں تھا۔ مختلف حصوں میں مختلف چیزیں بڑے سلیقے سے رکھی اور سجائی ہوئی تھیں۔ ایک ایک حصہ ہمارے ہاں کے بڑے سے بڑے سٹور سے بڑا تھا۔ کہیں کراکری تھی، قیمتی کرسٹل کے برتن، ڈیکوریشن کی جگمگاتی چیزیں، چمکتی دمکتی کٹلری۔

کوئی حصہ زنانہ لباسوں کے لیے مختص تھا۔ کہیں مردانہ قمیضیں اور سوٹ تھے۔ کسی بہت بڑے حصے میں سویٹر اور دیگر اونی چیزیں تھیں۔ کہیں بچوں کے پہناوے تھے۔ کوئی کھلونوں کا حصہ تھا۔ کہیں عورتوں کے انڈر گارمنٹس تھے تو کہیں ہر قسم کے جوتے ریکوں پر سجے تھے۔ اور بھی بے شمار چیزیں تھیں۔

یہ نچلا حصہ تھا۔ اوپر بھی اتنا ہی طویل و عریض علاقہ تھا۔ ایسکلیٹرز سے لوگ اوپر جا رہے تھے نیچے آ رہے تھے۔ ایک طرف لفٹ بھی استعمال ہو رہی تھی۔ سیڑھیاں بھی تھیں۔

لوگ شاپنگ میں مصروف تھے۔ کاؤنٹرز پر لیڈیز کھڑی تھیں۔ کمپیوٹر سے قیمتیں لگائی جا رہی تھیں...... اس وقت خریداری کا زور تھا۔ لیکن کیا مجال کہ کہیں کوئی بدنظمی ہو۔ بے شمار لوگ چیزیں دیکھ رہے ہیں۔ منتخب کر رہے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر واپس رکھ رہے ہیں۔ کاؤنٹروں کی طرف جا رہے ہیں۔ سامان خرید کر باہر نکل رہے ہیں' نئے خریدار اندر آ رہے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو شور شرابہ ہو یا دھکم پیل ہو۔ کاؤنٹروں پر اگر رش ہے تو لوگ اپنی اپنی چیزیں اٹھائے آپوں آپ قطار میں لگ رہے ہیں۔ باری آنے پر چیز سیل گرل کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ بل بنتا ہے' ادا کرتے ہیں اور اپنی راہ لیتے ہیں۔

یہاں چوری پکڑنے کا بھی غضب کا سسٹم ہے۔ کوئی بندہ پیمنٹ کیے بغیر سٹور سے باہر نہیں جا سکتا۔ جا بجا ٹی وی کیمرے نصب ہیں۔ الارم سسٹم ہے۔ اگر کوئی چوری کی چیز لے کر باہر نکلے تو بیرونی دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے ایک دم ہی سٹور کی سب بتیاں روشن ہو جاتی ہیں اور الارم بج اٹھتے ہیں۔

پھر بھی

یہاں جتنا سامان' جتنی چیزیں ہوتی ہیں شاید چوری ہو ہی جاتی ہو۔ لیکن اس کا امکان نہیں ہوتا۔ عام لوگ ایماندار' کھرے' اصولوں کے پابند اور قانون کا احترام کرنے والے ہیں۔

یہاں بھی برے لوگ ہیں۔ چوریاں' ڈکیتیاں اور خلاف قانون باتیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان کا اطلاق عام شہریوں پر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ مہذب لوگوں میں شامل نہیں ہوتے۔ عوام کی اکثریت اچھے لوگوں کی ہے۔ جرائم پیشہ زیادہ تر کالے لوگ ہیں جو امریکہ کے انتہائی پس ماندہ علاقوں میں رہتے ہیں۔ جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے اپنے لیے کھانا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انتہائی گندے علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان علاقوں میں

گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے ایک جیسا فاصلہ وہاں بھی سفید لائنیں...... سٹور کے عین سامنے معذوروں کی گاڑیاں پارک کرنے کے لیے چھوڑی ہوئی جگہ۔ اس جگہ سفید روغن ہی سے معذور بندے کا خاکہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ تاکہ ہر ایک کو پتہ چل سکے کہ یہاں صرف وہی لوگ گاڑی پارک کر سکتے ہیں جن کے پاس معذور ہونے کا سرٹیفکیٹ یا کارڈ ہوتا ہے۔

چونکہ یہ پارکنگ لاٹ بے انتہا بڑا تھا۔ اس لیے لاٹ نمبر ٹن پلیٹوں پر لکھ کر پولز پر لگائے ہوئے تھے۔ یہ پارکنگ لاٹ پانچ نمبر کی پلیٹوں پر محیط تھا۔ اس طرح سے گاڑی نکالنے میں آسانی ہوتی ہے ورنہ سینکڑوں گاڑیوں میں اپنی گاڑی ڈھونڈنا مشکل ہو جائے۔ بس جس لاٹ میں گاڑی کھڑی ہو وہ نمبر یاد رکھیں اور شاپنگ کے بعد آسانی سے گاڑی نکال لے جائیں۔ کسی کو ذرہ بھر تکلیف یا تشویش نہیں ہوتی۔

کئی دفعہ پارکنگ لاٹ بھر جاتا ہے۔ گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ اس حال میں لوگ واپس لوٹ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر گھوم پھر کر پھر آ جاتے ہیں۔ اس وقت تک کوئی نہ کوئی تو شاپنگ کر کے جا چکا ہوتا ہے اور گاڑی کے پارک کرنے کے لیے جگہ مل جاتی ہے۔

میں آج دن کی روشنی میں پہلی بار امریکی سرزمین کو دیکھ رہی تھی۔ اس رات ایئرپورٹ سے آتے ہوئے نیویارک سے نیوجرسی تک روشنیوں کی دیوالی ہی دیکھی تھی۔ بشرہ آئی تو ہم میسی کے اندر داخل ہوئے۔ اتنا بڑا سٹور جو ایکڑوں پر محیط تھا۔ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہاں کیا کچھ نہیں تھا۔ مختلف حصوں میں مختلف چیزیں بڑے سلیقے سے رکھی اور سجائی ہوئی تھیں۔ ایک ایک حصہ ہمارے ہاں کے بڑے سے بڑے سٹور سے بڑا تھا۔ کہیں کراکری تھی قیمتی کرسٹل کے برتن ڈیکوریشن کی جگمگاتی چیزیں چمکتی دمکتی کٹلری۔

کوئی حصہ زنانہ لباسوں کے لیے مختص تھا۔ کہیں مردانہ قمیصیں اور سوٹ تھے۔ کسی بہت بڑے حصے میں سویٹر اور دیگر اونی چیزیں تھیں۔ کہیں بچوں کے پہناوے تھے۔ کوئی کھلونوں کا حصہ تھا۔ کہیں عورتوں کے انڈر گارمنٹس تھے تو کہیں ہر قسم کے جوتے ریکوں پر سجے تھے۔ اور بھی بے شمار چیزیں تھیں۔

یہ نچلا حصہ تھا۔ اوپر بھی اتنا ہی طویل و عریض علاقہ تھا۔ ایسکے لیٹرز سے لوگ اوپر جا رہے تھے نیچے آ رہے تھے۔ ایک طرف لفٹ بھی استعمال ہو رہی تھی۔ سیڑھیاں بھی تھیں۔

لوگ شاپنگ میں مصروف تھے۔ کاؤنٹرز پر لیڈیز کھڑی تھیں۔ کمپیوٹر سے قیمتیں لگائی جا رہی تھیں...... اس وقت خریداری کا زور تھا۔ لیکن کیا مجال کہ کہیں کوئی بدنظمی ہو۔ بے شمار لوگ چیزیں دیکھ رہے ہیں۔ منتخب کر رہے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر واپس رکھ رہے ہیں۔ کاؤنٹروں کی طرف جا رہے ہیں۔ سامان خرید کر باہر نکل رہے ہیں' نئے خریدار اندر آ رہے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو شور شرابہ ہو یا دھکم پیل ہو۔ کاؤنٹروں پر اگر رش ہے تو لوگ اپنی اپنی چیزیں اٹھائے آپوں آپ قطار میں لگ رہے ہیں۔ باری آنے پر چیز سیل گرل کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ بل بنتا ہے' ادا کرتے ہیں اور اپنی راہ لیتے ہیں۔

یہاں چوری پکڑنے کا بھی غضب کا سسٹم ہے۔ کوئی بندہ ادائیگی کیے بغیر سٹور سے باہر نہیں جا سکتا۔ جا بجا ٹی وی کیمرے نصب ہیں۔ الارم سسٹم ہے۔ اگر کوئی چوری کی چیز لے کر باہر نکلے تو بیرونی دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے ایک دم ہی سٹور کی سب بتیاں روشن ہو جاتی ہیں اور الارم بج اٹھتے ہیں۔

پھر بھی

یہاں جتنا سامان' جتنی چیزیں ہوتی ہیں شاید چوری ہو ہی جاتی ہو۔ لیکن اس کا امکان نہیں ہوتا۔ عام لوگ ایماندار' کھرے' اصولوں کے پابند اور قانون کا احترام کرنے والے ہیں۔

یہاں بھی برے لوگ ہیں۔ چوریاں' ڈکیتیاں اور خلاف قانون باتیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان کا اطلاق عام شہریوں پر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ مہذب لوگوں میں شامل نہیں ہوتے۔ عوام کی اکثریت اچھے لوگوں کی ہے۔ جرائم پیشہ زیادہ تر کالے لوگ ہیں جو امریکہ کے انتہائی پس ماندہ علاقوں میں رہتے ہیں۔ جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے اپنے لیے کھانا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انتہائی گندے علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان علاقوں میں

مہذب لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ قتل چوری یہاں عام ہوتے ہیں۔ یہاں جو سرکاری افسر متعین ہوتا ہے اسے عام افسر سے دگنی تنخواہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ یہ غیر مہذب اور غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگ انہیں قتل کر دیں۔

ایسے علاقے امریکہ میں بہت ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ ایک طرف تو لوگوں کا معیار زندگی اتنا بلند...... اخلاقی قدریں اتنی مضبوط...... رہن سہن اتنا پرسہولت۔ قانون کا احترام، آئین کی خلاف ورزی کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔

اور

دوسری طرف نسل انسانی کا یہ حال۔

خیر ایسے علاقے بہت زیادہ نہیں ہیں۔ میں ان کے متعلق آگے چل کر لکھوں گی۔ فی الحال تو میسی کی خریداری کا آپ کو بتاؤں۔

بشرہ نے اپنے لیے ویلوٹ کا ایک خوبصورت لباس خریدا۔ بچی کے لیے دو چار چیزیں لیں۔ میں نے بھی ایک سویٹر خریدا۔ ان دنوں سیل لگی ہوئی تھی۔ کافی ڈسکاؤنٹ مل رہا تھا۔ میں نے ایک ہینڈ بیگ بھی لیا۔

"بس یا کچھ اور خریدیں گی۔" بشرہ نے اپنے لفافے سنبھالتے ہوئے بچہ گاڑی دھکیلی۔

"میں تو بہت تھک گئی ہوں بابا...... پھر کسی دن آجائیں گے۔"

"سرزن اور لارڈ اینڈ ٹیلرز نہیں دیکھنا۔"

"آج نہیں......"

"نانی لارڈ اینڈ ٹیلرز ذرا امیروں کا سٹور ہے۔ بہت خوبصورت نیٹ اینڈ کلین۔"

"کچھ بھی ہو میں اب تھک گئی ہوں واپس چلو۔ سارہ بھی بار بار رو رہی ہے۔ بچہ گاڑی میں پڑے پڑے بھی تھک جاتا ہے اور بشرہ تمہیں بھی ابھی اپنے آپ کو اتنا تھکانا نہیں چاہیے۔ پندرہ دن کی تو بچی ہے تمہاری......"

بشرہ مسکرائی اور بولی "کوئی عورت سٹوروں میں گھومتے پھرتے نہیں تھکتی۔"

"نہیں بھائی میں تو اب واپس چلوں گی۔ کم بختی مارے اتنے بڑے بڑے سٹور۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے ہی ٹانگیں جواب دے جاتی ہیں۔"

ہم باتیں کرتی باہر نکل آئیں۔ دوپہر کے تین بج چکے تھے۔ سٹور میں گھومتے پھرتے وقت کا پتہ ہی نہ چلا تھا۔

گھر پہنچنے تک بھی پینتالیس منٹ لگ گئے۔ میرا تو جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ بشرہ اپنی شاپنگ نکال نکال کر دیکھنے لگی اور میں صوفے پر پاؤں پسار کر پڑ گئی۔

بشرہ نے سارہ کی نیپی بدلی۔ اسے فیڈ دی...... پھر میرے پہلو میں لٹا کر اندر گئی

یہاں فون پر آنسرنگ مشین لگا دیتے ہیں۔ گھر پہ نہ ہوں تو یہ مشین پیغام ریکارڈ کر لیتی ہے۔ یوں پتہ چل جاتا ہے کہ غیر حاضری میں کس کا فون آیا تھا۔ آنے والے فون کا نمبر بھی ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ اب تو یہ چیزیں پاکستان میں بھی دستیاب ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں۔ وہاں ہر گھر میں یہ مشین اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

بشرہ واپس باہر آئی۔ تو بولی "نانی! شمو خالہ کا فون آیا تھا۔"

"اچھا۔ کیا کہتی ہے۔"

"آپ خود فون کر لیجیے گا...... ضرور کہتی ہوں گی آپ کو لینے آرہی ہوں۔"

"لاؤ فون۔ میں اس سے بات کروں۔"

"آرام سے۔ میں چائے بناتی ہوں۔ چائے پی کر کر لیجیے گا نانی جی......"

"تمہاری مرضی......"

وہ چائے بنا لائی۔ ساتھ بسکٹ اور چھوٹا سا کیک بھی لائی۔

میں نے بسکٹ یا کیک لینے سے اجتناب کیا۔ تو وہ بولی "نانی یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔ شوگر فری ہیں۔"

"اچھا۔"

"ہاں یہاں ہر چیز شوگر فری مل جاتی ہے۔ کم کیلوریز کی چیزیں دستیاب ہیں۔ جو چیز آپ کھانا چاہیں شوگر فری اور کم کیلوریز کی مل جائیں گی۔ سو کیک کھائیے۔ بہت مزے کا ہے......"

میں نے کیک پیس لے لیا۔

"میں آپ کے لیے جوسز بھی لائی ہوئی ہوں۔ کوک' سیون اپ بھی' چاکلیٹس اور ٹافیاں بھی' نانی آپ کے لیے مکھن بھی کیلوریز فری لائی ہوئی ہوں۔ کسی دن گروسری کرنے چلیں گے آپ کو مزے مزے کی چیزیں بتاؤں گی اور نانی یہ سب چیزیں برائے نام نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہر چیز پر باقاعدہ لکھا ہوتا ہے۔"

"پھر تو مزہ ہے۔ پرہیز جو مجھے کرنا پڑتا ہے اس سے تو کچھ عرصہ نجات ملے گی۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے چائے پیتی رہیں۔

پھر

میں نے شمیم کو فون کیا۔ واقعی وہ مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے جلدی مچا رہی تھی۔

بشرہ نے فون میرے ہاتھ سے لے لیا اور خود شمیم سے بات کرنے لگی "شمو خالہ نانی کم از کم دو ہفتے میرے ہاں رہیں گی۔ جب آپ کے باقی مہمان آ جائیں گے تو وہ بھی آ جائیں گی۔ شمو خالہ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔ نانی کو ابھی میرے پاس رہنے دیں۔ آپ تو پچیس سال سے یہاں رہ رہی ہیں۔ بہن بھائیوں کے بغیر رہنا سیکھ لیا ہے۔ لیکن میں تو ابھی سال بھر پہلے یہاں وارد ہوئی ہوں۔ تنہائی اور اکیلے پن نے اتنا ڈسا کہ اب نانی کو میرے پاس رہ کر اس اذیت کا مداوا کرنا ہی ہوگا۔"

بشرہ کی لمبی چوڑی تقریر کے بعد شمو نے جانے کیا کہا کہ بشرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔

کچھ دیر دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں۔ پھر بشرہ نے کہا "ٹھیک ہے شمو خالہ آپ اس اتوار کو آ جائیں۔ ہمارے ساتھ پورا دن گزاریں۔"

شمو نے شاید اس کی بات مان لی۔

"تھینک یو شمو خالہ تھینک یو......"

اس نے فون رکھ دیا۔

میں نے پوچھا "کیا فیصلہ ہوا۔"

"شمو خالہ سنڈے کو یہاں آ جائیں گی۔ پورا دن ہمارے ساتھ گزاریں گی۔"

"اچھی بات۔"

"کبھی کبھی آ جاتی ہیں میرے گھر۔ آٹھ دن پہلے ہی سارہ کو دیکھنے آئی تھیں۔ سو ڈالر دیا تھا سارہ کو۔"

"بھئی امیر عورت ہے وہ۔"

"دل کی بھی بہت اچھی ہیں۔ ہاں نانی آپ نے ان کے ساتھ ابھی نہیں جانا۔ 14 دسمبر کو وہ دعوت کر رہی ہیں۔ یعنی شادی شروع...... تب ہم آپ کو لے جائیں گے۔ شادی تک آپ وہاں رہیے گا......"

"وہ تو دیکھوں گی۔ شادی تک رہتی ہوں یا اس کے بعد بھی۔"

"ابھی تو گڈی خالہ اور رقیہ مامی بھی نہیں پہنچیں۔"

"وہ 13 دسمبر کو پہنچ رہی ہیں اسی لیے شمو نے کھانا 14 دسمبر کو رکھا ہے۔"

"جی۔ واقعی۔ نسیم باجی تو آ چکی ہیں۔ وہ آ گئیں تو آپ چاروں بہنیں اور بھائی اکٹھی ہو جائیں گی...... ابھی تو نسیم باجی بھی اپنی بیٹی حمیرا کے ہاں ہی ہیں۔"

باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے کہا......

"احمد گڈی کے ساتھ نہیں آ رہا......"

"ہاں وہ چند دن بعد آئے گا......"

پھر ہم دونوں احمد کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ اس کی خوش قسمتی تھی جو اسے ویزا مل گیا تھا۔ نوجوان ڈاکٹروں کو تو بس قسمت ہی سے ویزا ملتا تھا۔

شمیم کے آنے سے پہلے ہی میں نے اور بشرہ نے مل کر کھانا تیار کر لیا۔ بشرہ اچھا پکا لیتی تھی۔ لیکن میں نے اس کی مدد کی۔ دو تین اچھی اچھی ڈشیں بنالیں اور بھی جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔

اس کے بعد بشرہ نے گھر خوب اچھی طرح صاف کیا۔ دھول مٹی کا تو وہاں سوال ہی نہیں۔ مہینوں ڈسٹنگ نہ کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ فضا صاف وشفاف اور دھلی دھلائی ہو جیسے۔

''بشرہ یہاں دھول مٹی نہیں اڑتی...... اتنے دنوں سے میں نے تو یہی، دیکھا ہے۔ فضا کتنی صاف ہوتی ہے۔ لگتا ہے اللہ میاں بھی ان لوگوں پر زیادہ ہی مہربان ہے۔''

بشرہ ہنس کر بولی ''اللہ میاں بھی جب ہی مہربانی فرماتا ہے جب لوگ ہمت کرنے والے ہوں۔''

''اب دھول مٹی نہ ہونے میں ہمت کا کیا دخل......''

''نانی...... یہاں آپ جہاں کہیں بھی جائیں نا...... آپ کو کچی زمین نظر نہیں آئے گی۔ جہاں بھی کچی زمین ہے ان لوگوں نے وہاں گھاس لگائی ہوئی ہے۔ ایک فٹ بھی کچی زمین کہیں نظر نہیں آتی...... یہ ہمارے اپارٹمنٹس کے باہر جتنی کچی جگہ تھی سب جگہ گھاس لگی ہوئی ہے۔ یہ اپارٹمنٹس کے مالک کی ذمہ داری ہے کہ کوئی کچی جگہ نظر نہ آئے۔''

''اچھا۔''

''ہاں۔ بڑے بڑے گھروں کے اردگرد جتنی کچی زمین ہو اس پر گھروں کے مالک گھاس لگواتے اور اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ دفتروں کے باہر گھاس کے قطعے دفتر والوں کی ذمہ داری ہے...... لمبی شاہراہوں کے دونوں طرف حکومت گھاس لگوانی ہے۔''

''کیا انتظام ہے۔''

''اور ہر کوئی اپنے فرض کو فرض سمجھ کر پورا کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ درختوں اور پھولدار پودوں کے گرد جو گول سا دائرہ پانی دینے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ وہ بھی ننگا نہیں ہوتا۔''

''ہاں میں نے یہ چیز دیکھی ہے۔ لگتا ہے درختوں کی چھال کوٹ کر ان میں ڈالی ہوتی ہے۔''

''کچھ ایسی ہی چیز ہوتی ہے۔ چھال اور لکڑی کا برادہ...... مٹی نامی چیز نظر نہیں آتی۔''

''ہوں۔''

''آپ جہاں بھی جائیں گی یہ دائرے آپ کو اسی چیز سے ڈھکے ہوئے ملیں گے۔''

''یہاں کی مٹی بھی کچھ نم آلودسی ہے۔ کل ہم ایک سڑک سے گزر رہے تھے۔ وہاں شاید کوئی بلڈنگ زیرِ تعمیر تھی......''

''ہاں۔'' بشرہ نے بتایا'' جب کوئی بلڈنگ وغیرہ بن رہی ہو تو لکڑی کے تختوں کی باڑ سی اردگرد لگا دی جاتی ہے۔ ایک تو بلڈنگ میٹریل نظر نہ آئے۔ دوسرے مٹی وغیرہ اڑے تو باہر نہ جائے۔ ویسے یہاں ہمارے ملک کی طرح اڑنے والی خاک نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہاں ننگی کچی زمین رکھنے کا تصور ہی نہیں۔ اسی لیے فضا بھی صاف رہتی ہے اور ہر چیز بھی...... مہینہ مہینہ بھر جوتے پالش نہ کریں تو ان کی چمک دمک میں فرق نہیں آتا۔''

''واقعی۔ کمال کی بات ہے۔''

''اب آپ باہر جائیں تو سڑک کے دونوں طرف دیکھئے گا۔ کوئی مٹی کا ڈھیر یا کچی زمین آپ کو نظر نہیں آئے گی۔ گورنمنٹ اور لوگوں کی مشترکہ کاوش ہے نا۔''

مجھے ایک بار پھر پاکستان کا خیال آ گیا۔ دھول' مٹی...... گندگی کے ڈھیر۔ اڑتے ہوئے موی لفافے' پھٹے کاغذ...... کوڑا کرکٹ...... مجھے دکھ ہوا کہ ہم لوگ صفائی جسے ہمارے مذہب نے نصف ایمان کہا ہے۔ اس سے بھی دانستہ اغماض برتتے ہیں۔ بہت حد گھروں کے اندر صفائی کروالی...... کوڑا سڑکوں کے کنارے پھنکوا دیا۔ کوئی پروا نہیں۔ کوئی افسوس نہیں۔ کبھی برا نہیں لگتا۔ بہت ہوتو سرکار کو کوس لیتے ہیں کہ کوڑا نہیں اٹھواتی' گند کے ڈھیر صاف نہیں کرواتی۔ کبھی ہم نے سوچا کہ یہ ذمہ داری ہم شہریوں کی بھی ہے؟؟؟

جہاں کوڑا پھینکنے کے لیے ڈرم وغیرہ بھی رکھوائے گئے ہوں لوگ کوڑا آدھا اس کے اندر آدھا باہر پھینک دیتے ہیں۔ ذرہ بھر پروا نہیں کرتے۔ صفائی کا ایسا تصور ہی ہم میں نہیں ہے۔

یہاں ہر اپارٹمنٹس کے ساتھ بڑے بڑے چوکور ڈھکنے والے کوڑا دان پڑے ہوتے ہیں۔ جن میں موی لفافوں میں باندھ کر کوڑا ڈالا جاتا ہے۔ مجال ہے جو ایک کاغذ کا ٹکڑا یا سبزی' پھل کا چھلکا بھی باہر گرا نظر آ جائے۔ گاڑیاں آتی ہیں اور کوڑا اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ کوڑا پھینکنے والی جگہ بھی اتنی صاف ہوتی ہے لگتا ہے ہمارے ہاں کے کسی صاف

ستھرے گھر کا آنگن ہو۔

واہ امریکہ بہادر...... لوگ یونہی امریکہ سے متاثر نہیں ہوتے۔

خیر

بشرہ مجھے ہر دوسرے دن گھمانے پھرانے لے جاتی۔ ہم نے چھوٹی سے چھوٹی شاپ اور بڑے سے بڑے سٹور دیکھے۔ ان دنوں وہاں سیلیں لگی ہوئی تھیں۔ لوگوں کو نسبتاً سستی چیزیں حاصل کرنے کا چارم ہوتا ہے اس لیے سٹوروں پر اب بہت زیادہ رش پڑ رہا تھا۔ کرسمس بھی قریب آ رہا تھا اور نیا سال بھی آنے والا تھا۔ ان دونوں موقعوں پر امریکی بڑی فیاضی سے جشن مناتے ہیں۔ نئے ڈریسز خریدتے ہیں۔ گھروں کو روشنیوں اور رنگارنگ کاغذی پھولوں سے سجاتے ہیں۔ اپنے اپنے مکان کے سامنے جو بھی پودا یا درخت ہو اس پر برقی قمقموں سے سجاوٹ کی جاتی ہے۔ انہی چیزوں کی خریداری ابھی سے شروع ہو گئی تھی۔ لوگ حسب مقدور قمقموں کی لڑیاں، چمکیلے کاغذ، کاغذی پھول وغیرہ خرید رہے تھے۔ ملبوسات کی خریداری بھی ہو رہی تھی۔ سردی چونکہ بے حد تھی۔ اس لیے سویٹر، ٹراؤزر، لمبے گرم کوٹ، ٹوپیاں، مفلر، دستانے خریدے جا رہے تھے۔

بشرہ نے مجھے بہت سے اور شاپنگ سنٹر بھی دکھائے۔ مال بھی دیکھے۔ میں کبھی کبھی کوئی چیز خرید بھی لیتی۔ لیکن زیادہ تر ونڈو شاپنگ ہی ہوتی یوں ہم نے میسی، سٹرن، کے مارٹ، کالڈور، لارڈ اینڈ ٹیلرز وغیرہ سٹور دیکھے۔

فاران شاپنگ کے شوقین نہیں تھے۔ اس لیے جس دن بشرہ کے پاس گاڑی ہوتی ہم دونوں ہی شاپنگ سنٹرز دیکھنے نکل جاتیں۔ ہاں شام کو کہیں باہر گھومنے پھرنے یا کسی کے ہاں جانا ہوتا تو فاران ہمیں کمپنی ضرور دیتے۔

جس دن گاڑی ہمارے پاس نہ ہوتی۔ ہم سارا سارا دن باتوں میں گزار دیتے۔ کسی کسی دن بشرہ کی وہ ہندو دوست بھی آ جاتی۔ وہ بشرہ کی ہم عمر ہی تھی۔ اردو بول لیتی تھی۔ گپ شپ لگانے میں وہ بھی ہوشیار تھی۔ اتنی دیر بیٹھی رہتی کہ گھر جانا ہی بھول جاتا۔ وہ بہت اچھی دوست اور خاصی کلچرڈ لڑکی تھی۔ اس کی گفتگو مہذب ہوتی۔ خاصی قصہ گو تھی۔ اپنے

ملک کی باتیں بتاتی۔ ہم سب ایک دوسرے کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ بشرہ کی طرح وہ بھی مجھے نانی کہنے لگی۔ ہماری عمروں کا تفاوت تھا۔ لیکن وہ دونوں میری عمر کے فرق کے باوجود میری اچھی دوست تھیں۔ بشرہ سے تو شروع ہی سے نانی نواسی کے رشتے سے کہیں زیادہ دوستی کا رشتہ استوار تھا۔ اب ارملا سے بھی یہ رشتہ جڑ گیا۔

وہ کسی کسی دن میرے لیے بھی کوئی ڈش بنا کر لے آتی۔ جسے میں بڑے پیار سے رکھ لیتی۔ لیکن جانے کیوں کھانے کو جی نہ چاہتا۔ اس کا دل رکھنے کو میں چکھ ضرور لیتی۔ کھانے کی تعریف بھی کرتی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت بھی کرتا۔ یہ دکھاوا اصلیت کے برخلاف ہوتا۔

لیکن

جانے کیوں؟ میں اس کی پکائی ہوئی ڈش کھانے سے گریزاں ہوتی۔ یہی حال بشرہ کا بھی تھا۔ لیکن وہ...... بڑی خوشی سے ہماری پکی ہوئی چیزیں کھا لیتی۔ ایک دن اس نے ہمیں اپنے گھر بھی بلایا۔

اس کا اپارٹمنٹ بھی بشرہ ہی کی طرح تھا۔ سنگل بیڈ روم، لیونگ روم، کچن وغیرہ۔

لیکن

اس نے بشرہ کی طرح اپارٹمنٹ ڈیکوریٹ نہیں کیا ہوا تھا۔ بیڈ روم میں دو فوم کے گدے اوپر تلے رکھے ہوئے۔ لیونگ روم میں ایک طرف میز اور دو کرسیاں۔ دوسری طرف دو چوکیاں۔ دو چمڑے کے کور والی موٹی موٹی گدیاں۔ درمیان میں چھوٹا سا قالین۔ نچی سی میز پر گلدان تازہ پھولوں سے مہکتا ہوا۔

کمرے کے ایک کونے میں مٹی کی بھگوان کی مورتی جس پر سرخ سنہری رنگ پھرا ہوا تھا۔ یہ مورتی چھوٹی سی چوکی پر رکھی تھی۔ اس کے ایک طرف شمع دان، دو کٹوریاں، سا گوان کی طشتری اور ایک مالا پڑی تھی۔

اس کے اوپر ہی دیوار پر صلیب پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ لگی ہوئی تھی۔

اس نے ہمیں گدیوں اور چوکی پر بٹھایا۔ پھر ہنس کر بولی "نانی میرا گھر بشرہ کی طرح سجا ہوا نہیں ہے......"

"لیکن گھر تو ہے بیٹی۔ ایسی چھت جس کے تلے تم دونوں سکون کی زندگی گزار رہے ہو......"

"نانی یہ بڑی کنجوس ہے پیسے جمع کرتی ہے۔ گھر پر خرچ نہیں کرتی۔" بشرہ نے ہنس کر کہا۔

"نہیں نانی میں پڑھ رہی ہوں۔ یونیورسٹی جاتی ہوں...... یہاں اس طرح پڑھنا بہت مہنگا ہے۔ ہمارا ابھی گرین کارڈ کا معاملہ بھی لٹک رہا ہے۔ اس لیے پیسے کہاں بچتے ہیں۔ بشرہ کو پتہ ہے یہاں اپنے خرچ پر پڑھنا کتنا مشکل ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ تعلیم حاصل کر لوگی تو عیاشی ہوگی۔ لیکن مجھے پتہ ہے تم تب بھی کنجوس رہوگی۔" بشرہ نے اسے چھیڑا۔

وہ مجھے اپنے مالی مسائل بتانے لگی۔

میں نے اس کی طرفداری کرتے ہوئے دلجوئی کی۔

پھر اس موضوع سے ہٹنے کے لیے اس سے پوچھا "تم دونوں اپنے اپنے مذہب پر قائم ہو۔"

"ہاں نانی۔" وہ بولی اور پھر بھگوان کی مورتی اور صلیب کی طرف اشارہ کر کے بولی "میں نے جب پوجا کرنا ہوتی ہے تو بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑ آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتی ہوں۔ جو شبد آتے ہیں پڑھتی رہتی ہوں اور یوحنا اپنے مسیح کی جب دل چاہے زیارت کر لیتا ہے۔"

"آپس میں کوئی بحث و تکرار تو نہیں ہوتی مذہب کے معاملے میں۔"

"کبھی نہیں......" وہ ہنس کر بولی پھر بشرہ کی طرف نظر اچھال کر کہا "ویسے اکثر لڑائی ہو جاتی ہے۔"

"میاں بیوی میں اختلاف تو ہوتے ہی ہیں لیکن یہ کبھی سنجیدہ نہیں ہونے چاہئیں۔"

"یہاں سنجیدہ ہوتے ہی نہیں نانی۔ لڑ جھگڑ کر خود ہی ایک دوسرے کو منا لیتے

ہیں۔ تیسرا تو کوئی ہوتا ہی نہیں جو دخل دے کیوں بشرہ؟"

"ہاں۔"

"اچھی بات ہے۔"

اس نے ہمارے لیے کافی بنائی۔ ساتھ بسکٹ لائی۔ پاپڑی قسم کی کوئی چیز ساتھ لے آئی میں نے ایک بسکٹ لیا۔ کافی اس نے بہت اچھی بنائی تھی۔ گھونٹ گھونٹ پی لی۔

ہم گھنٹہ بھر اس کے ہاں رکے۔ میں اس کے لیے ایک پاکستانی گلدان بطور گفٹ لے گئی تھی۔ اسے پا کر وہ بہت خوش ہوئی۔ محبت سے میرے بغلگیر ہو گئی۔

میں نے جذبوں کی کیفیت کو محسوس کیا تھا۔ واپسی پر میں اور بشرہ جب اسی کی باتیں کر رہی تھیں تو میں نے کہا "بشرہ یہ لڑکی ہندو ہے۔ اپنے عقیدے کی بھی پکی لگتی ہے جو بھگوان کی مورتی یہاں بھی اپنے گھر میں رکھے ہوئے ہے' لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں سے ملتی ہے۔ خوشی سے کھاتی پیتی ہے۔ اس کے دل میں کدورت و نفرت نام کی نہیں۔ تو پھر میں سمجھ نہیں پاتی وہاں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں میں یہ جذبے اتنے شدید و تنومند کیوں ہیں۔ ہندو مسلمانوں کو برداشت نہیں کرتے' مسلمان ہندوؤں کو۔ دشمنی کی حد تک نفرتیں ہیں......"

"یہ سب کچھ وہیں ہے نانی۔ یہاں میں نے کسی ہندو مسلم کو لڑتے جھگڑتے تکرار کرتے نہیں دیکھا۔ شمو خالہ کی تو کچھ سہیلیاں کٹر قسم کی ہندو ہیں' لیکن آئے دن ایک دوسرے کے ہاں پارٹی وغیرہ میں گئی ہوتی ہیں...... اور تو اور...... یہاں تو ہندو مسلم شادیاں بھی ہو رہی ہیں۔ فاران کے ایک دوست نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہے۔"

"خیر یہ تو جس قسم کا یہاں معاشرہ ہے اس کی پیداوار ہے۔ میں تو سوچتی ہوں جب یہاں ہندو مسلم دوست بن کر رہ سکتے ہیں تو پھر انڈیا' پاکستان کے بارڈروں پر فوجیں بندوقیں تانے کیوں رہتی ہیں۔ آئے دن انڈیا میں ہندو مسلم فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ مشتعل کیوں ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کیوں دوڑ پڑتے ہیں؟"

بشرہ کے جواب دینے سے پہلے ہی کیری کاٹ میں پڑی سارہ نے زور سے ٹیں کی۔ وہ ہنس کر بولی "دیکھ لیں نانی۔ سارہ کو یہ بحث پسند نہیں آئی۔ یہ امریکی پیداوار ہے اس

لیے کھلے دل و دماغ کی ہے۔"

"واقعی۔ بھئی تم ٹھیک کہتی ہو۔ چلوا ٹھالوا سے۔ ٹوکری مجھے پکڑا دو۔"

"نہیں نانی اب گھر جا کر ہی اسے نکالوں گی۔ وہ سامنے ہی تو گھر ہے۔"

ارملا کا گھر بشرہ کے گھر سے بمشکل دو تین فرلانگ تھا۔ سڑک کے ایک طرف وہ تھی دوسری طرف بشرہ۔

ہم چند منٹ میں ہی گھر پہنچ گئے۔



اتوار کو شمیم آ گئی۔ وہ ایک سال بعد مجھے ملی تھی۔ پچھلے سال وہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب گئی تو وہیں سے پاکستان بھی آ گئی۔ تب بٹ صاحب کو فوت ہوئے مہینے سے اوپر ہو چکا تھا۔ اس نے ان کے چالیسویں میں شرکت کی تھی۔

گو ہم ایک سال پہلے چند دن اکٹھے رہے تھے۔

لیکن

لگتا تھا برسوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ وہ بہت سمارٹ اور گوری چٹی ہو گئی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس کا رنگ بچپن میں گندمی تھا۔ اس وقت تو شاید صائمہ کی شادی کی خوشی تھی۔ اس کا چہرہ اس خوشی کے پرتو سے چمک رہا تھا۔

امریکہ میں بس جانے والے لوگ وہیں کا پہناوہ پہنتے ہیں۔ آفس جانا ہو یا بازار وہی پینٹ شرٹ یا جینز اور لمبا سویٹر۔ کوٹ پتلون بھی استعمال میں آتا ہے۔ شلوار قمیض گھروں یا آپس کی تقریبات ہی میں پہنی جاتی ہے۔

سردی کے پیش نظر شمیم نے بھی اس وقت پتلون کوٹ پہن رکھا تھا۔ بال بوائے کٹ ہمیشہ ہی سے رکھتی تھی۔

میں اس سے گلے ملی...... کافی دیر ہم دونوں بغلگیر رہیں۔ اسے خوش دیکھ کر میرا جی باغ باغ ہو گیا تھا......

جب ہم الگ ہوئیں تو ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے پکڑے مسکراتی رہیں۔ پھر میں نے شمو کے سراپا پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "شمو تم تو بالکل مرد لگ رہی ہو......"

"آپا ساری عمر مرد بن کر ہی گزارہ کیا ہے۔" اس نے ایک جملہ کہا' لیکن اپنی ساری عمر کی سرگزشت جیسے بیان کر دی۔

"واقعی۔تم نے جتنی ہمت کی ہے۔کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔خدا تمہیں اب یہ خوشیاں مبارک کرے۔"

"آمین۔" بشرہ بچی کو تھپتھپاتے ہوئے بولی...... بشرہ تھی تو شمو کی بہن کی نواسی' لیکن اس دیار غیر میں ایک دوسرے کی قربت کا احساس ہی بڑی چیز تھا۔دونوں دوستوں کی طرح ملتی تھیں۔

شمو نے سارا دن ہمارے ساتھ گزارا...... بہت مزہ آیا۔اس کی باتوں کا انداز و طریق وہی تھا جو ہمیشہ سے تھا۔وہ تقریباً پچیس چھبیس سال سے امریکہ میں تھی۔دو چار بار ہی پاکستان جانا ہوا تھا۔لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ نہ اس کی گفتگو کا طریق' نہ ہی منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے کا انداز...... وہی فی البدیہہ باتیں' وہی قلقل کرتے قہقہے۔خالص پشاوری زبان کے محاورے۔اس کی معلومات پاکستان خاص کر اپنے میکے اور سسرالی خاندان کے متعلق بہت تھیں۔

آج تو وہ خوش بھی بہت تھی۔صائمہ کی شادی سپائن سپیشلسٹ سے ہو رہی تھی۔بہت کم ڈاکٹر ریڑھ کی ہڈی اور نروز میں سپیشلائز کرتے ہیں۔صائمہ کا منگیتر بہت لائق اور سلجھا ہوا ڈاکٹر تھا۔

اس دن ہم نے ڈھیروں باتیں کیں۔جی نہیں چاہتا تھا شمو واپس جائے۔وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر مصر تھی۔لیکن بشرہ نہ مان رہی تھی۔

"شمو خالہ آپ سے نانی نے کہا تھا نا 14 دسمبر کو آئیں گی۔"

"کہا تھا تو کیا ہوا۔میں آئی ہوئی ہوں ساتھ لے جاتی ہوں۔"

"ہم نانی کو آپ کے گھر پہنچا آئیں گے۔پلیز تین دن تو رہ گئے ہیں۔انہیں یہیں رہنے دیں۔"

جی تو میرا بھی شمو کے ساتھ جانے کو چاہ رہا تھا۔

لیکن

بشرہ کے اصرار کے سامنے جھکنا پڑا۔

شمو کے جانے کے بعد بھی میں اور بشرہ اسی کی باتیں کرتے رہے۔میں نے شمو کے بچپن سے لے کر شادی تک کے سارے واقعات اسے سنائے۔

فاران بھی آ گئے تھے۔وہ بھی شمو خالہ کی باتیں شوق سے سننے لگے۔

میں نے شمو کا ایک لطیفہ انہیں سنایا تو وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔

شمو ساتویں آٹھویں میں تھی۔جب اسے نماز پڑھنے کا شوق آیا۔نماز زبانی تو آتی تھی۔لیکن کتنی رکعت ہر نماز میں ہوتی ہیں اور انہیں کس طرح پڑھا جاتا ہے' نہیں آتا تھا۔اتفاق ہی سے تب ہماری پوسٹنگ پشاور ہوئی تھی اور میری ساس میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔وہ بہت پڑھنے پڑھانے والی خاتون تھیں۔شمو نے ان سے رکعتیں اور ان کی ادائیگی سیکھی۔جس دن وہ ہمارے گھر آتی یا ہم اس کی طرف جاتے وہ میری ساس سے نماز پڑھنا سیکھتی۔

رکعتیں اس نے ہر نماز کی لکھ کر رکھی تھیں۔جب مصلے پر نماز پڑھنے کھڑی ہوتی کاغذ مصلے پر رکھ لیتی۔

نماز پڑھتے پڑھتے جہاں بھول جاتی فوراً سر ہلا کر کہتی "نہ چ" یعنی یہ نہیں۔اور بالآخر وہ نماز چھوڑ کر کاغذ اٹھا کر لکھا پڑھنے لگتی۔جب پڑھ لیتی تو پھر وہیں سے جہاں نماز چھوڑی ہوتی آگے پڑھنے لگتی۔

ایک اور بھی بات فاران اور بشرہ کو مزے کی لگی۔

دسویں جماعت تک وہ قسم یوں اٹھایا کرتی "اللہ مجید دی قسمے" سب ہنستے اسے ٹوکا بھی کرتے۔لیکن اسے پتہ ہی نہ چلتا۔

کسی کو اپنی بات کا یقین دلانا ہوتا' سکول کی کوئی بات سچ ثابت کرنا ہوتی' کوئی بھی بات ہوتی' وہ فٹ سے کہتی' "اللہ مجید دی قسمے......"

امی اکثر اسے سمجھاتیں "بیٹی قرآن مجید کہتے ہیں اور اللہ پاک کی قسم اٹھاتے

ہیں۔ ویسے تم قسمیں نہ ہی اٹھایا کرو......"

ہم تینوں اس کی باتیں کر کر کے ہنستے رہے۔

"نانی شمو خالہ اب بھی مزے کی باتیں کرتی ہیں......"

پھر

اس نے کہا "نانی شمو خالہ نے ایک بڑا قیمتی کتا پالا تھا۔ اس کی ٹریننگ کے لیے خاص ایک امریکی جانوروں کو سدھانے والا بندہ تنخواہ پر رکھا۔ پتہ نہیں کتنے سو ڈالر وہ لیتا تھا۔ وہ بیچارہ تو صحیح ٹریننگ دیتا ہوگا۔ شمو خالہ اس کو لاڈ پیار کر کے خراب کر دیتیں۔ ایک دن یہی ہوا۔ اس ڈوگی نے خالہ کے بڑے قیمتی قالین پر پوٹی کر دی۔ شمو خالہ دیکھتے ہی کتے کی طرف دوڑیں "ہائے بھیڑے کتے" چیختے ہوئے اسے تھپڑ لگایا۔ کتا جو انگریزی میں سب کچھ سیکھ رہا تھا۔ پریشان ہو گیا۔ بھلا بیچارہ پنجابی کیسے سمجھتا اور اس پر تھپڑ۔"

ہم ہنسنے لگے۔

"پھر......" فاران بولے۔

"خالہ نے کتا واپس کر دیا۔"

"کرنا ہی چاہیے تھا۔ اسے کتا پالنے کا طالب علمی کے زمانے میں ہی شوق تھا۔ تب بھی اس نے ایک لمبے بالوں والا سفید گول مول سا کتا پالا ہوا تھا۔ اسے اتنا بد تمیز کر دیا تھا کہ وہ بستروں میں بلا تکلف گھسنے لگا تھا۔ نانیاں 'چلغوزے مزے سے کھاتا۔ دستر خوان پر بھی آنا شروع کر دیا......تب میری بھابی اختر نے جب شمو کالج گئی ہوئی تھی کہ اس کا یہ "بے ادب" کتا نوکر سے کہہ کر پتہ نہیں کہاں غائب کروا دیا۔ شمو اس کے لیے کئی دن روتی رہی اختر بھابی سے بھی ناراض رہی۔ لیکن اس کی کسی نے طرفداری نہ کی۔ اس لیے کہ کتے کے وجود کو گھر میں اور کوئی بھی برداشت نہ کرتا تھا۔

ہم رات گئے تک یہی پرانی باتیں یاد کر کر کے ہنستے رہے۔

آخر میں بشرہ بولی "شمو خالہ جیسی بھی تھیں......ڈاکٹر تو بن گئی تھیں اور اب دیکھیں نا وہ کتنی بڑی فزیوتھیراپی کی سپیشلسٹ ہیں۔ اپنے پیشے میں محتاط اور لائق بھی بہت ہیں۔"

"وہ تو ہے۔" فاران بولے۔

"اچھا ہی کیا تھا۔ جب چوبیں پچیس سال پہلے امریکہ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پشاور میں ہوتی تو سسرال والوں کے رویے سے جانے کیا حال ہوتا......"

"جائیداد وغیرہ سے انہیں یا بچوں کو تو کچھ نہیں ملا......"

"اللہ نے اسے یہاں اتنا کچھ دے دیا ہے۔ اسے ان کی جائیداد کی ضرورت بھی نہیں۔"

"بالکل۔"

فاران چند باتوں کے بعد اٹھ کر چلے گئے۔ بشرہ نے میرا بستر بھی بنایا۔ میں بھی لیٹ گئی۔

اگلا دن میں اور بشرہ بازاروں میں گھومتے رہے۔ وہ مجھے انڈین اور پاکستانی سٹوروں والے علاقے میں لے گئی۔ وہاں واقعی یوں لگا جیسے ہم امریکہ میں نہیں پاکستان کے کسی شہر میں گھوم پھر رہے ہیں۔ یہاں سڑک کے دو رویہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دکانیں تھیں۔ ایک انڈین سٹور میں ہم گئے۔ میں نے شلوار قمیض اور شال پہنی ہوئی تھی۔ بشرہ جینز اور سویٹر میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دکاندار سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے تپاک سے بولا "آیئے جی آیئے۔ تشریف رکھئے۔"

"میں اس کی طرف دیکھ کر بولی آپ انڈین ہیں۔"

"جی انڈین مسلم......"

"پھر تو ہمیں پہلے سلام کا تبادلہ کرنا چاہیے۔ ہم بھی الحمدللہ مسلمان ہیں۔"

"السلام علیکم...... السلام علیکم۔ بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے السلام علیکم اس لیے نہیں کہا تھا کہ پتہ نہیں تھا آپ ہندو ہیں یا مسلم...... ہندوستانی عورتیں بھی تو شلوار قمیض پہنتی ہیں۔"

"میں پاکستان سے آئی ہوں......"

"بیٹھیے......"

''معاف کیجئے گا۔ میں کچھ خرید نہیں رہی۔ صرف سٹور دیکھنے کے لیے اندر آ گئی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی آپ امریکہ میں بھی ان لباسوں اور جیولری سے مشرقی کلچر متعارف کرا رہے ہیں۔'' میں نے شوکیسوں میں ٹنگے ملبوسات یعنی شلوار قمیصیں، ساڑھیاں اور کشمیری شالوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جب روزی کمانے یہاں آ ہی گئے تھے تو پھر یہی فیصلہ کیا کہ کیوں نہ اپنی مصنوعات متعارف کروائی جائیں۔''

''خریدار آتے ہیں؟''

''جی ہاں آتے ہیں۔ ہمارے کامدانی کپڑے بہت پسند کیے جاتے ہیں۔''

''جیولری؟''

''وہ بھی......''

''یہ اصلی ہے؟''

''نہیں۔ سونے کی نہیں۔ سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔''

میں ایک شوکیس کے پاس کھڑی ہو کر زیور دیکھنے لگی۔ بڑے خوبصورت ڈیزائنوں میں انڈیا کے علاقائی زیورات تھے۔ خاص کر راجستھانی وزنی زیورات بہت خوبصورت تھے۔

''آپ چائے پئیں گی۔''

''جی نہیں بہت بہت شکریہ۔''

''ایک منٹ میں بن جائے گی۔ ہم نے اپنا ٹی میکر رکھا ہوا ہے۔''

''نہیں بھئی۔ تکلیف نہ کریں۔ آپ سے مل کر اور آپ کی دکان دیکھ کر ہی بہت خوشی ہوئی ہے۔''

ہم چند منٹ بعد ان سے ملاقات کا بے حد اچھا تاثر لے کر باہر نکلیں۔ اب ہم ایک پاکستانی سٹور میں گئیں۔ یہ گروسری اور سبزی وغیرہ کا سٹور تھا۔ یہاں سے ہر قسم کے مصالحہ جات مل جاتے تھے۔ دیسی چیزیں مثلاً پھٹکری، اجوائن، اسپغول، املی وغیرہ مل جاتے

تھے۔ آٹا، دالیں، گھی بھی دستیاب تھا۔ شان مصالحہ جات اور احمد کے حلوے، پنجیے، اچار، چٹنیاں سب مل جاتی تھیں۔

یہاں بھی مالکان سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ عرصہ دس سال سے یہاں تھے۔ دو بھائی سٹور چلا رہے تھے۔ پہلے نوکریاں کرتے رہے۔ پھر یہ سٹور کھول لیا۔ وہ فیصل آباد کے رہنے والے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔

پھر

بشرہ مجھے دہی بھلوں اور چاٹ والی ایک دکان پر لے گئی۔ بے حد صاف ستھری دکان، چیزیں صاف برتنوں میں ڈھانپ کر رکھی ہوئیں۔ حفظان صحت کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔

نمکین چیزوں میں سموسے، دال سویاں، چنے وغیرہ تھے۔ مٹھائیاں بھی ایک طرف شیشے کی الماریوں میں تھالوں میں اسی طرح سجا کر رکھی تھیں۔ جیسے پاکستان میں رکھی جاتی ہیں۔

اور

بھی

کئی دکانیں اندر سے جا کر دیکھیں۔ یہاں ایک درزی کی دکان بھی دیکھی۔ پاکستانی، ہندوستانی ڈریس بنانے کے ماہر کاریگر کام میں مصروف تھے۔ ان کے پاس کافی کام تھا۔ ایسی دو تین دکانیں اور بھی تھیں۔ کچھ ہندوؤں کی...... کچھ مسلمانوں کی لیکن یہاں بھائی چارے کی جو فضا دیکھی، خوشی ہوئی۔ مذہب ہر ایک کا اپنا اپنا تھا۔ اخلاقی رشتے آپس میں تھے جو بڑے مضبوط تھے۔ شاید وطنوں سے دوری اور احساس تنہائی نے ان سب کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔

یہاں گھومتے پھرتے ہمیں ہندو، مسلم خواتین اور مرد شاپنگ کرتے ہوئے ملے۔ شوخ رنگ کی کلف دار پگڑیوں والے سکھ حضرات بھی ملے۔ کئی سے رک کر ہم نے باتیں بھی کیں۔ حال احوال بھی پوچھا۔ سب خوشی کے جذبوں سے سرشار ہو کر ملے۔ لگتا تھا

کدورتیں اور دشمنیاں سمندر پار اپنی اپنی سرزمینوں پر چھوڑ آئے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ دشمنیاں سیاسی ہوتی ہیں۔ لوگوں کو سیاست کے نام پر بھڑکایا جاتا ہے ورنہ عوام ایک دوسرے سے کوئی کدورت نہیں رکھتے۔ میری خط و کتابت انڈیا میں دو تین لوگوں سے تھی۔ مشہور فلساز راجندر بھاٹیہ سے میری کئی سال خط و کتابت رہی۔ انہوں نے ہمیشہ بھائی کے سے پیار سے مجھے خط لکھا۔ میں نے بھی کبھی محسوس نہ کیا وہ کوئی غیر ہیں۔ اس طرح ''بیسویں صدی'' کے ایڈیٹر سے کافی عرصہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ ایک دفعہ پاکستان مجھے ملنے بھی آئے۔ محسوس ہی نہ ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ملک کے لوگ ہیں۔

خیر

اس دن امریکہ میں ''دیسی'' بازار میں گھومنے پھرنے کا بہت لطف آیا۔ وہاں ہندوستانی' پاکستانی تقریباً ہر چیز دستیاب تھی۔ ان میں سے کئی چیزیں گوریاں اور گورے بھی خریدنے آئے تھے۔ کالی عورتیں تو ویسے بھی بناؤ سنگھار بہت کرتی ہیں۔ ہاتھوں' گلے اور کانوں میں بڑے بڑے زیور پہنتی ہیں۔ زیور آرٹیفیشل ہوں یا اصلی ان کو پسند ہیں۔ شوخ بھڑکیلے رنگوں کے چمکتے دمکتے کپڑے اور چیختے رنگوں کی لپ اسٹک لگاتی ہیں۔ میں نے وہاں اکثر کالی موٹی بھجنگ عورتوں کو آتشی گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگائے دیکھا۔ بعض کالیاں بڑی پرکشش بھی ہوتی ہیں۔ حبشیوں کی یہ اولاد شوخ' چمکیلے لباسوں اور تیز میک اپ میں اکثر بازاروں میں نظر آتی ہے۔ یہ لوگ امریکہ کے نمبر دو شہری ہیں۔ انہیں گوروں کے برابر درجہ نہیں دیا جاتا۔ نہ ہی نوکریوں میں ان سے انصاف برتا جاتا ہے۔ اکثر بڑی بڑی نوکریوں سے انہیں محروم رکھا جاتا ہے۔ لیکن اب انہیں اپنا حق لینے کا کچھ شعور آتا جا رہا ہے۔ گورے بھی کچھ فراخدل ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہاں میں نے کالے مردوں کے ساتھ گوری عورتیں دیکھیں اور گورے مردوں کے ساتھ کالی سیاہ عورتیں۔ ایک ایسے جوڑے کے بچے بھی دیکھے۔ ایک کالا سیاہ دوسرا سفید فام۔

اس شعور کے باوجود ابھی بھی سفید فام لوگ کالوں سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں۔ انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

میں نے کالی عورتوں کے میک اپ اور شوخ لباس کے متعلق اس لیے لکھا ہے کہ گوری جوان لڑکیاں اور عورتیں یا تو بالکل میک اپ نہیں کرتیں۔ کرتی بھی ہیں تو اتنا ہلکا کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ ہاں ان کی بوڑھی عورتیں بہت زیادہ میک اپ کرتی ہیں۔ زیور پہنتی ہیں' رنگین شوخ لباس اور ہیٹ استعمال کرتی ہیں۔ چلا جاتا نہیں لیکن ٹِش فِش خوب نکالی ہوتی ہے۔ کئی کئی لاکٹ زنجیریاں ہار گلے میں۔ لمبے لمبے آویزے کانوں میں' چوڑیاں کلائیوں اور انگوٹھیاں انگلیوں میں پہننا نہیں بھولتیں۔ میں نے وہاں کسی جوان لڑکی یا عورت کو اس طلیے میں نہیں دیکھا۔ انتہائی 'سمپل' کوئی زیور نہیں۔ ہاں شادی شدہ یا جن کی منگنی ہو چکی ہو ان کی انگلی میں انگوٹھی ضرور ہوتی ہے۔

اگلا دن ہم نے پھر گھر پہ گزارا۔ بشرہ نے اپنی الماریاں وغیرہ ٹھیک کیں۔ میں نے اس کا کچن صاف کیا۔ برتن ترتیب سے رکھے۔ فریج صاف کر کے ساری چیزیں جگہ جگہ پر رکھیں۔ کچن چھوٹا سا تھا۔ لیکن اس میں استعمال کی بیشمار چیزیں بشرہ صاحبہ نے جمع کر رکھی تھیں۔ کوک کے ڈبے' کاغذی رول' دیگچیوں کے سیٹ' ڈسپوزیبل پلیٹیں اور گلاس یہ سب اوپر تلے کچن کے ایک کونے میں رکھنا پڑتے تھے۔ ہم لوگ ہر دوسرے روز چونکہ سیر سپاٹے کے لیے باہر نکل جاتے تھے۔ اس لیے سارا کچن الٹ پلٹ ہو چکا تھا۔

فارغ ہو کر میں نے کھانا بنایا۔ بشرہ مجھے منع ہی کرتی رہی۔ لیکن میں نے یہ کام کر ہی دیے۔ اس نے آج کپڑوں کی دھلائی کے لیے بھی لانڈری جانا تھا۔

سنگل بیڈ روم اپارٹمنٹ میں دھلائی کی مشین اور ڈش واشر نہیں ہوتا۔ برتن ہاتھ سے دھونا پڑتے ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ زیادہ تر کاغذی یعنی گتے کے گلاس' پلیٹیں استعمال کرتے ہیں جو استعمال کے بعد پھینک دی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں کافی سستی ملتی ہیں۔ اس لیے ڈھیروں کے حساب سے گھروں میں رکھی ہوتی ہیں۔

کپڑے دھونے کے لیے سب اپارٹمنٹس کی اکٹھی لانڈری ہوتی ہے۔ یعنی ایک الگ جگہ کمرے میں واشنگ مشینیں لگی ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ڈرائیر ہوتے ہیں۔ وہاں ان مشینوں کو استعمال کرنے کے لیے کوائن استعمال کرتے ہیں۔ مشین میں بنی جگہ پر ڈالے

جاتے ہیں...... تب مشین چل پڑتی ہے۔ کپڑے دھلتے ہیں۔ پھر سوکھنے کے لیے ڈرائیر میں ڈالے جاتے ہیں۔

بشرہ ہفتے میں ایک دن دھلائی کرتی تھی۔ بچی کے کپڑے وہ خود گھر پہ ہی دھوتی تھی۔

بشرہ ڈھیر سارے کپڑے اکٹھے کر کے لے گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسے کافی دیر لگ جائے گی لیکن وہ آدھ گھنٹے بعد ہی آ گئی۔

"دھل گئے کپڑے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں نانی۔ اب ڈرائیر میں ڈال آئی ہوں۔ سوکھ جائیں تو لے آؤں گی۔ ویسے آج دو تین لوگ اور بھی دھلائی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ شکر ہے مجھے ایک مشین مل گئی۔ ورنہ ان لوگوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پڑتا......"

"واشنگ مشین تو بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ تمہارے اپارٹمنٹ میں کیوں نہیں......"

"چھوٹے گھروں میں نہیں ہوتی۔ بعض جگہ تو دو بیڈ روم کے گھروں میں بھی نہیں دیتے۔ اس سے بڑے گھر ہوں تو وہاں یہ سہولت موجود ہوتی ہے۔ یا جن کے اپنے گھر ہوں وہ لگا لیتے ہیں۔ ان گھروں میں تو ڈش واشر بھی نہیں ہیں۔ اتنے چھوٹے گھروں میں یہ چیزیں رکھنا منع ہیں۔ بس سب اپارٹمنٹس کے لیے مشترکہ لانڈری بنا دیتے ہیں۔ تین چار واشنگ مشینیں مع ڈرائیروں کے ہوتی ہیں۔ وہاں کرسیاں پڑی ہوتی ہیں آرام سے بیٹھیں کپڑے مشین میں ڈال کر۔ گپیں لگائیں' کافی پئیں' اخبار پڑھیں۔"

"واہ......"

"اگلی دفعہ گئی تو آپ کو ساتھ لے جاؤں گی۔ وہاں کی فضا بھی دیکھ لیجئے گا۔"

"نہیں بھئی کیا دیکھنا تم نے بتایا مجھے پتہ چل گیا......"

بشرہ نے جلدی جلدی دو کپ چائے بنائی اور ہم ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگے۔

"سارہ جاگی تو نہیں۔"

"نہیں۔"

"نہلا کر سلاؤں تو بڑی دیر تک سوئی رہتی ہے۔"

"زیادہ آرام سے سوتی گندرخ کی وجہ سے ہے۔ تم نے غور نہیں کیا اب وہ سوتے میں روتی بھی کتنا کم ہے۔"

"ہاں نانی۔ یہ گندرخ بڑی اچھی چیز ہے۔ اچھا کیا جو آپ نے اسے گندرخ کروانے کی عادت ڈال دی۔"

پشاور کیا پورے صوبہ سرحد میں نوزائیدہ بچوں کو گندرخ کی جاتی ہے۔ ایک گز بھر کا چوڑا رومال لے کر اسے تکون بنا کر تہہ کر لیا جاتا ہے۔ پھر بچے کو نہلا دھلا کر ڈائپر وغیرہ لگا کر اس کے درمیان میں لٹا دیا جاتا ہے۔ یہ رومال اس کے کندھوں تک رکھا جاتا ہے۔ پھر نچلا کنارہ سیدھا لیٹے بچے کی ٹانگوں پر الٹ کر ایک کنارہ اس کے اوپر جسم پر لپیٹ کر دوسرا دوسری طرف سے لپیٹ دیا جاتا ہے۔ گندرخ کے لیے ایک یا ڈیڑھ انچ چوڑی اور کوئی ڈیڑھ دو گز لمبی پٹی ہوتی ہے جو کندھوں کے نیچے رکھ کر اوپر کی طرف سینے پر بل دے کر ٹانگوں اور پاؤں تک باندھ دی جاتی ہے۔ پاؤں کے قریب پٹی کے دونوں کناروں کو ٹائی کی طرح باندھ دیا جاتا ہے۔ بچے کے بازو اور ٹانگیں سیدھی رکھی جاتی ہیں۔ بچہ بڑا آرام محسوس کرتا ہے۔ اس طرح وہ سکون کی نیند سو جاتا ہے۔

سارہ بہت روتی تھی۔ میرے ذہن میں اسے گندرخ کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ میں نے اسے عام سے کپڑے کو تکون کر کے کپڑے ہی کی پٹی بنا کر باندھ دیا۔ وہ دو تین گھنٹے مسلسل سوئی رہی۔ رات کو بھی اسے گندرخ کر کے سلاتی۔ وہ اسی وقت روتی جب اسے بھوک لگتی یا ڈائپر گیلا ہوتا۔

"نانی آپ نے تو کمال کر دیا۔" بشرہ بچی کے آرام سے سونے پر بے حد خوش تھی۔

میں ایک دن بازار سے گندرخ کے رومالوں کے لیے فلالین اور پٹی بنانے کے لیے کپڑا لے آئی تھی۔ پشاور میں تو یہ پٹی بڑی پربت سے بنائی جاتی ہے۔ اس پر طلے کا کام

بھی کروایا جاتا ہے اور کمخواب بھی اوپر لگائی جاتی ہے۔ میں نے پٹی عام کپڑے کی بنائی تھی۔ ہاں اس پر گلابی ربن لگا کر اسے خوبصورت بنالیا تھا۔

سارے کام نپٹا کر بشرہ نے چائے بنائی۔ میں نے اس کے لانڈری سے لائے ہوئے کپڑے تہہ کر کے وارڈ روب میں رکھ دیے تھے۔ آج دن مصروف گزرا تھا۔ اس لیے اب ہم دونوں آرام سے چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہی تھیں۔ ٹی وی حسب معمول آن تھا لیکن ہم دیکھ نہیں رہی تھیں۔

آج دن بہت ٹھنڈا تھا۔ چونکہ گھر سنٹرلی ہیٹڈ تھا اس لیے سردی کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ہاں باہر آسمان دھندلا دھندلا تھا۔ بادلوں کے بوجھل ٹکڑے ادھر اُدھر تیرتے پھر رہے تھے۔ سورج اور نکھری ہوئی دھوپ تو جب سے میں آئی دیکھی نہ تھی۔ اکثر مطلع ابر آلود رہتا۔ کبھی کبھی پھیکی سی دھوپ نکل آتی 'لیکن آج موسم کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا تھا۔

ہم باتیں کر رہی تھیں کہ چھوٹی بہن نسیمی کا فون آ گیا۔ وہ بھی ابھی شمو کے گھر نہ گئی تھی۔ نیو یارک میں اپنی چھوٹی بیٹی حمیرا کے ہاں تھی۔

سلام کے بعد نسیمی نے چھوٹتے ہی کہا "برف پڑ رہی ہے۔ آپ کی طرف بھی پڑی ہے یا نہیں۔ ہائے کتنی خوبصورت لگ رہی ہے......"

"سچ۔"

"ہاں۔"

"بشرہ دیکھنا ذرا۔ یہ کھڑکی بلائنڈ ہٹا دو۔" میں نے بشرہ سے کہا۔ اس نے بلائنڈ ہٹائی۔ چوڑی کھڑکی کے صاف شیشے سے باہر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ برف یہاں بھی پڑ رہی تھی۔ بہت زیادہ نہیں معمولی سی لیکن منظر بڑا خوبصورت تھا۔

میں نسیمی سے بات ختم کر کے کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ اپارٹمنٹ کے سامنے والا گھاس قطع کہیں کہیں سے سفید ہو رہا تھا۔ برف برادے جیسی پھوار سے پڑ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کسی سفید شے کی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہو۔ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔

یہ موسم کی پہلی برفباری تھی۔

مجھے یاد ہے اس دن 11 دسمبر تھی۔

بلائنڈ ہٹی رہی۔ میں کچھ دیر بعد کھڑکی سے چائے کی پیالی پکڑے پکڑے ہٹی اور صوفے پر آ بیٹھی۔ شیشے کے باہر برفباری بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔ اب یہ گرنا کچھ تیز ہو گیا تھا کیونکہ سبزہ سفید ہوتا جا رہا تھا۔

برفباری کا منظر میں نے ایک دفعہ مری میں بھی دیکھا تھا۔ شاید دسمبر ہی کا مہینہ تھا۔ میں اور بٹ صاحب اپنی بیٹی رفعت اور اس کے میاں فرخ کے ساتھ مری گئے ہوئے تھے۔ ہم رات مال کے اوپر مرحبا ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ باہر کئی نوجوان جوڑے ہنی مون کے لیے آئے سردی کو انجوائے کر رہے تھے۔ کچھ بڑے لوگ بھی تھے اور چھوٹے بچے بھی۔ جب برف گرنا شروع ہوئی تو اک شور مچ گیا۔ نوجوان تو ناچنے لگے۔ ہلا گلا کرنے لگے۔ ہم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیا ہوا؟" بٹ صاحب نے ایک بیرے سے پوچھا۔

"صاحب موسم کی پہلی برفباری شروع ہوئی ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا۔ برف گر رہی ہے۔" ہم سب کھانا چھوڑ کر ہوٹل کے بڑے بڑے شیشوں والے دروازے کے پاس آ کر باہر دیکھنے لگے۔

تب وہاں برف پھوار کی طرح نہیں' برس رہی تھی۔ مجھے تو ایک لمحے کو یوں لگا جیسے کوئی کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اوپر سے نیچے گرا رہا ہے۔

لیکن

یہ کاغذ نہیں تھے۔

برف کے پتلے پتلے فلیکس تھے' جو جھوم جھوم کر فرش کی طرف آتے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ اس خوبصورت اور نیچر کے حسن کو انجوائے کرتے ہوئے نوجوان جوڑے' معمر آدمی' خواتین اور بچے خوب شور مچا مچا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ کچھ جوان لڑکے برفباری کی خوشی میں بھنگڑا ڈال رہے تھے۔

نیو جرسی میں جب برف کی پھوار گری تو چاروں طرف ایک ہُو کا عالم تھا۔ خاموشی

بھی لگتا تھا چپ ہو گئی ہے۔ صرف پاکستانیوں یعنی نسیمی اور ہم نے ہی اس گرتی برف کو انجوائے کیا تھا۔ پتہ نہیں بازاروں اور سٹوروں کے سامنے لوگ اس منظر کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں...... تو ہوں...... ادھران اپارٹمنٹس میں کوئی ہل جل نہ ہوئی تھی۔

ہماری طرف کچھ زیادہ برف نہ پڑی تھی لیکن نسیمی نے ایک گھنٹے بعد پھر فون کیا اور بتایا "اللہ سب کچھ سفید پڑ گیا ہے۔ گھر کے سامنے والا میدان تو بالکل برف سے ڈھک گیا ہے۔ یہاں تو سڑکوں سے برف ہٹانے والی گاڑیاں بھی آ گئی ہیں اور نمک چھڑکنے والی بھی......"

"نمک چھڑکنے والی کیا مطلب؟"

وہ بولی "آپا برف پڑتے ہی سڑکوں پر نمک چھڑکنا شروع کر دیا جاتا ہے اس سے برف شیشہ نہیں بنتی۔ ورنہ تیز رفتار گاڑیاں سلِڈ ہوتی رہیں۔ ایکسیڈنٹ ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے......"

"کیا خوب انتظام ہے۔"

"برف ہٹانے والی گاڑیاں بھی آ جاتی ہیں۔ جوں جوں برف گرتی ہے۔ یہ گاڑیاں سڑکوں پر سے برف اٹھا اٹھا کر سائیڈوں پر پھینکتی رہتی ہیں۔"

مجھے ان گاڑیوں کے متعلق بشرہ نے پوری طرح بتایا...... "ٹرک ہوتے ہیں جن کے آگے مٹی اٹھانے والے کرین کی طرح کا تختہ لگا ہوتا ہے۔ ٹرک آہستہ آہستہ چلتا جاتا ہے اور اس لو ہے کے تختے سے سڑک کی برف اٹھاتا ہے۔ جب تختہ بھر جاتا ہے تو سڑک کے کنارے برف پھینک کر پھر برف اٹھانے لگتا ہے۔ اس طرح نہ کریں تو ٹریفک بلاک ہو جائے۔ ساتھ ساتھ برف کی صفائی ہوتی رہتی ہے...... اور یہ بڑی سڑکوں ہی کی نہیں ہوتی۔ چھوٹی سڑکوں کی بھی ہوتی ہے۔"

"بے شمار گاڑیاں ہی ہوتی ہوں گی۔"

"بالکل......"

میں یہاں کے انظام سے پہلے ہی متاثر تھی۔ اب اور بھی ہو گئی۔

ہمارے ہاں تو میدانی علاقے ہیں۔ برف پڑتی نہیں' پہاڑوں پر ہی برفباری ہوتی ہے۔ جہاں جتنی برف پڑے جمی رہتی ہے۔ ہاں ایسے پہاڑی علاقے جہاں آمدورفت برفباری میں بھی جاری رہتی ہے۔ یعنی مری وغیرہ کی اہم سڑکوں پر بیلچوں اور کدالوں سے گاڑیوں کے آنے جانے کے لیے راستہ بنا دیا جاتا ہے۔ باقی علاقے اکثر ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں اور وہاں کے مقامی لوگ برفباری کے موسم میں اونچائی سے نچلے علاقوں میں آ جاتے ہیں۔

لیکن

یہاں

زندگی برفباری سے متاثر نہیں ہوتی۔

رواں دواں رہتی ہے

13 دسمبر کو پاکستان سے چھوٹی بہن گڈی اور بھابی رقیہ شمو کے ہاں پہنچ گئیں۔ کل رات شمو کے ہاں شادی کی شروعات تھیں۔ اس سلسلے میں ڈنر تھا۔ ہم لوگوں نے بھی کل ہی جانا تھا۔

اور

نسیمی' حمیرا وغیرہ بھی کل ہی آ رہی تھیں۔

برفباری سے ایک دم ہی ٹمپریچر خنکی میں چلا گیا تھا۔ جب تک برف پڑتی ہے اتنی ٹھنڈ نہیں ہوتی۔ لیکن جب برف پڑنے کے بعد ہوا چلے تو موسم بے حد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

لیکن یہاں چونکہ سردی روکنے کا معقول اور مؤثر انتظام ہے' اس لیے اتنی سردی کا احساس گھر سے باہر نکل کر ہی ہوتا ہے۔ پھر گاڑیوں میں بھی ہیٹر ہوتے ہیں۔ بس جتنی دیر گھر یا گاڑی سے باہر چلنا پھرنا ہو سخت ترین سردی کا احساس ہوتا ہے۔ ورنہ پتا ہی نہیں چلتا۔

اگلے دن ہم دونوں بازار گئے۔ پہلے سٹرن دیکھا پھر میسی۔ دونوں سٹور بہت ہی بڑے ہیں۔ سامان سے لدے یہ سٹور دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنا مال بکتا ہوگا؟ ان دنوں

سیل لگی ہوئی تھی۔ ہر چیز پر خاصا ڈسکاؤنٹ مل جاتا تھا۔ لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔ گرم کپڑوں کی تو بے حد ڈیمانڈ تھی۔ اتنی خریداری کے باوجود لگتا تھا سٹور کا کوئی کونا کھدرا بھی خالی نہیں ہوا۔ ایکڑوں پر پھیلے یہ سٹور سامان سے لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر عورتیں ہی کاؤنٹرز پر ہوتی ہیں جو بڑی مستعدی سے کام کرتی ہیں۔

میسی کے ایک حصے میں ہم کرسٹل کی چیزیں دیکھ رہے تھے کہ سامنے لگی ایک لسٹ پر بشرہ کی نظر پڑی۔

"دیکھیں نانی دیکھیں۔"

"کیا۔"

"یہ لسٹ!"

"دیکھ رہی ہوں۔"

"صرف دیکھ ہی رہی ہیں۔ یہ صائمہ کی لسٹ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"نانی یہاں یہ رواج ہے جس کی شادی ہو اسے دوستوں اور رشتہ داروں سے تحفے تو ملتے ہی ہیں۔ یہاں لوگ اپنی ضرورت کی چیزوں کی لسٹ بنا کر اپنے پسندیدہ سٹور میں دے دیتے ہیں۔ دوست احباب کو سٹور کا بتا دیا جاتا ہے۔ اب جس نے تحفہ دینا ہو وہ چیزوں کی لسٹ دیکھ کر اپنی حیثیت کے مطابق کوئی چیز خرید لیتا ہے۔ جو چیز خریدی جا چکی ہوتی ہے سٹور والے وہ آئٹم کاٹ دیتے ہیں۔ اس طرح لڑکی یا لڑکے کو ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ چیزوں کی ڈبلنگ نہیں ہوتی۔ جیسا اکثر ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ تحفے میں لیمپ آ رہے ہیں تو لیمپ ہی اکٹھے ہو گئے ہیں۔ گھڑیاں ہیں تو وہی تحائف میں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ جوڑے ہیں تو وہ بے حساب آ گئے۔ اس طرح لسٹ دینے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ایک ایک چیز ہی مل جاتی ہے اور وہ بھی لڑکی یا لڑکے کی ضرورت کی۔"

"اچھا رواج۔ واقعی شادیوں پر اکثر بے مصرف چیزیں ہی تحائف کی صورت میں ہمارے ہاں اکٹھی ہو جاتی ہیں......"

"اب میں نے بھی صائمہ کے لیے تحفہ خریدنا ہے۔ اس لسٹ میں دیکھ لیتی ہوں کہ کونسی چیز میں لے سکتی ہوں......"

"کتنے تک کی لو گی۔ یہ بھی تو دیکھنا ہو گا......"

"زیادہ سے زیادہ سو ڈالر تک کا تحفہ میں نے لینا ہے۔ کافی ہے نا نانی......"

میں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"سو ڈالر تک دیکھتی ہوں اس لسٹ میں کونسی چیز ہے۔"

ہم دونوں آگے بڑھ کر لسٹ دیکھنے لگیں۔

خاصی لمبی لسٹ تھی جس میں زیادہ تر کچن کی چیزیں تھیں۔ قیمتی بھی تھیں اور عام بھی۔ مثلاً ڈنر سیٹ' آئس کریم مشین' رائس ککر' کٹلری سیٹ' چھریوں کا سیٹ' چوپر' فوڈ فیکٹری' گلاس' شیشے کے ڈھکنے والی دیگچیاں' نان سٹک فرائنگ پین غرضیکہ تقریباً کچن کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ کچھ وازز اور ڈیکوریشن پیسز بھی تھے۔

کچھ چیزوں پر کراس کے نشان لگ چکے تھے۔ یعنی خریدی جا چکی تھیں۔ کچھ باقی تھیں۔ بشرہ وہی چیزیں دیکھنے لگی۔

سٹور میں کام کرنے والی خواتین گاہکوں کو چیزیں دکھانے میں بڑی مدد کرتی ہیں۔ ان کا رویہ دوستانہ ہوتا ہے۔ چیز خریدیں نہ خریدیں۔ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ آپ کو ہر چیز دکھانے میں مدد کریں گی۔

بشرہ نے کافی چیزیں دیکھیں۔ پھر اسے ایک کرسٹل کا خوبصورت سا باؤل پسند آیا۔

"یہ ٹھیک رہے گا نانی۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بہت خوبصورت ہے۔"

"پرائس بھی موزوں ہے۔"

"کتنے کا ہے۔"

اس نے باؤل کے پیندے پر لگی چھوٹی سی چٹ دیکھی "ایک سو دس ڈالر کا ہے۔ لے لیتی ہوں۔"

"لے لو۔"

وہ پیالہ کاؤنٹر پر لے گئی اور میں سارہ کی کیری کاٹ اٹھائے اِدھر اُدھر پھرنے لگی اور مختلف چیزیں دیکھنے لگی۔ کافی لوگ سٹور میں خریداری کر رہے تھے۔ جرسیاں اور جیکٹس لوگ اپنے ساتھ لگا لگا کر دیکھ رہے تھے۔ جس کا سائز فٹ کر کے دیکھنا ہوتا وہ جرسی' جیکٹ اور پینٹ وغیرہ لے کر کونے میں بنے چھوٹے سے ٹرائی روم میں چلا جاتا۔ کپڑے کے سٹوروں میں ٹرائی روم ضرور ہوتے ہیں۔ جہاں لوگ کپڑے پہن کر دیکھتے ہیں۔

امریکہ میں سٹوروں کے سلسلے ہر جگہ پھیلے ہیں۔ یعنی Chain of Stores ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے ناموں کے سٹور تو پورے امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سب جگہ ایک جیسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

کچھ چھوٹے سٹوروں کے بھی ایسے ہی سلسلے ہیں۔ سیون الیون جیسے چھوٹے چھوٹے سٹور عام ہیں۔ سڑکوں کے کنارے فوری ضرورت کی ہر چیز یہاں سے مل جاتی ہے۔ سیون الیون کا Chain بھی پورے امریکہ میں پھیلا ہوا ہے اور ہر شہر کی تقریباً ہر بڑی سڑک پر یہ سٹور موجود ہے۔ اکثر یہ سٹور پاکستانی اور ہندوستانی بھی چلا رہے ہیں۔

لیکن زیادہ تر بڑے سٹور یہودیوں کے ہیں۔

امریکہ پہنچ کر مجھے خدشہ تھا کہ زبان کی پرابلم ہوگی۔ میں انگریزی سمجھ تو لیتی تھی چھوٹے موٹے جملے بھی کبھی کبھار بول لیا کرتی تھی۔ ہم لوگوں نے انگریزوں سے انگریزی پڑھی اور سیکھی تھی۔ انگریز چلے گئے تو انگریزی بولنے کی بھی ضرورت نہ رہی۔ نئی نسل یا فیشن ایبل لوگ ضرورت کے تحت نہیں' احساس برتری دلانے کے لیے انگریزی بولتے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی۔ کچھ انگریزوں کا لہجہ بھی امریکنوں سے بالکل مختلف ہے۔ گول مول کر کے انگریزی بولتے ہیں۔ جسے سمجھنے کے لیے بھی غور سے سننا پڑتا ہے۔ اس لیے پہلے پہلے تو میں خاصی دشواری سے دوچار رہی۔ بشرہ ساتھ ہوتی تھی اس لیے میں زیادہ ہی کانشس ہو جاتی۔ جو جملہ بول سکتی وہ بھی نہ بولتی۔

"نانی۔ آپ تو یوں ظاہر کرتی ہیں جیسے انگریزی سے بالکل ہی نابلد ہوں۔"

"ہوں نا۔"

"نہیں۔ آپ کوشش کریں۔ بولا کریں ان لوگوں سے انگریزی۔ غلط ملط سہی۔ یہ لوگ مذاق نہیں اڑاتے بلکہ تعریف کرتے ہیں۔"

"ہوں۔"

"ہماری ایک دوست ہیں۔ ان کی امی پاکستان سے آئی تھیں۔ وہ تو پڑھی لکھی بھی نہ تھیں۔ اردو بھی ڈھنگ سے نہ بول سکتی تھیں۔ لیکن کمال ہے نانی' مہینے دو ہی میں وہ انگریزی نہ صرف سیکھ گئیں بلکہ بولنے بھی لگیں۔ غلط ٹھیک۔ بس بلا جھجک بولے جاتیں۔"

"اصلی بات جھجک ہی کی ہے بشرہ...... خیر مہینے دو بعد شاید میں بھی بولنے لگوں۔ پکی بات جھجک ان لوگوں سے نہیں آتی۔"

"تو۔"

"تم سے اور فاران سے آتی ہے......"

میری بات پر بشرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں جب اِدھر اُدھر ہوتی ہوں تو آپ ان عورتوں سے بلا جھجک بات کیا کریں اور فاران تو کبھی کبھی ہمارے ساتھ آتے ہیں۔ آپ جھجک چھوڑیں نانی......"

"بہت اچھا......"

ہم باتیں کرتیں کاؤنٹر تک پہنچ گئیں۔ کاؤنٹر پر بھی رش ہو تو لائن لگ جاتی ہے۔ مجال ہے جو کوئی لائن توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ ہمارے ہاں کے لوگ بھی ان اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ لائن میں لگ کر صبر سے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔

کاؤنٹرز پر کھڑی چاک و چوبند لڑکیاں اور عورتیں بڑی مستعدی سے کمپیوٹر پر خریداری کی لسٹیں بناتی اور قیمتیں لگاتی ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ گاہکوں کو آرام اور سہولت سے جلدی جلدی فارغ کریں۔

بشرہ نے باؤل خوبصورت ریپرنگ پیپر میں گفٹ پیک کروایا۔ ربن سے اس پر نانی بھی بنوا کر لگوائی۔

''اچھا ہے نا۔'' اس نے پیک شدہ گفٹ مجھے دکھایا۔

''بہت اچھا۔'' میں نے کہا۔

''صائمہ کی لسٹ میں باؤل تو نہیں تھا۔ پر میں نے خرید لیا۔''

''کیا ہوا۔'' میں نے کہا'' صائمہ کی لسٹ میں تو وہ چیزیں بھی نہیں ہیں جو میں لائی ہوں یا گڈی نے میرے ساتھ خریدی تھیں......''

''پھر تو ٹھیک ہے۔ آج میرے خیال میں جو تقریب شمو خالہ کے ہاں ہے۔ وہ برائیڈل شاور ہی ہے۔''

''برائیڈل شاور؟''

''ہاں نانی۔ آج پارٹی ہوگی اور جس نے جو گفٹ دینا ہوگا وہ لے آئے گا۔''

''اسے برائیڈل شاور کہتے ہیں۔''

''جی...... شادی سے کچھ دن پہلے یہ تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ ویسے تو یہ امریکنوں کی رسم ہے لیکن یہاں بھی لوگ کرتے ہیں۔ اسی طرح بے بی شاور بھی ہوتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''جس کے ہاں بچہ ہونے والا ہوتا ہے۔ اس کے دوست عزیز اسی طرح بچے کے لیے گفٹ لاتے ہیں۔ اکثر کوئی قریبی دوست اس بات کا اہتمام کرتا ہے۔ آنے والے بے بی کے والدین کو سرپرائز دیا جاتا ہے۔ وہی پارٹی کا اہتمام کرتے ہیں۔ دوستوں کو مطلع کرتے ہیں۔ چیزوں کی فہرست بناتے ہیں۔ پھر جس نے جو چیز دینی ہو لے لیتا ہے۔''

''ہوں۔''

''ہمارے دوستوں نے بھی میرے لیے یہ تقریب منعقد کی تھی۔ عام طور پر ساتویں مہینے یہ تقریب مناتے ہیں۔ فاران کے قریبی دوست اور اس کی بیوی نے سارا

بندوبست کیا تھا۔ سارہ کے بے بی شاور کا۔''

''اچھا؟''

''ہاں نانی' بڑی سہولت بھی ہوتی ہے اور مزہ بھی آتا ہے۔ سارہ کے جو یہ ڈھیر سارے کھلونے ہیں' جالی کی فراکوں والی کاٹ ہے' رنگین جھولا ہے' خوبصورت فراک ہیں' پرام ہے سب ان دوستوں ہی نے دیئے تھے۔''

''اچھی رسم ہے۔ ہمارے ہاں بھی کبھی ہوا کرتی تھی۔ اسے گود بھرائی کہتے تھے۔ رسم منانے کے انداز میں کچھ فرق ہے۔ ویسے مقصد ایک ہی ہے۔''

''جی۔''

''انداز کا یہ فرق ہے کہ گود بھرائی میں ہونے والے بچے کی ماں کو دلہن بنایا جاتا ہے۔ پھر جھولی پھل' مٹھائی اور خشک میوے سے بھری جاتی ہے۔''

''پیسے اور چیزیں بھی تو دی جاتی ہیں۔''

''ہاں۔''

''وہ تو ہے۔ یہاں بچے کی ہونے والی ماں کیک کاٹ کر رسم کا افتتاح کرتی ہے۔ جھولی میں کچھ نہیں ڈالا جاتا۔ میرے پاس سارہ کے بے بی شاور کی تصویریں ہیں۔ دکھاؤں گی آپ کو۔''

ہم سٹور سے باہر نکل آئیں۔ میں نے سارہ کی پرام سنبھالی اور بشرہ گاڑی لینے چلی گئی۔

امریکہ میں بچے کو گاڑی میں اکیلا چھوڑنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ بچہ خواہ سویا ہو۔ گاڑی میں چھوڑ کر ماں شاپنگ کے لیے نہیں جاسکتی۔ اگر ایسا کبھی ہو تو پولیس بچہ لے جاتی ہے اور ماں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ ماں کو سزا ہوجاتی ہے اور بچہ پولیس کسی نرسنگ ہوم میں چھوڑ دیتی ہے۔ عام طور پر کوئی ماں یہ لاپروائی نہیں کرتی۔ کیونکہ سزا اتنی سخت ہے اور یہ دی بھی جاتی ہے۔

بشرہ گاڑی لے آئی۔ تھوڑی بہت جو خریداری کی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر

رکھی۔ سارہ کو سیٹ بیلٹ سے باندھا۔ پرام ڈگی میں رکھی۔

اور

پھر میں بھی بیٹھ گئی۔

''نانی۔'' وہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ بیلٹ لگانا کیوں بھول جاتی ہیں۔ جرمانہ کروا کے رہیں گی۔''

''اوہ...... دراصل عادت نہیں نا......''

''عادت ڈالیں۔ آپ نے ابھی کچھ ماہ یہاں ہی رہنا ہے۔''

''لو جی......'' میں نے بیلٹ باندھ لی۔

''ٹھیک۔''

''اب؟''

''تھوڑی سی گروسری لینی ہے۔ گھر کے قریب ہی مارکیٹ ہے۔''

''چلیں لے لیں گے۔ میں مارکیٹ بھی دیکھ لوں گی......''

بشرہ نے گاڑی سٹارٹ کی...... پھر وہاں سے نکال کر مین سڑک پر لے آئی۔

اب ہم رنگر روڈ کی طرف جا رہے تھے۔

اسکیلباوے کی مارکیٹ بہت زیادہ بڑی تو نہ تھی۔ لیکن یہاں گروسری کی ہر چیز موجود تھی۔

یہاں بھی وہی صفائی' وہی ترتیب و تنظیم' مختلف چیزوں کے لیے مختلف مخصوص حصے' ریکس پر رکھی چیزیں' ایک طرف سبزی کا پورشن' ساتھ ہی پھلوں کے ریک' پچھلے حصے میں گوشت مرغی' مچھلی' پورک وغیرہ...... کاؤنٹروں پر کمپیوٹروں کے سامنے تیزی سے گاہکوں کو نپٹانے والی لڑکیاں۔ چہل پہل رونق لیکن شور نہ شرابا۔ اپنی اپنی ٹوکری اٹھائی یا ٹرالی پکڑی۔ مختلف حصوں میں گھوم پھر کر اپنی ضرورت کی چیزیں نکال کر ان میں رکھیں اور پھر کاؤنٹر پر آ کر چیزیں نکال کر سیل گرل کے سامنے رکھیں۔ بل بنا' قیمت ادا کی اور چیزیں لے کر باہر کو چل دیے۔ باری کا انتظار قطار میں لگ کر یہاں بھی کیا جاتا ہے۔

بشرہ نے چند چیزیں لینا تھیں۔ وہ جلدی ہی چیزیں لے کر کاؤنٹر پر آ گئی۔ یہاں چار کاؤنٹر تھے۔ اس لیے گاہکوں کو زیادہ دیر بل لینے اور قیمت دینے میں نہیں لگ رہی تھی۔

ہم شاپنگ کر کے واپس گاڑی کی طرف لوٹ آئے۔

اور پھر چند منٹ میں گھر پہنچ گئے۔

اگلے دن ہم نے شمیم کے ہاں جانا تھا۔ صائمہ کی شادی کے سلسلے کی پہلی تقریب بھی تھی۔ اسے برائیڈل شاور بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہت سے قریبی عزیز اور شمیم کے دوست مدعو تھے۔

میں نے رات ہی اپنا سامان سمیٹ کر سوٹ کیسوں میں ڈال دیا۔ اب میں نے باقی دن شمیم کے ہاں ہی رہنا تھا۔

''توبہ نانی۔'' بشرہ مجھے سامان اکٹھا کرتے دیکھ کر بولی'' آپ تو اپنی ایک ایک چیز لے جا رہی ہیں۔ جیسے پھر یہاں کبھی آنا ہی نہیں۔ فکر نہ کریں ہم آپ کو یہاں لاتے رہیں گے۔''

''ضرور آیا کروں گی...... دیکھو کچھ کپڑے اور چیزیں بیگ میں ڈال کر یہیں چھوڑ رہی ہوں۔''

''گڈ۔''

''میں بھی آتی رہوں گی۔ نسیم خالہ' گڈی خالہ اور مامی بھی وہاں ہوں گی۔ گپ شپ کا مزہ آئے گا۔ ہائے بالکل پاکستان کا ماحول لگے گا۔ ہیں نا نانی۔''

''بالکل...... خالد ماموں بھی آ جائیں گے۔'' میں نے اپنے چھوٹے بھائی بریگیڈیئر خالد کا اسے بتایا۔

''وہ آ رہے ہیں۔''

''ہاں۔''

''واہ جی واہ......''

''سعدیہ اور عاطف بھی پہنچ رہے ہیں۔'' میں نے اپنے بھائی منظور کی بہو اور بیٹے کا اسے بتایا۔

''سچ؟''

''بالکل۔''

''تب تو خوب رونق ہوگی صائمہ کی شادی میں۔ یہاں بھی کافی رشتے دار ہیں۔ سب اکٹھے ہوں گے۔''

''ظاہر ہے شمو نے سب کو بلایا ہوگا۔ ویسے بشرہ کل ہم جائیں گے کس وقت۔''

''فاران دفتر سے آئیں گے تب۔''

''شام کو۔''

''جی ہاں۔ فاران بھی تو مدعو ہیں۔''

''شمو کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے۔''

''کوئی پینتالیس منٹ کی ڈرائیو ہے زیادہ دور نہیں۔''

''پینتالیس منٹ کی ڈرائیو؟ اور...... زیادہ دور نہیں۔''

''یہاں اتنا فاصلہ دور نہیں گنا جاتا۔ حمیرا نیویارک سے آئے گی۔ اس کے گھر سے شمو خالہ کے گھر تک سوا دو گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ اور اگر صائمہ بھی آئی'' اس نے میرے دیور اصغر کی بیٹی کا کہا ''تو وہ کم از کم تین گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد پہنچے گی۔ اس طرح ہمارے گھر سے شمیم خالہ کا گھر نزدیک ہی ہوا ناں۔''

''واقعی!''

اگلی شام ہم شمیم کے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ باتوں باتوں میں پینتالیس منٹ گزر گئے۔

''یہ ہائی سکول ہے نانی۔'' بشرہ نے آخری سڑک پر مڑنے سے پہلے مجھے بتایا ''ساتھ ہی بہت بڑی لائبریری ہے۔''

میں نے بہت بڑی لال چھتوں والی بلڈنگ پر نگاہ ڈالی۔ بڑے بڑے سرسبز لان جن میں جانے آنے کے لیے فٹ پاتھ بنے تھے۔ گھنے درخت۔ بعض پتوں سے لدے اور بعض ننگی شاخوں والے۔ یہ ننگی شاخوں والے درخت مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ ان میں مجھے جو حسن دکھائی دیتا ہے وہ پتوں اور پھولوں سے لدے درختوں میں بھی نظر نہیں آتا...... میں ان کی خوبصورتی سے ہمیشہ سے ہی مسحور ہو جاتی ہوں۔ میں سڑک مڑنے کے بعد بھی گردن موڑ موڑ کر گاڑی کے پچھلے شیشے سے ان ننگ دھڑنگ کالی کالی پھیلی پھیلی موٹی پتلی شاخوں والے درختوں کو دیکھتی رہی۔



"لیں جی آ گیا شمو خالہ کا گھر۔" فاران نے مین دروازے کی طرف جانے والی پتلی سڑک پر گاڑی آہستگی سے لے جاتے ہوئے کہا۔

میرا دل خوشی سے بے اختیارانہ دھڑک اٹھا۔ میں شمیم کے گھر کے سامنے تھی۔ شمیم میری بہن! جو دیارِ غیر میں بس چکی تھی اور جسے برسوں بعد ہی ملنا ہوتا تھا۔ آج میں اس کے گھر زندگی میں پہلی بار جا رہی تھی۔

شمیم کا خوبصورت اور بہت ہی بڑا گھر چوڑی سڑک سے کافی ہٹ کر تھا۔ گھر کے اردگرد بہت بڑے بڑے سرسبز لان تھے۔ جن میں جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں بنی تھیں۔ بڑے دلکش طریق سے ان کیاریوں کو رنگدار پھولوں سے سجایا ہوا تھا۔ پھول سردی کی وجہ سے کم تھے۔ لیکن جتنے بھی تھے بہار دکھا رہے تھے۔ میں نے گاڑی سے اتر کر ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ جہاں تک نگاہ گئی بڑے بڑے گھر ہی نظر آئے جو چاروں طرف سے سبزے سے ڈھکے تھے۔

"یہاں تقریباً سارے گھر بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ہیں۔" بشرہ نے میرے برابر آتے ہوئے کہا...... "دور تک یہی چوڑی سڑک جاتی ہے اور اسی طرح کے بڑے بڑے گھر بنے ہوئے ہیں......"

امریکہ میں اپارٹمنٹس ہوں' چھوٹے بنگلے ہوں یا بے انتہا بڑے گھر۔ باؤنڈری وال یا آہنی گیٹ کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا۔ گھر کا مین دروازہ ہی ہوتا ہے جس تک پہنچنے کے لیے فٹ پاتھ یا سڑک بنی ہوتی ہے۔ شمیم کے گھر تک آنے کے لیے نیم دائرے میں

پتھروں کی ہموار سڑک بنی ہوئی تھی۔ یہاں کئی گاڑیاں پارک ہو سکتی تھیں۔

صدر دروازہ چوڑا اور اونچا تھا۔ جس تک پہنچنے کے لیے تین چار سٹیپ چڑھنا پڑتا تھا۔ دروازے کے پٹ خوبصورتی سے تراشی ہوئی لکڑی اور لکڑی ہی کے پھولوں سے بنے ہوئے تھے۔

فاران نے میرے سوٹ کیس اور دیگر سامان گاڑی سے نکالا۔ دو تین گاڑیاں پہلے سے وہاں کھڑی تھیں۔ لگتا تھا کچھ لوگ آ چکے ہیں۔

بشرہ نے آگے جا کر کال بیل دبائی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔

"آپا...... آپا آ گئیں......" یہ شمیم سے چھوٹی بہن نسیم تھی جو مجھے دیکھ کر فرطِ مسرت سے چلائی۔

میرے آگے بڑھنے تک اس کی آواز سن کر گڈی ماں' شمیم کا بیٹا آصف' صائمہ اور شمیم بھی ادھر آ چکے تھے۔ سب پر مسرت آوازوں میں آپا آپا کہہ کر استقبال کر رہے تھے۔

میں سب سے پہلے صائمہ سے ملی۔ اسے پیار کیا' گلے لگایا' شادی مبارک کہا۔ پھر آصف' شمیم اور دوسرے لوگوں سے ملتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بشرہ بھی سب سے مل رہی تھی اور فاران سب کو سلام کرتے میرے سوٹ کیس ادھر لا رہے تھے۔ ان سے ایک سوٹ کیس آصف نے پکڑ لیا۔

ہم ریسیپشن سے ہوتے ہوئے اندر لاؤنج میں آ گئے۔ ابھی تک علیک سلیک اور احوال پرسی ہی ہو رہی تھی۔ ہم سب بے حد خوش تھے۔

جب خوشی کے اظہار کا پرمسرت ہنگامہ قدرے کم ہوا۔ تو ہم سب صوفوں پر بیٹھ گئے...... آصف کی بیوی نسیم کی بیٹی اور شمیم کی بہو یعنی آمنہ چند لمحوں بعد آئی' مجھے ملتے ہوئے بولی' "سوری رضیہ خالہ...... میں نہانے چلی گئی ہوئی تھی۔ کام سے فارغ ہو کر تیار ہونا تھا......"

"بھئی بہت بہت مبارک ہو۔ بھائی ہو' نندرانی کی شادی ہے' کام تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔"

آمنہ شمیم کی طرف دیکھ کر مسکرائی "سارا کام تو انہوں نے کیا ہے کھانے پکانے کا میں نے تو تھوڑی ہیلپ کی ہے......"

"سارے کھانے انہوں نے خود ہی تیار کیے ہیں۔" گڈی بولی "ہم تو ابھی جیٹ لیگ ہی سے نہیں نکل رہے...... میں تو سارا دن سوئی رہی۔ تھوڑی دیر ہوئی جو آنکھ کھلی۔ یوں لگا ابھی دن چڑھا ہے......"

"بھئی تم لوگ فکر نہ کرو۔ میں مہمان سے کوئی کام نہیں لوں گی۔ کھانے بنانا میرا ذمہ...... میں نے چھٹی لے لی ہے ہوٹل سے۔"

"کیوں تمہارا ذمہ!" رقیہ بھابی بولی۔ رقیہ نے جب شمیم امریکہ آئی تھی اس کے دونوں بچوں کو دو ڈھائی سال پشاور میں اپنے پاس رکھا تھا۔ اس کی اپنی اولاد چونکہ نہیں تھی اس لیے ان دونوں کو ماں ہی کی طرح پالا تھا۔ اس لیے اس نے کہا...... "صائمہ میری بیٹی بھی تو ہے۔ اس کی شادی کا کچن کا کام میں خود کروں گی۔"

رقیہ بھابی کھانے پکانے کی ماہر ہے۔ واحد اور رقیہ چونکہ امی اور اباجی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اس لیے شروع ہی سے کچن کا کام رقیہ کیا کرتی۔ نندوں کی نندیں آ جائیں' دیور دیورانیاں ہوں...... کھانا پکانا اسی کا کام ہوتا۔ ہم دس بہن بھائی تھے۔ جب سارے اکٹھے ہوتے تو ماشاءاللہ گھر بھر جاتا۔ سب کو بھگتنا رقیہ کا کام ہوتا۔ ہنسی خوشی سب کچھ کرتی۔ مجال ہے جو کبھی ماتھے پر بل بھی آئے کہ اتنے لوگوں کا بوجھ میں اکیلی کیوں اٹھاؤں۔ گو ساتھ کام کرنے کو نوکرانیاں ہوتیں لیکن ذمہ داری اسی کی ہوتی...... باقی ہم سب لوگ تو جیسے پکنک منانے کو اکٹھے ہوتے۔

یہاں

امریکہ میں کچن کے لیے نوکر نوکرانیاں تو تھیں نہیں۔ سب کچھ خود ہی کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے جب رقیہ نے کام کا ذمہ لینے کی بات کی تو شیمو ہنس کر بولی "بھابی یہاں نوکرانیاں نہیں ہیں۔ سب کچھ خود ہی کرنا پڑتا ہے۔"

"کیا ہوا۔" نسیمی بولی "ہم بھابی کی مدد کیا کریں گے......"

ہنسی مذاق اور باتیں ہوتی رہیں۔ فاران بھی اندر آ چکے تھے۔ وہ اور آصف ساتھ ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور بھی بہت سے مہمان آ چکے تھے۔ حمیرا اور صائمہ نیویارک سے پہنچ چکی تھیں۔ شیمو اٹھ کر جا چکی تھی۔ مہمان مرد ایک طرف' عورتیں دوسری طرف مجمع لگائے گپ شپ لگانے میں مصروف تھیں۔

"آئیں جی چائے پی لیں......" کوئی نصف گھنٹے بعد شمیم نے کہا۔

سب باری باری اٹھے اور لیونگ روم کے ساتھ ہی اس کے بڑے سے لمبے چوڑے کچن میں آ گئے۔ جس کے ایک طرف میز پر چائے کے لوازمات اور پلیٹیں پڑی تھیں۔ پلیٹیں گتے کی ڈسپوزیبل تھیں۔ چمچ بھی پلاسٹک کے ڈسپوزیبل تھے۔ میں نے میز پر نگاہ ڈالی۔

دہی بھلے

سموسے

رس گلے

گاجر کا حلوہ

تلی ہوئی مونگ پھلی

فروٹ چاٹ

جانے کتنی چیزیں تھیں اور کمال کی بات یہ کہ سب کچھ شیمو نے خود ہی بنایا ہوا تھا۔

سب اپنی اپنی پلیٹوں میں چیزیں ڈال کر کھانے میں مشغول تھے۔ چیزیں بہت مزے کی تھیں۔ اس لیے شیمو کی خوب خوب تعریفیں ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹری اور کھانا پکانا دو الگ الگ شعبے تھے لیکن شیمو دونوں شعبوں ہی میں ماہر ہو چکی تھی۔

چائے پی کر سب پھر لیونگ روم میں آ بیٹھے۔ اب سب نے اپنے اپنے تحفے صائمہ کو دینے تھے۔ صائمہ درمیانی چرمی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے بڑی سی شیشے کی میز پر سب گفٹ رکھنے لگے۔ صائمہ ہر چیز بڑے پیار سے وصول کرتے ہوئے شکریہ ادا کر رہی تھی۔ اس نے ہر گفٹ کو سراہا۔ تعریف کی اور لانے والے کا شکریہ ادا کیا۔ گفٹ پیک

کئے ہوئے تھے۔ شمیم کے کہنے پر اس نے گفٹ کھولے۔ اب تو وہ بے حد خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کی سٹور میں ٹنگی لسٹ کی تقریباً ساری چیزیں آ گئی تھیں۔ پاکستان سے ہم لوگ اس کے لیے جو گفٹ بھی لے کر گئے تھے۔ اس کے نئے گھر میں کار آمد تھے۔

صائمہ جیولری نہیں پہنتی۔ سونے کی چیزیں تو اس نے کبھی بھی نہیں پہنی تھیں لیکن پاکستان سے اس کے لیے جو بھی جیولری لے کر آیا اس نے خوشی سے لی اور شکریہ ادا کیا۔

صائمہ کوئی پونے چار سال کی تھی۔ جب وہ امریکہ گئی تھی۔ اس نے امریکن معاشرے میں ہوش سنبھالا۔ پلی بڑھی۔ ایجوکیشن لی۔ اس لیے اس پر امریکی رنگ غالب ہے۔ وہ مغربی لباس پہنتی ہے۔ زبان بھی روانی سے انگلش ہی بولتی ہے۔ اس کا لہجہ بالکل امریکنوں جیسا ہے۔ اس کے خیالات اور رجحانات امریکنوں جیسے ہیں۔ وہ اردو بولتی تو ہے لیکن روانی سے نہیں۔ کئی الفاظ اس کی زبان پر نہیں آتے۔ انگریزی اردو گڈمڈ بول کر اپنا مفہوم سمجھا لیتی ہے۔ وہ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ جاب کرتی ہے اور وہاں کے معاشرے کے مطابق اپنی تنخواہ سے اپنے اخراجات پورے کرتی ہے۔ مسلمان اس لیے ہے کہ وہ مسلم خاندان میں پیدا ہوئی۔ مذہب کے متعلق اسے کچھ زیادہ علم نہیں۔

اس کا بھائی آصف اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ امریکن معاشرے میں پلنے بڑھنے کے باوجود اس معاشرے کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح واقف ہے۔ پاکستان اسے بہت پسند ہے۔ وہ یہاں آ کر رہنا بھی چاہتا تھا' لیکن حالات موافقت میں نہ ملے۔ وہ بھی مذہب کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا' لیکن مذہب سے بیگانہ نہیں۔ پکا مسلم ہے اور وہاں رہتے ہوئے بھی مسلم اقدار سے منحرف نہیں ہونا چاہتا۔ وہ اور اس کی بیوی آمنہ اپنی بچی سلینہ کی اٹھان صحیح مسلم لڑکی کی طرح کرنا چاہتے ہیں۔

خیر

آج سے صائمہ کی شادی کی تقریبات شروع تھیں۔ اس کی شادی پاکستانی طرز پہ ہو رہی تھی۔ شمیم ساری رسمیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے تو اپنی کسی دوست کے ہاں سے ڈھولک بھی منگوائی تھی۔

تحائف اٹھا لیے گئے تو بشرہ' حمیرا' صائمہ اور دو ایک اور لڑکیاں ڈھولک لے کر لاؤنج کے درمیان بیٹھ گئیں۔ حمیرا کو ڈھولک بجانا آتی تھی۔ بشرہ بھی بجا لیتی تھی۔

ہم بڑے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ ڈھولک کی تھاپ کے سنگ تالیاں بھی بجا رہے تھے اور سہاگ گیت جو لڑکیاں گا رہی تھیں۔ وہ ہم بھی گا رہے تھے۔

ڈھولک بجانے کے بعد لڑکیوں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور بہت بڑے اسپیکر پر پنجابی کی کیسٹ لگا دی۔ ان دنوں دلیر مہدی کی چانک چانک ڈانس اور بھنگڑے کے لیے بہت مقبول تھی۔ یہ کیسٹ شروع ہوئی تو حمیرا' بشرہ اور آمنہ اٹھ کر بھنگڑا ڈالنے لگیں۔ پھر تو سب کو جوش آ گیا۔ ہر کوئی میدان میں آ گیا۔ کافی ہلا گلا اور شور شرابہ مچا رہا...... صائمہ کی ایک امریکن دوست آئی ہوئی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر ان لڑکیوں کے ساتھ ناچنے لگی۔ ان کو دیکھتی جاتی اور اسی طرح بھنگڑا ڈالنے اور ناچنے کی کوشش کرتی۔ سب اسے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ دلیر مہدی کا پنجابی گیت "ساڈے نال رہو گے تے عیش کرو گے۔" تو اسے کیا سمجھ آتا۔ ہاں موسیقی کی جو اپنی زبان ہے وہ اسے بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

امریکن لڑکی سینڈی سمیت سب ہلا گلا کرتے رہے۔ کبھی کیسٹ پر ڈانس ہوتا۔ کبھی ڈھولک پر تھاپ پڑتی۔

یوں رات کے بارہ بج گئے۔ رات کا کھانا بھی اسی ہلا گلا میں سب نے اٹھتے بیٹھتے کھا لیا۔ یہ محفل برخاست کرنے کو تو کسی کا جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن کچھ مہمانوں نے دور جانا تھا۔ اس لیے گانا بجانا ختم ہوا۔ ایک ایک کر کے سب مہمان رخصت ہونے لگے۔ حمیرا اور صائمہ نسیم نے نیویارک جانا تھا۔ بشرہ نے بھی پینتالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد گھر پہنچنا تھا۔ جی تو ان میں سے کسی کا جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ لیکن ان کے میاں لوگ اب جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ صائمہ اور حمیرا کے گھر تو تقریباً تین گھنٹے کی ڈرائیو پر تھے۔ اس لیے صائمہ کا میاں نسیم اور حمیرا کا میاں نوفل اب گاڑیوں کی چابیاں گھما رہے تھے۔ یہی حال فاران کا تھا۔ ہم ان سب کو رخصت کرنے ریسیپشن میں آ گئے۔ باہر بلا کی سردی تھی۔ صائمہ کا بیٹا حسان اور بیٹی شفا تو دس اور آٹھ سال کے تھے۔ گرم کپڑے بھی پہن رکھے تھے۔ حمیرا کی بیٹی انوش ایک سال کی

تھی اور بشریٰ کی تو بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے ان دونوں کو انہوں نے کمبلوں میں لپیٹ لیا تھا۔ گاڑیاں دروازے پر ہی کھڑی تھیں۔ ٹھنڈ صرف دروازے سے نکلنے اور گاڑی میں بیٹھنے تک ہی اثر انداز ہو سکتی تھی۔ گاڑیوں کے ہیٹر آن ہو چکے تھے۔

"کل پھر آنا۔" شمو نے ان تینوں سے کہا۔

"ضرور شمو خالہ۔" "اب تو شادی تک ہم روز ہی آیا کریں گے۔ شرط یہ ہے کہ آپ اسی طرح کی چائے اور کھانا ضرور کھلایا کریں......"

"اس کی فکر نہ کرو۔" رقیہ بولی۔

کچھ دیر ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر گڈی جواب تک چپ کھڑی تھی حمیرا سے بولی "ایک بات تو بتاؤ حمیرا......"

"کیا؟" حمیرا جلدی سے بولی۔

"جب سے تم آئی ہو میں دیکھ رہی ہوں۔" گڈی بولی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں۔" حمیرا قدرے متعجب ہو کر بولی۔

"بھئی آج کل پاکستان میں لڑکیاں اونچی شلواریں پہننے لگی ہیں۔ ٹخنوں سے اوپر......"

"ہاں...... ہمیں اس فیشن کا پتہ ہے۔" صائمہ بولی۔

"لیکن حمیرا تم نے تو شاید شلوار گھٹنوں سے بھی اونچی......"

اس کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ صائمہ، بشریٰ اور حمیرا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔" گڈی بولی۔ "جب سے یہ آئی ہے میں یہی دیکھ رہی ہوں۔"

"ہائے گڈی خالہ۔" بشریٰ نے ہنستے ہوئے کہا "حد ہو گئی۔"

"کیوں؟"

"گڈی خالہ حمیرا نے لانگ ڈریس پہنا ہوا ہے اور اس کے نیچے شلوار نہیں پہنی جاتی۔"

وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے بولی اور سب بھی ہنس رہے تھے۔ گڈی کچھ گڑبڑا سی گئی۔

"واہ گڈی خالہ۔" حمیرا اپنے خوبصورت ویلوٹ کے ڈریس پر نظر ڈالتے ہوئے بولی "میں نے اتنا پیارا اور اتنا خوبصورت ڈریس پہنا ہوا ہے۔ آپ اسے لمبی سی قمیض سمجھ رہی ہیں......"

"یہ بڑا قیمتی ڈریس ہے گڈی۔" شمو نے کہا۔

بڑی دیر اسی لطیفے پر ہنسی مذاق ہوتا رہا......

ہماری پاکستانی لڑکیاں امریکہ میں اکثر وہی مغربی لباس پہنتی ہیں۔ جینز، سویٹر تو معمول کا ڈریس ہے۔ پارٹیوں میں بھی اکثر ویلوٹ اور سلک کے لانگ ڈریس یا پینٹیں وغیرہ پہنتی ہیں۔ بیاہ شادیاں ہوں تو کامدانی کام کی شلوار قمیض، گھگھرے، غرارے اور ساڑھیاں پہنتی ہیں۔

روزانہ کے لباس میں انہیں مغربی لباس ہی پُر سہولت لگتا ہے۔ شلواریں قمیصیں، دوپٹے وغیرہ سنبھالنا اور دھو کر استری کرنا ان کے لیے مشکل کام ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انہیں اور بھی سارے کام خود ہی کرنا پڑتے ہیں۔ یہ جنجال پالنا ان کے بس کا روگ نہیں رہتا۔ پھر بھی کچھ لوگ اپنی پاکستانی شخصیت کو اجاگر اور متعارف کرانے کے لیے پاکستانی لباس ہی پہنتے ہیں۔ وہاں لباس پر کوئی بندش ہے نہ قید۔ جس کا جی چاہے جو چاہے پہنے۔ نہ تو کوئی اعتراض کرتا ہے نہ نکتہ چینی۔ امریکن معاشرے کے لوگ کسی کے پھڈے میں خواہ مخواہ ٹانگ نہیں اڑاتے۔ ان کی یہ بات وہاں جا کر پاکستانی اور ہندوستانی بھی سیکھ لیتے ہیں۔

شمیم کے ہاں اب روز ہی محفل جمتی تھی۔ کھانا پینا، گانا بجانا، ناچنا بھی کچھ چلتا۔ خاصا ہلا گلا اور گہما گہمی ہوتی۔ اب خالد بھی آ گیا تھا اور سعدیہ و عاطف بھی۔ بعض اوقات تو اتنا شور شرابہ ہوتا کہ شمیم کو تشویش ہونے لگتی کہ کہیں اس کے ہمسائے شور و غل سے ڈسٹرب نہ ہوں۔

"خدایا۔" وہ سب سے کہتی "آوازیں ذرا دھیمی رکھا کرو۔ تم لوگ بہت شور

مچاتے ہو۔ ہمسایے شکایت نہ کر دیں۔''

''چھوڑیں پھپھو۔'' عاطف نے ایک دن اس کی بات ٹوکی۔ ''آپ کے ہمسایوں کے گھروں کو تو دوربین سے دیکھنا پڑتا ہے۔ پھر سب کے گھر ایئر کنڈیشنڈ ہیں۔ ہماری آوازیں وہاں تک کیسے پہنچ پاتی ہوں گی۔ پھر ہم تو شادی پہ آئے ہیں۔ گائیں گے بھی ناچیں گے بھی اور قہقہے بھی لگائیں گے۔ شور وغل اور ہلا گلا بھی کریں گے۔''

''واقعی۔'' حمیرا نے کہا ''ہماری خالہ کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہے۔ یہ سب کچھ تو ہوگا ہی۔''

سب نے باری باری یہی توجیہ پیش کی۔

شمیم کا گھر فاکس ہولو روڈ مونٹ ول پہ تھا۔ یہ علاقہ پرسکون اور خوبصورت ہے۔ سڑک چوڑی' سرمئی اور ہموار ہے۔ اس کے دونوں طرف بڑے بڑے کشادہ' خوبصورت اور شاندار گھر بنے ہوئے ہیں۔ ہر گھر کا رقبہ ایکڑوں پر محیط ہے۔ یہ ایکڑوں زمین سرسبز گھاس سے ڈھکی اور پھولوں کی کیاریوں سے سجی ہوتی ہے۔ مکان سڑک سے کافی ہٹ کر بنے ہوئے ہیں۔ ہر مکان کا دوسرے مکان سے کافی فاصلہ ہوتا ہے۔ یہ جگہ بھی سرسبز گھاس سے ڈھکی ہوتی ہے۔ اس سڑک پر عام طور پر بڑے بڑے ڈاکٹروں ہی کے گھر ہیں۔ ادھر ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے۔ کبھی کبھار ہی گاڑیاں ادھر سے گزرتی ہیں۔ عام طور پر یہاں کے مکین ہی آتے جاتے ہیں' تو ان کی گاڑیاں نظر آتی ہیں۔ اس سڑک پر پیدل چلتے میں نے تین ماہ میں کسی کو نہیں دیکھا۔

شمیم کا گھر بھی بہت بڑا اور بے حد خوبصورت ہے۔ چاروں طرف ایکڑوں کے حساب سے زمین چھوڑی ہوئی ہے' جس پر نفاست سے تراشی گھاس اور پھولوں کی کیاریاں بڑی بہار دیتی ہیں۔ پچھلے حصے میں اونچے اور پھیلاؤ والے درخت ہیں۔ یعنی گھر سبزے میں گھرا ہوا ہے۔

گھر کے سامنے نیم دائرے میں چمن چھوڑ کر سڑک بنی ہے جس پر گاڑیاں پارک کی جاسکتی ہیں۔ گھر کے داخلی اونچے دروازے تک جانے کے لیے پاتھ بنا ہوا ہے۔ دو تین

سیڑھیاں چڑھ کر گھر کے داخلی دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ گھر کے فرنٹ پر رف پتھر لگا ہوا ہے۔ مخروطی چھتوں کی ڈھلانوں پر نالی دار ٹائلیں ہیں۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی بہت بڑا ریسیپشن ہے۔ دائیں ہاتھ ڈرائنگ روم اور بائیں ہاتھ ڈائننگ روم ہے۔ داخلی دروازے کے دونوں طرف الماریاں ہیں جہاں باہر سے آنے والے اپنے کوٹ' ہیٹ یا شالیں وغیرہ ٹانگتے ہیں۔ گھر کے اندر ان کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ گھر سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ ریسیپشن ہی سے اوپر جانے کے لیے خوبصورت ریلنگ والی سیڑھیاں ہیں۔ پانچ چھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد چبوترا سا ہے۔ جہاں دوسری طرف یعنی کچن ہال کی طرف سے آنے والی سیڑھیاں ملتی ہیں۔ پھر سیڑھیاں اوپر چلی جاتی ہیں۔

ریسیپشن ہی سے ایک راستہ دائیں ہاتھ کے باتھ روم اور دوسرے ہاتھ نیچے بیسمنٹ میں جاتا ہے۔ سیڑھیاں اتر کر بیسمنٹ میں جاتے ہیں جو تقریباً پورے گھر کے نیچے بنی ہے۔ اس میں ایک طرف شمیم کے بیٹے نے اپنا سٹوڈیو بنایا ہوا تھا۔ اس کی پینٹنگز بھی یہاں پڑی تھیں۔ باقی دوسرے حصے میں گھر کا فالتو سامان اور ہم جیسے مہمانوں کے سوٹ کیس رکھے گئے تھے۔ ایک طرف صائمہ کی شادی میں دیا جانے والا سامان تھا۔

ریسیپشن سے بیچ میں داخل ہو کر بہت بڑے لاؤنج میں جاتے ہیں۔ ڈرائنگ روم کی طرح لیونگ روم بھی خوبصورتی سے سجا ہوا ہے۔ کالے چرمی صوفے' وکٹورین سٹائل کرسیاں' شیشے کے میز' بہت بڑا ڈیک اور کوئی باون انچ کا ٹی وی۔ اس کے علاوہ اور بھی آرائشی چیزیں ہیں۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ ایک بیڈ روم ہے۔

لاؤنج کے آخری سرے پر دو دروازے ایک بائیں ہاتھ دوسرا دائیں ہاتھ کھلتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سن روم ہے۔ خاصا بڑا کمرہ جس کی کھڑکیاں اور چھت شیشے کی ہیں۔ وہ بھی آراستہ و پیراستہ۔ دوسری طرف لکڑی کا پلیٹ فارم ہے۔ جہاں باربی کیو کی انگیٹھی اور لوہے کی سفید کرسیاں اور میز پڑے ہوئے ہیں۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ بڑی سی اوپن کھڑکی اور گزرنے کے

لیے دروازہ ہے۔ یہ ہمیں کچن ہال میں لے جاتا ہے۔ لمبا چوڑا کچن ہال ہے جس کے فرش پر سفید ٹائلیں لگی ہیں۔ امریکہ میں ماربل کی ٹائلیں استعمال نہیں ہوتیں بلکہ موٹے پلاسٹک کی ٹائیل شیٹس ہوتی ہیں' جو فرش پر لگا دی جاتی ہیں۔ باتھ رومز میں بھی ایسی ہی شیٹس استعمال ہوتی ہیں۔

کچن ہال کے ایک کونے میں ایل شیپ کچن ہے۔ بڑی الماری جتنا فریج' فریزر' اوون دیوار کے ساتھ نصب ہیں۔ کچھ دیوار گیر الماریاں ہیں۔ پھر گیس کا اوون (چولہا) اس کے ساتھ ہی دیوار کے ساتھ چھوٹی تین چار الماریاں۔ نیچے بھی الماریاں ان کے اوپر چبوترہ۔ ادھر ہی ڈش واشر نصب ہے۔ سنک ہے اور باسکٹ رکھنے کی نیچے الماری۔ ایل شیپ کی درمیانی چند فٹ جگہ چھوڑ کر ٹیبل ٹاپ ہے جس کے نیچے بھی برتنوں کے لیے الماریاں ہیں۔ باقی سارا ہال کھلا ہے۔ ڈائننگ روم کا دروازہ اس میں کھلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لانڈری روم ہے جس میں واشنگ مشین اور ڈرائیر نصب ہیں۔ ساتھ کپڑے استری کرنے کا بورڈ' کپڑے آویزاں کرنے کے لیے ہینگروں والی الماریاں۔ میلے کپڑوں کے لیے بڑی سی باسکٹ وغیرہ ہیں۔ اس سے پہلے چھوٹا سا کچن کا سٹور ہے جہاں مہینے بھر کا سوکھا سودا رکھا جاتا ہے۔

ہال کے ایک کونے میں باربی کیو والے لکڑی کے پلیٹ پر کھلنے والا دروازہ ہے۔ اس کونے میں ٹیبل اور کرسیاں رکھی ہیں۔ جہاں بیٹھ کر اہل خانہ کھانا کھا لیتے ہیں۔ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم مہمانوں کے آنے پر ہی استعمال ہوتا ہے۔

کچن ہال کا ایک دروازہ گیراج میں بھی کھلتا ہے۔ بہت بڑا گیراج ہے۔ چار بڑی گاڑیاں یہاں سہولت سے کھڑی ہو سکتی ہیں۔ گیراج کے بیرونی شٹر کمپیوٹرائزڈ ہیں۔ اندر سے باہر گاڑی لے جانا ہو یا باہر سے گاڑی اندر لانا ہو تو گاڑی میں لگا بٹن دبا دیا جاتا ہے۔ شٹر کھل جاتے ہیں۔ پھر اسی طرح بند بھی ہو جاتے ہیں۔

اوپر کی منزل پر چار بیڈ روم ہیں۔ مکان کی جتنی چوڑائی ہے اس پر ماسٹر بیڈ روم اور باتھ روم ہے۔ یہ شمیم کا کمرہ ہے۔ خوبصورت بیڈ' صوفہ کارپٹ اور ایک کونے میں ٹی وی

وغیرہ رکھنے کی الماری...... بیڈ کے قریب بھی سٹیپ ان وارڈ روب ہے' اس کے پیچھے چھوٹا سا سٹور اور پھر بڑا سا باتھ روم جس میں جکوزی کے علاوہ ڈریسنگ ٹیبل' بڑے بڑے آئینے' الماری اور شیشے کے بند کمرے میں الگ باتھ روم اور ٹائیلٹ۔ یہ باتھ روم صرف شاور سے نہانا ہو تو۔ ورنہ جکوزی ٹب موجود ہے۔ یہ غسل خانے اب بہت بڑے گھروں میں یہاں بھی بننے لگے ہیں۔

اسی طرح دوسرے سرے پر ایسا ہی جکوزی باتھ روم' سٹور اور کمرہ ہے۔ یہ صائمہ کے تصرف میں تھا۔ درمیان میں جو آمنے سامنے دو بیڈ روم ہیں ان کا شاور روم اور ٹائلٹ دونوں کمروں کے لیے ہے۔

یاد رہے کہ امریکہ میں سارے گھر لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ صرف بیسمنٹ کی دیواریں جن پر مکان کی دیوار اٹھنا ہوتی ہے' اس میں پتھر بھر کر مضبوط کیا جاتا ہے۔ باقی سارا گھر' دیواریں' چھت' سیڑھیاں' فرش لکڑی کے ہوتے ہیں۔ دیواروں کی موٹائی دونوں طرف کی لکڑی کی شیٹس میں فوم بھر کر کی جاتی ہے۔ یہ بنی بنائی مل جاتی ہیں۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ امریکہ میں باؤنڈری وال یا آہنی گیٹوں کا کوئی تصور نہیں۔ نہ ہی گرل یا جالی لگائی جاتی ہے۔ کھڑکیاں چوڑی اور شیشے کی ہوتی ہیں۔ ایسے بڑے گھروں میں الارم سسٹم ضرور ہوتا ہے۔ اگر کوئی چوری کی نیت سے شیشہ توڑنے کی کوشش کرے تو بیک وقت الارم گھر اور پولیس سٹیشن میں بج اٹھتے ہیں اور پولیس منٹوں میں جائے وقوعہ پر پہنچ جاتی ہے۔

گرل اور جالیوں سے مجھے چند سال پہلے کی ایک بات یاد آ گئی۔ میری ماموں زاد بہن جو شادی کے بعد امریکہ جا بسی تھی۔ اپنے دس گیارہ سالہ بیٹے کے ساتھ پاکستان آئی۔ ظاہر ہے ایک طویل عرصے کے بعد آئی تھی۔ اس لیے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنا ضروری تھا۔ وہ جس کے گھر بھی جاتی بچہ ساتھ ہوتا۔ وہ اپنے بیٹے کو سب سے متعارف کرواتی۔ بچہ جوں جوں لوگوں کے گھروں میں جاتا۔ خوش تو ہوتا لیکن ساتھ ساتھ الجھاؤ کا شکار بھی ہوتا جاتا۔

ایک دن اس کی ماما نے بچے سے پوچھ ہی لیا۔ ''تم یہاں آ کر خوش نہیں ہو۔ یہ سب ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ رشتہ دار ہیں۔ پیار کرنے والے ہیں۔''

''ہاں۔''

''تو پھر پریشان کیوں ہو جاتے ہو۔''

''ماما۔''

''جی۔''

''ماما۔''

''ہاں ہاں بتاؤ بیٹا۔''

''Why do they live in cages'' (ماما یہ لوگ پنجروں میں کیوں رہتے ہیں)

اس وقت تو بچے کی بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔ بیچارہ بچہ جس گھر میں بھی جاتا کھڑکیوں پر لوہے کی مضبوط گرلیں اور جالیاں لگی ہوتیں۔ یہ گھر اسے پنجروں کی طرح لگتے ہوں گے...... اور وہ حیران و پریشان ہو جاتا ہوگا کہ یہ کیسے انسان ہیں جو پنجروں میں رہتے ہیں۔

اس وقت تو ہم سب اس کی بات پر خوب ہنسے تھے۔

لیکن

یہاں

امریکہ آ کر مجھے اس بات کی تلخی کا شدت سے احساس ہوا۔ یہاں کسی کھڑکی کو لوہے کی گرل لگی نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیاں ہر گھر میں ہوتی ہیں' خطرے کا الارم ہر گھر میں نہیں ہوتا۔

یہاں لوگ محفوظ ہوتے ہیں۔ کوئی شیشہ توڑ کر گھر میں وارد نہیں ہوتا۔ عام فلیٹ' سنگل بیڈ روم' ڈبل بیڈ روم اپارٹمنٹس کی کھڑکیوں پر صرف شیشہ لگا ہوتا ہے۔

چوری کا ڈر نہیں ہوتا۔ کسی دہشت گرد کے گھس آنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ لوگ

امن و امان کی فضا میں جیتے ہیں۔ چھوٹی موٹی چوریاں ہوتی ہوں گی لیکن ہمارے ہاں کی طرح نہیں۔

کہ

گرل اور آہنی جالی کے پنجروں میں بھی ہم محفوظ نہیں۔ گرل کاٹ لینا اور اندر گھس آنا۔ منٹوں میں گھر میں مزاحمت کرنے والوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دینا۔ مال و متاع لوٹ کر کھلے بندوں بچ کر نکل جانا یہاں معمول کی باتیں ہیں۔

ہم انسان سے حیوان کیوں بنتے جا رہے ہیں؟ تحفظ کی خاطر گھروں کو لوہے کی موٹی موٹی گرلوں اور جالیوں سے پنجرے بنا کر بھی کچھ نہیں بنتا۔ غیر محفوظ ہی رہتے ہیں۔

میں امریکہ میں جہاں بھی گئی بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیاں ہی دیکھیں۔ ان گھروں کے مکینوں کو ان شیشوں کی وجہ سے پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ عوام پرسکون اور محفوظ ہیں۔ انہیں ایسا کوئی خدشہ نہیں کہ شیشے کی کھڑکی توڑ کر کوئی اندر آ جائے گا۔ گلا گھونٹ دے گا۔ لوٹ مار کرے گا۔

گو جرائم وہاں بھی ہوتے ہیں۔

لیکن اس طرح کے نہیں۔

وہاں یا تو نفسیاتی مجرم ہوتے ہیں یا زیادہ تر کالے پسے ہوئے لوگ' کچھ بگڑے ہوئے نشہ باز نوجوان گورے۔

عام آدمی وہاں ہر طرح سے محفوظ ہے۔ امن و امان سے رہ رہا ہے۔ زندگی کی ممکنہ سہولتوں سے بغیر کسی دھڑکے اور خدشے کے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

ہاں

تو میں شمیم کے گھر کا بتا رہی تھی۔ بہت خوبصورت اور نفاست سے آراستہ گھر ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اس کا سن روم پسند آیا' جس کی ٹرانسپیرنٹ چھت اور دیواروں سے باہر کے مناظر دیکھتے ہوئے لطف آتا ہے۔ دھوپ نکلی ہو یا برف گر رہی ہو وہاں بیٹھ کر ان قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کا اپنا ہی مزہ ہے۔

شمیم کا یہ گھر تقریباً سات سال پہلے بنا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی تعمیر ہوا ہو۔ ایک تو وہاں دھول مٹی ہوتی نہیں۔ دوسرے صفائی کا بھی بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ فرش ہوں' دیواریں ہوں' کچن کی چیزیں ہوں' چمکتی دمکتی ہوتی ہیں۔ کہیں ذرا سی چیز گری فوراً ٹشو پیپر سے صاف کردی۔

صفائی کے لیے وہاں ڈٹرجنٹ بھی بے انتہا اور سستے ملتے ہیں۔ ٹھیک طرح سے صفائی کی جائے تو کہیں داغ دھبہ نظر نہیں آتا۔ عام لوگوں کو تو گھر کا ہر کام خود کرنا پڑتا ہے لیکن اہل ثروت وہاں بھی میڈز رکھتے ہیں۔ کوئی ہفتے میں دوبار اور کوئی دن رات کے لیے رکھتا ہے۔ یہ نوکرانیاں نہ تو نوکرانیاں لگتی ہیں نہ ہی انہیں نوکرانی سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ میں کوئی چھوٹے درجے کا ہو یا بڑے کا اس کے ہیومن رائٹس برابر ہیں۔

شمیم کے ہاں بھی ایک میڈ کام کرنے آتی تھی۔ شاید ہفتے میں دوبار۔ وہ ایک میکسیکن عورت تھی۔ اس کے پاس بالکل نئی ٹیوٹا گاڑی تھی۔ پہلے دن ہم نے اسے دیکھا تو گمان ہوا شمیم کی کوئی ملنے والی آئی ہے۔ اس نے جینز پر سویٹر پہن رکھا تھا۔ لمبا کوٹ آتے ہی مین دروازے کے ساتھ والی الماری میں ٹانک دیا تھا۔ گرم ٹوپی اور دستانے گاڑی ہی میں رکھ آئی تھی۔

وہ اندر آئی۔

ہم سب کو ہائے کہا اور کچن ہال میں چلی گئی۔ شمیم نے شاید اسے مہمانوں کا بتایا ہوا تھا۔ لیکن اس نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ خوش آمدیدی لفظ ہائے کہا' مسکرائی اور بس۔

ہم سب لیونگ روم میں ناشتے کے بعد بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اب ہماری نگاہوں کا مرکز وہ عورت تھی۔ ہم لوگ جان تو گئے کہ وہ شمو کی میڈ ہے لیکن اس طرح کی نوکرانیاں ہمارے ہاں کہاں۔ صاف ستھرے کپڑے' نفاست سے بنے ہوئے بال' ہلکا سا میک اپ۔

وہ سیدھی کچن والے حصے میں گئی۔ فریج کھولا...... اس میں سے ڈبل روٹی' انڈہ' مکھن' دودھ نکالا...... پھر اپنے لیے ٹرے میں برتن سجائے۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے لیے ناشتہ

بنا کر ٹرے لیے کھانے کی میز پر آ بیٹھی جو کچن ہال کے دوسرے سرے پر تھی اور جس پر ہم سب بیٹھ کر کھانا کھاتے اور چائے پیتے تھے۔

وہ ہمیں دیکھ کر دو ایک بار مسکرائی۔ پھر آرام سے ناشتہ کرنے لگی۔ اس نے اپنے لیے چائے نہیں کافی بنائی تھی۔ دودھ بھرے پیالے میں ٹی بیف بھی ڈال کر کھائے تھے۔

اس نے انہی برتنوں میں ناشتہ کیا جن میں ہم کرتے تھے۔ اسی میز پر بیٹھی جس پر ہم بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے۔

مجھے اپنے ہاں کے نوکروں کا خیال آیا۔ ہم لوگ ان کے لیے الگ برتن رکھتے ہیں۔ پانی پینے کا گلاس الگ ہوتا ہے اور پھر انہیں باورچی خانے کی کسی نکڑ میں بیٹھ کر کھانا کھانا ہوتا ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھلانے کا تو ہم تصور بھی نہیں کرتے۔ ہمارا یہ سلوک صرف کرسچن جمعدارنیوں سے نہیں ہوتا۔ مسلمان نوکروں' نوکرانیوں سے بھی ہوتا ہے۔

اللہ

کس قدر فرق تھا ہمارے اور امریکن معاشرے میں!

میرے ذہن میں تو ہر وقت تقابل کی فلم سی چلتی رہتی۔ میں امریکن معاشرے کی اچھائیوں اور انسانی حقوق کی مساوات دیکھ کر اپنے ہاں کے رویوں پر غور کرتی رہتی۔ کڑھتی بھی بہت اور دل سے چاہتی بھی کہ کاش! ہم ان چھوٹی چھوٹی اچھائیوں ہی کو اپنا کر اپنے معاشرے کا حصہ بنالیں۔ انسان کو انسان ہونے کا حق دیں۔ ان کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کریں۔ ان کی جانوروں کی طرح گزرنے والی زندگیوں میں کچھ تو سہولتیں دینے کی کوشش کریں۔

لیکن

یہ صرف سوچنے تک ہی محدود تھا۔

امریکہ ایک انتہائی امیر ملک

اور

پاکستان جیسا غریب ملک؟

یہاں وہ سب کچھ کہاں ہوسکتا ہے جو وہاں ہر شہری کو میسر ہے۔

لیکن

ہم تو وہ باتیں بھی نہیں کرتے جس میں پیسے کا تعلق نہیں ہوتا۔

مثل سن رکھی ہے کہ

غریب ظالم ہوتا ہے۔

واقعی

غریب ملک میں بھی ظلم خوب پھیلتا پھولتا ہے۔

اس کی بیشمار مثالیں میرے ذہن میں ہیں لیکن بے عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں دہرانے کا کیا فائدہ۔

خیر

وہ میڈ اپنے کام میں لگ گئی۔ سارے برتن اکٹھے کرکے کھنگالے اور ڈش واشر میں ڈال دیئے۔ پھر اوپر نیچے سب کمروں سے میلے کپڑے اکٹھے کر لائی۔ تولیے' بیڈ شیٹس' شمیم اور صائمہ کے کپڑے۔ بڑا سا ڈھیر جمع کرکے لانڈری میں لے گئی۔ سب بستروں کی چادریں اور تکیوں کے غلاف اس نے خود ہی الماریوں سے نکال کر بدل دیئے تھے۔

ہاں اس نے کام شروع کرنے سے پہلے ایپرن باندھ لیا تھا۔ اس نے ان سب کمروں کو جن میں قالین پڑے تھے ویکیوم کلینر سے صاف کیا۔ لیونگ روم کی طرف آئی تو ہم سب اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

کچن ہال کا فرش سفید ٹائلوں والا تھا۔ پتہ نہیں کون کون سا ڈٹرجنٹ اس نے اسے صاف کرنے کے لیے استعمال کیا۔ باتھ روم اس طرح چمکائے کہ لگتا تھا ابھی ابھی تیار ہوئے ہیں۔ سب باتھ رومز میں ٹائلٹ رول نئے رکھے۔ سیٹ پر رکھنے والے ٹشو پیپر کا پیکٹ بھی ایک طرف لٹکا دیا۔

امریکہ میں ٹشو پیپر کا استعمال بہت ہی زیادہ ہوتا ہے۔ کچن میں ہمارے ہاں کی طرح کپڑے کی صافیاں یا رومال وغیرہ استعمال نہیں ہوتے۔ بلکہ ٹشو پیپر کے رول لائے

جاتے ہیں جو ہر قسم کی صفائی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے رول ہر گھر میں اس مقصد کے لیے وافر مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ شمو نے تو شاید ہم لوگوں کی آمد کی وجہ سے اس کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ یہ سستے بھی ہوتے ہیں۔ استعمال کے بعد پھینک دیے جاتے ہیں۔ صفائی بہت بہتر طریق سے ہوتی ہے۔ یہ ٹشو پیپر صرف گھروں ہی میں استعمال نہیں ہوتے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ ریستورانوں' ہوٹلوں' عوامی باتھ رومز میں یہ وافر پڑے ہوتے ہیں۔ ہر سٹور کے باتھ رومز میں پڑے ہوتے ہیں۔ سونی شاہراہوں پر بھی جو عوام کی سہولت کے لیے باتھ رومز ہوتے ہیں وہاں بھی صاف ستھرے' چمکتے دمکتے باتھ رومز میں ٹشو پیپر کے رول' سیٹ کورز اور ہاتھ صاف کرنے کے لیے ٹشو پیپر کے ڈبے موجود ہوتے ہیں۔ امریکہ میں باتھ رومز سٹوروں میں ہوں' ہوٹلوں میں ہوں' ویرانوں میں ہوں ان کے گندا ہونے کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ جہاں ارد گرد کوئی بندہ بھی نہیں نظر آئے گا۔ باتھ روم کے استعمال ہوتے ہی کہیں سے ڈیوٹی پر موجود آدمی یا عورت نمودار ہوجائے گی اور باتھ روم خواہ صاف ہی ہو پوری طرح صاف کرکے جراثیم کش خوشبودار دوائی ڈال دی جائے گی۔

ٹشو پیپرز کی افادیت اپنی جگہ۔ ان کی ہر جگہ موجودگی بھی خوش کن بات ہے۔

لیکن

امریکیوں کی ایک بات مجھے پسند نہیں آئی کہ وہ ٹائلٹ روم میں رفع حاجت کے بعد بھی صرف ٹشو کا استعمال کرتے ہیں۔ پانی کا استعمال نہیں کرتے۔ پانی سے جو طہارت اور پاکیزگی ہوتی ہے وہ ٹشو پیپر کے استعمال سے ممکن نہیں۔ امریکی باتھ رومز میں لوٹا یا مسلم شاور کا کوئی تصور نہیں۔ جو پاکستانی یا ہندوستانی مسلم لوگ وہاں ہیں یا دوسرے ممالک کے مسلم لوگ ہیں وہ باتھ رومز میں پانی استعمال کرنے کے لیے مختلف قسم کے پلاسٹک کے ڈبے صراحی قسم کے برتن یا بڑی بڑی بوتلیں رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہاں لوٹا ایکسپورٹ کیا جائے تو اس کی بڑی افادیت اور ڈیمانڈ ہوگی۔

ہاں تو وہ لیڈی نیچے صفائی کرنے کے بعد اوپر چلی گئی۔ نچلا حصہ اور اس کی ہر چیز

اس نے چمکا دی تھی۔ دروازے' سیڑھیاں جو لکڑی کے تھے ان پر پالش کی گدی پھیری تھی۔ شیشوں کو گلنٹ سے صاف کیا تھا۔ کوئی کونہ کھدرا نہیں چھوڑا تھا جسے صاف نہ کیا ہو۔ ہم جب شمو کے گھر گئے تھے تو یہ بہت ہی صاف اور چمکتا دمکتا لگتا تھا۔

لیکن

اب تو ہر چیز دیدنی تھی۔ فرش کی ایک ٹائل بھی نہ تھی۔ جو چمک نہ رہی ہو۔ اوون' فریج' چولہا لگتا تھا ابھی ابھی بازار سے نیا لایا گیا ہو۔

میں صفائی دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ شمو گھر پہ نہیں ہے لیکن پھر بھی اس عورت نے پوری ایمانداری سے کام کیا تھا۔ ڈنڈی نہیں ماری تھی۔ مالکن کے نہ ہوتے ہوئے بھی کام اس طرح کیا تھا جیسے وہ سر پہ کھڑی ہو۔

اب مجھے اپنے ہاں کی نوکرانیوں کا خیال آیا۔ 99 فیصد کام کرنے والیاں کام سے جی چرانے والی ہوتی ہیں۔ کام میں بے ایمانی کرنا' ڈنڈی مارنا ان کا کام ہوتا ہے۔ مالک سر پہ بھی ہوں تب بھی کام سہل پسندی سے کرنے کا جواز ڈھونڈ لیتی ہیں اس لیے اگر ان کے ساتھ مالکوں کا رویہ اچھا نہیں ہوتا تو یہ ظلم نہیں۔

میں گھوم پھر کر گھر کی صفائی دیکھ رہی تھی۔ لانڈری میں بھی گئی۔ کپڑے دھونے کے بعد اس نے واشنگ مشین ڈرائیر اور سنک وغیرہ بالکل صاف کر دیے تھے۔ کچھ کپڑے استری کر کے ہینگروں میں ڈال کر الماری میں لٹکا دیے تھے۔ تولیے' چادریں وغیرہ تہ کر کے اوپر لے گئی تھی۔

میں لانڈری سے باہر نکلی۔ کچن ہال سے اوپر جانے والی پالش شدہ لکڑی کی خوبصورت سیڑھیوں کو دیکھ کر اوپر جانے کا سوچ رہی تھی کہ گڈی نے لیونگ روم سے آواز دی۔

"آپا آپ کیا کر رہی ہیں۔ ادھر آ کر ٹی وی دیکھیں۔"

"تم لوگ دیکھو۔ مجھے انگلش فلمیں دیکھنے کا خاص شوق نہیں۔"

"فلم چھوڑیں۔ یہ سلائیڈ تو دیکھیں جو اک تسلسل سے دکھائی جا رہی ہے۔"

میں نے کچن ہال کے لیونگ روم میں کھلنے والے چوڑے دروازے کی طرف آتے ہوئے پوچھا "کیسی سلائیڈ گڈی......"

"صدر کلنٹن کی......"

میں جلدی سے لیونگ روم میں آ گئی۔ ان دنوں صدر کلنٹن اور لیونسکی کے معاشقے کا قصہ زوروں پر تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے آدمی کو عوام کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا تھی۔

ٹی وی کی بڑی سی سکرین پر شاید کوئی فلم یا ڈرامہ چل رہا تھا۔ لیکن نچلے حصے میں کوئی چار انچ کی پٹی پر کلنٹن کی تصویر کے ساتھ یہ الفاظ دکھائے جا رہے تھے۔

"I never did sex"

یہ سلائیڈ مسلسل گھوم رہی تھی۔ بار بار تصویر اور اس کے ساتھ یہ الفاظ دکھائے جا رہے تھے۔

کتنی حیران کن بات تھی ہمارے لیے۔ امریکہ کا صدر اور ٹی وی پر دنیا کے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہا ہے۔ ہم لوگ اپنے ملک میں تو ایسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے ہاں صدر یا وزیر اعظم کے متعلق تو الگ بات کسی بڑے افسر کے خلاف بھی اس طرح زبان کھولی نہیں جا سکتی۔ زبان کھولنے والے کو اندر ہی اندر غائب کروا کے اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دینا بڑی بات نہیں ہوتی۔

لیکن

یہ امریکہ تھا۔

یہاں شخصی آزادی حقیقی معنوں میں ہے۔ اس کی مثال کلنٹن اور لیونسکی کے معاشقے کی داستان تھی جو ہر شخص کی زبان پر تھی۔ اس کے بخیے ادھیڑے جا رہے تھے۔ ایک ایک بات پوری طرح کھل کر عوام کے سامنے آ رہی تھی۔

دنیا کے مرد اول کی داستان عشق!

جو بچی تھی یا نہیں

پھر

بھی

عوام اپنا حق محفوظ رکھتے تھے کہ وہ صدر کی اس غلطی پر اس سے جواب طلب کریں۔

حیرانی کی بات ہے کہ امریکہ میں جنسی آزادی پر کوئی پابندی نہیں۔ لڑکے لڑکیاں رومانس لڑاتے' ڈیٹس پر جاتے اور کھلے بندوں جنسی کھیل کھیل سکتے ہیں۔ بلکہ شادی سے پہلے جب تک لڑکی لڑکا کچھ خاص عرصہ اکٹھے نہ رہیں' ڈیٹس پر نہ جائیں۔ میاں بیوی کے سے تعلقات نہ رکھیں' انہیں پادری نکاح کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ایک طرف تو یہ جنسی بے راہ روی

اور

دوسری طرف صدر کا ماضی اور حال پاک صاف ہو۔ وہ کسی سکینڈل میں بھی ملوث نہ رہا ہو۔ بیوی کے بغیر کسی دوسری عورت سے عشق نہ کرتا ہو۔

کیا معاشرہ ہے؟

ان دنوں اخبارات بھی کچھ ایسی ہی شہ سرخیوں کے ساتھ چھپتے تھے۔ کلنٹن اور لیونسکی کی تصویریں شائع ہوتی تھیں۔ امریکہ میں اخبار بھی کئی کئی کلو وزنی ہوتے ہیں۔ شمو کے ہاں تو روزانہ ڈاک میں نیویارک ٹائمز جیسے موٹے تازے اخبار کے علاوہ اور بھی کئی اخبار آتے تھے۔ اخباروں کے علاوہ پمفلٹس ہوتے' کئی کئی صفحات کے اشتہار ہوتے۔ جن میں کوپن لگے ہوتے۔ ان کوپنز پر شاپنگ میں خاصی چھوٹ ملتی تھی۔ کمپنیاں اپنی شہرت کے لیے کافی ڈسکاؤنٹ ان کوپنوں پر دیتی تھیں۔ ان دنوں تو کلنٹن لیونسکی معاشقے کی وجہ سے اخبارات کی مقبولیت ویسے بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ کوپنز بھی بہت ہوتے تھے۔ کرسمس بھی قریب تھا اس لیے لوگ ان کوپنز پر دھڑا دھڑ شاپنگ کر رہے تھے۔

ہاں تو

بات ہو رہی تھی شمو کی میڈ کی۔ بات در بات۔ کہاں سے کہاں کا ذکر آن

پہنچا۔ وہ میڈ اب اوپر صفائی کے لیے گئی ہوئی تھی۔ میں بھی گڈی' نسیمی اور رقیہ کے ساتھ لیونگ روم میں آ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ ساتھ ساتھ امریکی معاشرے اور عوامی حقوق کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔

کہ

اچانک ہی بھابی نے کہا "وہ صفائی والی عورت اوپر گئی ہے۔ شمو کے کمرے کی الماری کھلی پڑی ہے۔"

"ہاں۔ میرا پرس بھی اوپر ہی میز پر پڑا ہے۔"

"بھئی اپنی اپنی چیزیں سنبھالو......"

"ہماری چیزیں تو خیر ہم نے سنبھالی ہوئی ہیں۔ شمو کی قیمتی جیولری تو الماری میں کھلی پڑی ہے۔"

واقعی

شمو نے ایک گول سے ڈبے میں اپنی ڈائمنڈ کی رنگز' ٹاپس' لاکٹ اور جانے کیا کچھ رکھا ہوا تھا۔ کتنی انگوٹھیاں' کتنے ٹاپس اور پینڈنٹ اس میں پڑے تھے۔ ہمیں تو معلوم ہی نہ تھا۔ لیکن ڈبہ دیکھا تھا۔ کافی چیزیں تھیں اور تو اور سونے کی چوڑیاں جو ایک دفعہ پاکستان سے لے کر آئی تھی۔ وہ تو ڈبے کے بغیر ہی شیلف میں بکھری پڑی تھیں۔ الماری چونکہ اس طرح کی بنی تھی کہ اس میں ٹی وی رکھا رہتا تھا جو شمو کے بیڈ کے سامنے تھا۔ اس طرح الماری بند نہ کی جا سکتی تھی۔

الماری میں اور بھی کافی چیزیں تھیں۔ ایک مخملیں ڈبے میں پرل کے سیٹ تھے۔ پنک اور گرے پرل کی چیزیں بھی تھیں...... لیکن سب کھلی...... نہ تو الماری کو لاک لگ سکتا تھا نہ ہی کمرہ لاک کیا ہوا تھا۔

خیر

میڈ صفائی کر کے نیچے آ گئی۔ کچن ہال میں چند لمحے کھڑی ہو کر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔

ہم نے اسے لیونگ روم میں آنے کے لیے کہا۔ نسیمی بڑی باتونی ہے وہ اس سے باتیں کر کے جیمز بانڈ کا کردار ادا کرنے کو تھی کہ کہیں وہ شمو کے زیورات میں سے کوئی چیز تو اٹھا نہیں لائی۔

لیکن

اس نے گھڑی دیکھنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ مسکرائی اور بولی "سوری۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ دس منٹ کی ڈرائیو پر میرے بچوں کا سکول ہے۔ وہاں سے انہیں لے کر گھر چھوڑنا ہے۔ پھر مجھے دوسرے کام پر جانا ہے۔"

وہ

ریسیپشن کی طرف چل دی۔ مسکرا کر بائے کہا اور بس......

وہ چلی گئی۔

اور

ہم سب رواں تبصرے کرنے لگے۔ موضوع یہی تھا کہ یہاں لوگ وقت کی کتنی اہمیت سمجھتے ہیں۔ شمو آئی تو ہم سب نے اسے گھیر لیا۔ میڈ کے ناشتہ کرنے سے لے کر اوپر اکیلے جا کر صفائی کرنے کی ہر بات بتائی۔

"ہائے ہائے۔" شمو نے مسکراہٹ سے ہماری باتوں کا تمسخر اڑایا۔ پھر جلدی سے بولی "تم نے یہ سب کچھ اس سے تو نہیں کہا......؟"

"نہیں نہیں۔" تقریباً سبھی نے کہا۔

"شکر ہے۔" شمو نے کہا......"میری میڈ کو بھگا دیتے تم لوگ تو میں کیا کرتی۔"

"ویسے تم اپنی جیولری تو سنبھالا کرو۔"

"وہ سنبھالی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں لے جاتا۔" شمو نے کہا "یہ میڈ میرے ہاں بارہ سال سے کام کر رہی ہے۔ اب تم لوگ شک و شبے ظاہر کر کے اسے بھگا نہ دینا...... پانچ سال جب میں پہلے گھر میں تھی اور سات سال سے اس گھر میں یہ کام کر رہی ہے۔ میری کبھی کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس گھر میں تقریباً چار سال بالکل اکیلی رہی ہوں۔"

"اکیلی؟"

"ہاں آصف اور صائمہ اپنی پڑھائی کے لیے یونیورسٹیوں میں تھے۔ آصف میزوری سٹیٹ میں تھا۔ صائمہ نیویارک میں...... کبھی کبھی گھر آتے تھے۔ یہی میڈ میرا کام کرتی رہی ہے......"

ہم نے پھر بھی شمو کو جیولری سنبھالنے کے لیے کہا۔ لیکن وہ ہنس کر بولی "یہ تمہارا پاکستان نہیں ہے...... جہاں کھانے پینے کی چیزوں کو بھی نوکروں سے بچانے کے لیے لوگ تالے لگاتے ہیں......"

"ہمارا پاکستان ہے تو کیا تمہارا نہیں ہے۔" پتہ نہیں اس نے کہا۔ شمو کے الفاظ کا برا سبھی کو لگا تھا۔

لیکن خیر

اس نے یہ بات ہماری بات کے جواب میں کہی تھی۔ ویسے بھی اس نے پاکستان میں زندگی کے اتنے تلخ رویے دیکھے تھے جنہیں وہ کسی طور بھلا نہ پائی تھی۔

ہم نے دانستہ باتوں کا رخ دوسرے موضوع کی طرف موڑ دیا۔

کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے۔

پھر شمو اٹھتے ہوئے بولی "تم لوگ صبح سے یہیں بیٹھے ہو......"

"ٹی وی دیکھ رہے تھے......"

"بھئی ایک بات سنو۔ یہاں اپنا کام خود کرنا پڑے گا۔ میڈ تو ہفتے میں صرف دو دن آتی ہے وہ بھی میرے کام کے لیے۔ اس لیے کھانا پکانا' برتن کپڑے دھونا' بستر بنانا سب کچھ آپ لوگوں کو خود ہی کرنا پڑے گا......"

نسیمی نے مسکرا کر طنز کیا "جی ہاں۔ یہ پاکستان تھوڑا ہی ہے جو بیٹھے بیٹھے کام نوکر کر دیں گے۔ کپڑے دھلے دھلائے ملیں گے۔ کھانا ٹیبل پر سیٹ ہوگا' صفائی ستھرائی کوئی کام بھی خود نہ کرنا پڑے گا......"

"موٹو۔" شمو نے ہنس کر اس کے ٹھوکا دیا "وہاں بے کار بیٹھ بیٹھ کر اتنی موٹی

ہو رہی ہو۔ مجھ سے دو سال چھوٹی ہو۔ ذرا اپنا سراپا دیکھو۔ کتنے سال بڑی لگتی ہو مجھ سے......"

سب ہنس پڑے۔

پھر

ہم سب نے کام بانٹ لیے۔ رقیہ بھابی نے کھانا پکانے کی ذمہ داری قبول کی۔ نسیمی نے برتن دھونے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ گڈی کپڑے دھونے کے لیے رضامند ہوئی۔

"اور میں......" سب میں کام بٹ گئے تو میں نے پوچھا۔

"آپا ہم سب میں بڑی ہیں۔ یہ کچھ نہیں کریں گی۔" شمو نے کہا۔

میں مسکرائی۔ اسے تشکرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "بھئی کچھ تو میں بھی کیا کروں گی۔"

"آپ ان سب کے کام کی نگرانی کیا کریں۔" شمو نے ہنس کر کہا۔ میرے اصرار کے باوجود سب بہنوں اور بھابی نے کسی کام کی ذمہ داری مجھے نہ سونپی۔

"آمنہ بھی روز آ جاتی ہے۔ وہ کوکنگ میں بھابی کا ہاتھ بٹایا کرے گی۔ کھانے کی میز پر برتن سیٹ کرنا' پھر اٹھانا اور بھی کئی کام ہیں وہ کر لیا کرے گی۔"

شمو نے نسیم کی بیٹی اور اپنی بہو آمنہ کے متعلق کہا۔

"آمنہ اس گھر کی بہو ہے۔ اس کے علاوہ بھی اسے جو کام ہو' کرنا پڑے گا......"

"وہ صائمہ کے ساتھ روز شاپنگ کے لیے بھی جاتی ہے۔ اپنے گھر کا کام بھی کر کے آتی ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" بھابی نے کہا۔

غرض

کچھ دیر یوں ہی باتیں ہوتی رہیں۔

پھر شمو اوپر چلی گئی اور ہم سب پھر سے ٹی وی دیکھنے لگے۔ بھابی کھانا بنا کر فارغ ہو چکی تھی۔ روٹیاں وہاں بنی بنائی ملتی تھیں۔ جیسے یہاں بیکریوں سے جیز وغیرہ کی روٹیاں ملتی ہیں۔ تھوڑا سا گرم کیا اور مزے کی نرم نرم روٹی تیار...... یہ روٹیاں شمو ہمارے لیے لائی تھی۔ ورنہ وہاں تو وہ ڈبل روٹی کے سلائس پر ہی گزارہ کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ رائس نکر

میں چاول وغیرہ وہ بنا لیا کرتی تھی۔

شمو کے گھر کے متعلق تو میں نے بتا دیا۔ اس کے گھر کے سامنے سڑک کے پار اور آگے پیچھے بھی تقریباً اتنے ہی بڑے بڑے گھر تھے جو زیادہ تر ڈاکٹروں کے تھے۔

ہمارے ہاں کی طرح امریکہ میں بھی مختلف طرز کے چھوٹے بڑے گھر ہوتے ہیں۔ فلیٹس بھی بے شمار ہیں۔ سنگل بیڈ روم' ڈبل بیڈ روم کے اپارٹمنٹس بھی ہوتے ہیں...... دو تین کمروں' لیونگ روم' ڈائننگ اور ڈرائنگ روم پر مشتمل گھر جنہیں کونڈومنیم کہا جاتا ہے وہاں کافی علاقوں میں موجود ہیں۔ یہ بہت بڑے گھر نہیں ہوتے نہ ہی ان کے ساتھ ایکڑوں کے حساب سے زمین چھوڑی ہوتی ہے' ساتھ ساتھ جڑے ہوئے نہیں ہوتے لیکن ایک گھر سے دوسرے گھر تک ایک بڑے صحن ہی کا فاصلہ ہوتا ہے۔

امریکہ کی ہر سٹیٹ میں یونیورسٹیاں بے حساب ہیں۔ وہاں سٹوڈنٹس کے لیے رہنے کے لیے جگہ موجود ہوتی ہے۔ مختلف صاحب ثروت لوگوں نے یونیورسٹی کے قریب بے شمار گھر کرایے پر دینے کے لیے بنائے ہوتے ہیں۔ سنگل روم بھی ہوتے ہیں ڈبل بھی۔ سنگل روم ایک سٹوڈنٹ کے لیے ہوتا ہے جس میں ایک طرف بیڈ' کرسی' میز' الماری اور باتھ روم کے علاوہ کمرے کے ایک کونے ہی میں چھوٹا سا کچن ہوتا ہے جس میں اوون' فریج' سنک وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ چھوٹی سی میز اور ایک کرسی بھی پڑی ہوتی ہے۔ ان کمروں میں گرمیوں میں کولنگ اور سردیوں میں ہیٹنگ سسٹم ضرور ہوتا ہے۔ بجلی' گیس' ٹیلیفون کی سہولت میسر ہوتی ہے۔ ڈبل روم قدرے بڑا ہوتا ہے جس میں دو ساتھی رہ سکتے ہیں۔ وہاں بھی یہ سب سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ فیملی سمیت آئے ہوئے طالب علموں کے لیے پورے پورے مکان بھی ہوتے ہیں۔

دوسرے ممالک سے طالب علم آتے ہیں تو انہیں رہائش کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جیب کے مطابق چھوٹا یا بڑا کمرہ لے کر آرام سے رہ سکتے ہیں۔ باقی گھروں میں بھی پورے امریکہ میں......

چاہے وہ بہت بڑی کوٹھیاں ہیں چاہے کونڈومنیم' اپارٹمنٹس یا فلیٹس زندگی کی

بنیادی سہولتیں ہر جگہ یکساں طور پر میسر ہیں۔

بڑے گھروں سے الگ تھلگ ایک اور بھی طبقہ ہے۔ یہ بڑے بڑے بزنس مین یا اداکار ہیں۔ جن کے گھر ایکڑوں پر محیط ہوتے ہیں۔ شمو نے یونہی ڈرائیو کرتے ہوئے بعض ایسے گھر بھی دکھائے جن کے اپنے پوسٹ آفس تھے ڈسپنسریاں تھیں' ٹیلیفون' گیس و بجلی کا نظام کہیں بھی کبھی بھی معطل نہیں ہوتا تھا۔ ان گھروں میں امریکہ کے چوٹی کے امیر لوگ رہتے ہیں۔ اس طبقے کی خریداری کے سٹور بھی مختلف ہیں۔ گو ہر بندہ وہاں جا سکتا ہے لیکن وہاں کی چیزیں اور ان کی قیمتیں دیکھ کر تو ہم جیسے لوگ ششدر ہی رہ جاتے ہیں۔

امریکہ میں بے انتہا دولت ہے۔ معدنی وسائل بھی ہیں' زرعی بھی' فیکٹریوں کا بھی حساب نہیں۔ سٹوروں کے سلسلے پورے ملک میں پھیلے ہیں۔

امریکیوں کے لیے ہر طرح کا کام کرنے کے بے پناہ مواقع ہیں۔ وہ کام بھی لگن اور محنت سے خوب کرتے ہیں۔ بزنس ہو...... نوکری ہو...... یا کوئی اور چھوٹا موٹا کام وہ محنت میں عیب نہیں جانتے۔ کام کرنا برائی نہیں۔ جیسا بھی کام ہو کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

اس کا معاوضہ بھی انہیں اچھا خاصا ملتا ہے۔ ہفتے میں پانچ دن ڈٹ کر کماتے ہیں اور دو دن خوب عیش کرتے ہیں۔ فراخدلی سے کمایا ہوا پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ دو دن کی چھٹی سیر سپاٹے' کھانے پینے اور عیش کرنے میں گزار کر پھر نئے سرے سے اپنے کام میں جت جاتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ بری بات ہو سکتی ہے لیکن امریکن معاشرے میں نہیں۔ وہ کام کرتے ہیں' انتھک محنت کرتے ہیں تو انہیں معاوضہ بھی اسی حساب سے ملتا ہے اور جو وہ چھٹی کو پرلطف بنانے کے لیے اپنی پانچ دن کی کمائی لٹاتے ہیں تو اس سے ایک فائدہ ملک کو بھی پہنچتا ہے کہ سرمایہ گردش میں آتا ہے۔

اور

جب سرمایہ گردش میں رہے تو یہ بات ملک کے لیے خوش آئند ہوتی ہے۔

ہمارا معاشرہ' ہماری سوچ' ہمارا طریق کار امریکنوں سے بالکل مختلف ہے۔ ہم جو کچھ بھی کماتے ہیں اس کو یوں عیش کرنے کے لیے خرچ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہر وقت بچوں کی

فکر رہتی ہے۔ انہیں پڑھانا ہے' لکھانا ہے یا کام سکھا کر پاؤں پر کھڑا کرنا ہے۔ ان کی شادیوں پر حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنا بھی ہم نے اپنی ذمہ داریوں میں ڈالا ہوا ہے۔ حال میں جیتے ہوئے بھی مستقبل کے لیے مرتے رہتے ہیں۔

جبکہ

امریکہ میں یہ بات نہیں۔ بچہ سولہ سترہ سال کا ہو جائے تو وہ اپنی ذمہ داریاں خود اٹھاتا ہے۔ چھوٹے موٹے کام کرتا ہے اور پیسہ کماتا ہے۔ وہ والدین پر بار نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہاں یہ سسٹم ہے کہ بچوں کی شادیوں پر بے تحاشا پیسہ خرچ کرنا ہے۔ اس لیے ساری عمر پیسہ پیسہ جوڑا جائے۔ پیٹ کاٹ کر بیٹیوں کا جہیز بنایا جائے...... خود کو کسی سہولت سے استفادہ نہ کیا جائے' سہولت پر خرچ ہونے والا پیسہ بچا کر رکھا جائے۔ میں یہ خواص کی نہیں پاکستانی عوام کی بات کر رہی ہوں۔

جبکہ امریکہ میں والدین ایسا کوئی تردد نہیں کرتے۔ وہ چاہے فیملی والے ہیں یا بے فیملی سب کا ایک ہی دستور ہے۔

ہم وہاں ایک ایسے آدمی سے بھی ملے جو بہت بڑی جائیداد کا مالک تھا۔ بیسیوں مکان اپنے تھے جو کرایے پر اٹھے تھے۔

لیکن

اس کا بیٹا اور بہو ایک چھوٹے سے کرایے کے مکان میں رہتے تھے۔ ہمیں یہ سن کر حیرانی ہوئی تھی۔ جب اس باپ سے پوچھا کہ آپ کے پاس اتنے مکان ہیں اور آپ کا بیٹا کرایے پر رہ رہا ہے۔

تو وہ بڑے پرسکون لہجے میں بولا ''یہ سب مکان میرے ہیں۔ میرے بیٹے کے نہیں۔''

عجیب منطق!

ہمیں یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ بچوں سے بڑھ کر بھی کوئی شے دنیا میں ہو سکتی ہے۔ ان کی سہولت اور آرام کا خیال والدین نہ کریں گے تو کون کرے گا۔

لیکن

ہماری یہ سوچ مشرقی سوچ تھی۔

اور

اس وقت ہم امریکن معاشرے کے طور طریق دیکھ رہے تھے۔

ہمارے اور امریکن معاشرے میں جو تضاد و تفاوت ہے۔ وہ ہم لوگ دیکھ رہے تھے۔ بے شمار اچھی باتوں کے اس قسم کی باتیں بھی دیکھنے کو ملتی تھیں جنہیں ہمارا ذہن' دل اور دماغ قبول نہیں کرتا تھا۔

میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ امریکی معاشرہ ہمارے معاشرے سے قطعاً مختلف ہے۔ وہاں پر انسان کو ہر قسم کی آزادی ہے سوائے قانون شکنی کے۔ جنسی آزادی کو تو ہم بے راہ روی کہتے ہیں۔ نہ ہی اسے اچھی بات سمجھتے ہیں لیکن وہاں سن بلوغت کو پہنچتے ہی ہر لڑکی اور لڑکے کو قانونی حق ہے کہ وہ آپس میں جس طرح چاہیں ملیں...... ڈیٹس پر جائیں' جنسی ملاپ رکھیں۔ یہ ان کا حق ہے۔

ہائی سکول پاس کرنے کے بعد وہاں ایک رسم کی تقریب ہوتی ہے' جسے پروم کہتے ہیں۔ اس تقریب میں والدین اپنی بیٹیوں کو خاص طور پر سجا بنا کر بھیجتے ہیں۔ حیثیت نہ بھی ہو پھر بھی اقساط پر ان کے لیے دیدہ زیب لباس خریدتے ہیں تاکہ تقریب میں ان کی بیٹی سب سے خوبصورت نظر آئے۔

اس تقریب میں لڑکے لڑکیاں اپنے لیے ساتھی چن لیتے ہیں۔ یعنی کپل بن جاتے ہیں۔ چونکہ سکولوں میں ان کو جنسی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس لیے ان کے لیے ملنا ملانا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ یہ جوڑے آپس میں جب چاہیں جہاں چاہیں ملتے ہیں اور جو جی چاہے کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کا انہیں حق ہوتا ہے۔ ہائی سکول پاس کرتے وقت تو ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس ہوتی ہے۔

لیکن

وہاں چھوٹی چھوٹی عمر کی بچیاں اور بچے بھی جنسی ملاپ سے آگاہ ہوتے ہیں اور

اکثر وہی کچھ کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے کے لحاظ سے سراسر غلط اور بے حیائی پر محمول کیا جاتا ہے۔ کئی بچیاں تیرہ چودہ سال کی عمر میں مائیں بھی بن جاتی ہیں اور یوں امریکہ میں غیر قانونی بچوں کی تعداد میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔

ایسی بن بیاہی ماؤں کے دوست بچے کی ولادت کا بار نہیں اٹھاتے اور انہیں چھوڑ چھاڑ بھاگ جاتے ہیں۔ ان پر قانون کی کوئی گرفت نہیں ہوتی۔

''پروم'' میں بنے ہوئے جوڑے زندگی بھر نباہ نہیں کر پاتے۔ کبھی لڑکی چھوڑ کر کسی دوسرے کو دوست بنا لیتی ہے اور کبھی لڑکا کسی اور لڑکی کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

اس بات کا بھی وہاں عام طور پر برا نہیں منایا جاتا۔ یہ جوڑے لیلیٰ مجنوں تو ہوتے نہیں جو ایک دوسرے سے بچھڑ کر جانوں پر کھیل جائیں۔ وقتی طور پر جنس کے بندھن میں بندھتے ہیں۔ پھر یہ بندھن ٹوٹ بھی جائے تو کسی اور سے جوڑ لینا ان کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔

یہ جوڑے تو شادی کے بندھن میں بندھے نہیں ہوتے۔ وہاں تو شادی شدہ جوڑے بھی بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر رشتہ ازدواج توڑ لیتے ہیں۔ طلاق کا جو ریٹ امریکہ میں ہے' فی الحال کسی دوسرے ملک میں نہیں۔

شمیم کے ہاں پاکستان سے آنے والے سارے لوگ پہنچ چکے تھے۔ روزانہ یہاں رہنے والے رشتہ دار بھی آ جاتے۔ رات کا کھانا تو تقریباً سبھی وہیں کھاتے' کیونکہ شادی کا ہلا گلا رات گئے تک جاری رہتا۔

شمیم نے اپنے حساب سے تو راشن جمع کیا ہوا تھا' لیکن لاگت زیادہ تھی۔ اس لیے اس دن وہ مزید راشن خریدنے کا پروگرام بنا رہی تھی کہ ہم چاروں بولیں ''شمیو ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گی۔ جب سے آئے ہیں باہر نکلے ہی نہیں۔ چلو آج تمہارے ساتھ گروسری کے بہانے ہی باہر ہو آتے ہیں۔

''چلو'' وہ بخوشی بولی۔

میں' نسیمی' گڈی اور رقیہ فٹافٹ تیار ہو گئیں۔ تیار کیا ہونا تھا۔ سردی کے پیش نظر

موٹے کپڑے پہنے۔ رات برف گری تھی اور اب ہوا چل رہی تھی اس لیے موسم بے حد ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس لیے گرم جوڑے، سویٹر، شالیں، کوٹ سبھی کچھ اپنے اوپر چڑھا لیا۔ شمو نے ہمیں اونی ٹوپیاں دیں۔ دو دو گرم جرابیں پہنیں اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ شمو گروسری کرے گی اور ہم سڑکوں پر گھومیں پھریں گے۔ لوگوں کو دیکھیں گے۔ دکانوں اور سٹوروں میں جائیں گے۔

شمو نے اپنا جیپڑ نکالا۔ بڑی سی ڈبل سیٹوں اور پیچھے سے خالی ڈبے کی طرح کا جیپڑ اس نے انہی کاموں کے لیے رکھا ہوا تھا۔

میں شمیم کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور باقی تینوں پچھلی سیٹ پر۔ گاڑی میں ہیٹر آن تھا۔ اس لیے چند منٹ بعد ہی ہمیں گرم کپڑے چبھنے لگے۔ کسی نے کوٹ اتارا۔ کسی نے گلے کے گرد لپٹی شال۔ ٹوپیاں تو سب نے ہاتھوں میں پکڑ لیں۔

"ایک دم ہی سب کچھ نہ اتار پھینکو۔ ابھی گاڑی سے باہر نکلو گی تو شدید سردی سے دوچار ہونا پڑے گا......"

"سٹور تو ایئر کنڈیشنڈ ہی ہوگا نا۔"

"ہاں وہ تو ہوگا ہی۔"

"تم گاڑی سٹور کے دروازے کے سامنے روکنا۔ ہم جلدی سے اندر چلے جائیں گے......"

"گرم کپڑے پہنے رہو۔ سٹور میں خاصا خوشگوار محسوس کرو گے تم لوگ۔"

"لیکن یہ ٹوپیاں پہن کر ہم اندر نہیں گھومیں پھریں گے۔"

"تمہاری مرضی......"

شمو نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی۔ سٹور سامنے ہی تھا لیکن وہاں تک پہنچتے ہوئے جسم کپکپا اٹھے۔ اندر جا کر بھی کافی دیر سردی نے اثر دکھایا۔

گروسری کا یہ نیوجرسی کا شاید سب سے بڑا سٹور تھا۔ خریداری کے لیے کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔

"ایک ایک کارٹ پکڑ لو۔" شمو بولی۔ "میں بتاتی جاؤں گی وہ چیزیں اٹھا کر ٹرالی میں ڈالتی جائیں......"

"ٹھیک۔"

ہم نے برآمدے میں ایک دوسرے میں پھنسی ٹرالیوں کی لائن میں سے ایک ایک ٹرالی نکالی۔ بعض سٹوروں میں اس طرح ٹرالیاں کھڑی کر کے لاک کر دی جاتی ہیں۔ پھر ان کے سامنے کے سوراخ میں سکہ ڈالیں تو لاک کھل جاتا ہے اور ٹرالی نکال لی جاتی ہے۔

بڑے سے برآمدے میں سٹور کے دو دروازے کھلتے ہیں۔ ایک اندر جانے کے لیے دوسرا باہر آنے کے لیے۔ یہ خودکار دروازے ہوتے ہیں۔

سٹور کے اندر داخل ہوں تو دائیں ہاتھ سبزیوں اور پھلوں کے ریکس پڑے ہوتے ہیں۔ ان پر تازہ سبزیاں دھلی دھلائی بڑے سلیقے سے رکھی ہوتی ہیں۔ یہ سٹال دیوار کے ساتھ لگے ہوتے ہیں۔ دیوار کے ساتھ آئینے لگے ہوئے ہیں۔ سبزیوں کا عکس ان میں بھی نظر آتا ہے جو بڑا بھلا لگتا ہے۔

میں نے بشرہ کے ساتھ بھی ایک فوڈ سٹور دیکھا تھا جو اس سٹور سے بہت چھوٹا تھا۔ جتنا بڑا یہ سٹور تھا اسی حساب سے یہاں سامان خورونوش بھی پڑا تھا۔ یہاں سبزیوں کے ریکس صرف دیوار کے ساتھ ہی نہ تھے۔ بلکہ درمیان میں کوئی آٹھ دس فٹ جگہ چھوڑ کر سامنے بھی ویسے ہی ریکس تھے۔ ان پر بھی بالکل تازہ سبزیاں سجا کر رکھی ہوئی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پلاسٹک کے لفافوں کی ریلیں لٹک رہی تھیں۔ لفافہ اتاریئے اور مطلوبہ چیز اس میں ڈال کر کارٹ میں ڈال لیں۔ اسی طرح جگہ جگہ صاف ستھرے جدید قسم کے ترازو بھی رکھے تھے۔ جن میں آپ سبزی کا وزن کرنا چاہیں تو کر لیں۔ ورنہ قیمت ادا کرتے وقت کاؤنٹر پر تو وزن کر ہی لیا جاتا ہے۔

اس طرح

دونوں طرف ریکس میں ہر قسم کی سبزیاں بچھی تھیں۔ ان کے اوپر سبزیوں کے نام

اور قیمت کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ آلو' مٹر' گوبھی' گاجر' پالک' ٹماٹر' ادرک' دھنیہ' دیسی مولی' ولائتی مولی' شلغم غرضیکہ ہر قسم کی سبزیاں موجود تھیں۔ چند سبزیاں ایسی بھی تھیں جن کے نہ تو ہم نے نام کبھی سنے تھے نہ ذائقہ چکھا تھا۔ پتہ نہیں امریکہ کے کس خطے کی پیداوار تھیں۔

ہم شمو کی ہدایات پر سبزیاں اپنی اپنی کارٹ میں رکھ رہے تھے۔ پیاز نائیلون کے بڑے بڑے خانوں والے تھیلوں میں تول تول کر رکھا ہوا تھا۔ میں اور نسیمی سبزیاں اور لہسن' پیاز' ادرک اپنی کارٹ میں رکھ چکے تو تیسری لائن میں مڑ گئے۔ یہاں تازہ بڑے بڑے خوش رنگ مالٹے' سیب' کیلے' انار' ناشپاتیاں' خربوزے' تربوز پڑے تھے۔ تربوز اور خربوزے آدھے آدھے کاٹ کر مہین پلاسٹک میں لپٹے ہوئے تھے۔ یہاں بے موسمی آم بھی تھے جو سبز اور کاسنی رنگ کے بھدی سی شکل کے تھے۔ ہمارے ملک کے خوبصورت اور خوش ذائقہ آموں سے ان کا مقابلہ نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ بھی کسی سبزی قسم کی چیز ہے۔ باقی پھل دیکھنے میں بے انتہا خوبصورت اور حجم میں بڑے تھے۔ یعنی مالٹے ہمارے ہاں کے مالٹوں سے زیادہ صحت مند اور سیب بھی بڑے بڑے اور مختلف رنگوں کے تھے۔ کیلے بھی موٹے اور بڑے بڑے اور بھی دنیا جہان کے پھل تھے۔ ہم نے جتنا پھل شمو سے کہا تھا کارٹ میں ڈالا اور آگے چل دیئے۔ کرسمس قریب آ رہا تھا اس لیے یہاں ہم نے خوبصورت سنہری لال پیلے کاغذوں سے سجی ٹوکریاں بھی دیکھیں۔ ان میں پھل اس طریقے سے رکھے جاتے تھے کہ دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتے تھے۔ یہ ٹوکریاں لوگ کرسمس پر پھل سے سجا کر دوستوں' رشتہ داروں کو دیتے تھے۔ ویسے بھی کسی کے ہاں جانا ہو تو ان نفیس ٹوکریوں میں سجا صحت مند قسم کا پھل بہت خوبصورت لگتا ہے۔

ریکس میں ہر قسم کے پھل اناناس' ناریل' انگور' کھجور سبھی قسم کے پھل تھے۔ ایک بات کہ سب صاف ستھرے' موٹے تازے اور خوش رنگ تھے۔ یہاں بھی دو ایک پھل ایسے دیکھے جو جانے کس ملک کے تھے۔ ہم نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔

پھل خریدنے کے بعد ایک چبوترہ قسم کے سٹال پر پہنچے۔ یہاں ڈرائی فروٹ جس میں کالی کشمش بہت نمایاں تھی۔ سنا ہے کہ امریکی یہ کالی کشمش بڑی رغبت سے کھاتے

ہیں۔ اس کے علاوہ بادام بہت ہی عمدہ قسم کے تھے۔ سائز سب کا ایک جتنا۔ بادام کی نکلی ہوئی گریاں بھی وہاں پڑی تھیں۔ گری اور پستہ وغیرہ بھی تھے۔ مونگ پھلی بھی خوب موٹی تھی۔ یہاں چلغوزے نظر نہیں آئے۔ ورنہ دنیا کا خشک میوہ یہاں موجود تھا۔

ہم یہ سٹال دیکھ ہی رہی تھیں کہ اگلی لائن سے شمو ہمیں دیکھ کر بولی "ڈرائی فروٹ میں نے لے لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو پھر ادھر جائیں نا دوسری چیزیں لینے۔"

"چلے جاتے ہیں۔ ہم تو ہر چیز دیکھنے کے شوق میں ادھر آئے ہیں۔"

شمو ہنس پڑی۔

ہم دونوں آگے بڑھ گئیں۔

اب ہم جس لائن میں گھسیں' ادھر دونوں طرف پانچ چھ فٹ اونچے ریکس تھے جن کے اوپر قرینے سے دالیں' چاول' آٹا' گھی' مرچ مصالحے قسم کی چیزیں پڑی تھیں...... گھی کئی قسم کے تھے۔ گتے کے ڈبوں میں پیک بھی اور ٹن میں بھی۔ مختلف سائز اور مختلف اقسام کے گھی اور کوکنگ آئل تھے۔ اصلی گھی بھی تھا۔ وہ بھی مختلف سائز کے ڈبوں میں تھا۔ اسی طرح چاول کئی قسم کے اور مختلف قسم کے پیک میں دستیاب تھے۔ یہی حال دالوں اور مرچ مصالحوں کا تھا۔ آپ نے تھوڑی چیز لینی ہے تو چھوٹا پیک اٹھا لیں' زیادہ تو بڑا۔ اسی طرح بے شمار قسم کی چائے کے ڈبے بھی وہاں موجود تھے۔

ہر گتے اور ٹین کے ڈبے پر جو کچھ ان میں تھا پوری وضاحت سے لکھا ہوا تھا۔ کس چیز میں کتنی کیلوریز' وٹامن کتنے پرسنٹ ہے' گھی گائے کے دودھ کا ہے یا کسی سبزی سے تیار شدہ ہے۔ سب کچھ اوپر لکھا ہوتا ہے اور کمال کی بات کہ جو کچھ لکھا ہوتا ہے اس میں وہی ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کا تو شاید امریکی لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔

غرضیکہ

دونوں طرف کے ریکس پر ایسی چیزیں خوبصورت پیک میں رکھی ہوئی تھیں۔

بعض کی قیمتوں کی چٹیں بھی ساتھ لگی تھیں اور بعض پر کالی چھوٹی چھوٹی کمپیوٹر کی زبان میں لکیریں نظر آتی تھیں۔ اس لائن سے گڈی اور رقیہ بھابی مطلوبہ چیزیں لے جا چکی تھیں۔ اس لیے میں اور نسیمی محض تجسس سے ریکس میں رکھی چیزیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔

ایسی دو اور قطاروں کی چیزیں دیکھتے ہوئے ہم سامنے والی دیوار کی طرف آ گئیں۔ سبزی اور پھل کے سٹال جہاں ختم ہوئے تھے وہاں سے ہم نے اس دیوار کے ساتھ ساتھ بڑھنا شروع کیا۔

یہاں بڑی بڑی شیشے کی الماریاں دیواروں کے ساتھ لگی تھیں۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ تھیں۔ ساتھ ساتھ کھڑی الماریاں جن کے اگلے حصے شوکیسوں کی طرح تھے مختلف قسم کی چیزوں سے بھرے تھے۔ کسی میں مکھن' کسی میں پنیر' مکھن بھی کئی اقسام کے۔ چکنائی سے پاک' چکنائی والے' مختلف پیکوں میں چوکور ٹکیوں کی صورت' گول ٹکیوں میں۔ گتے کی ڈبیوں اور ایلومونیم کے کاغذوں میں۔ بعض گرل کیے ہوئے مکھن تھے۔ بعض میں کالی مرچ اور نمک ملا ہوا تھا۔ اتنی اقسام تھیں کہ دیکھتے ہوئے بھی خاصا وقت لگا۔ مکھن ٹکڑیوں میں تھا یا ڈبوں میں سب کے اوپر ان کی اجزائی ترکیب لکھی ہوئی تھی۔

اگلی الماری میں پنیر تھا۔ پنیر امریکیوں کی پسندیدہ چیز ہے۔ اس لیے اس میں تو مکھن سے بھی زیادہ اقسام تھیں۔ کئی قسم کی پیکنگ کے علاوہ کھلا پنیر بھی تھا۔ جو مہین پلاسٹک میں لپٹا ہوا تھا۔ اس میں کٹی ہوئی باریک بند گوبھی اور ایک خاص قسم کی سبزی شامل کی گئی تھی۔ اسے عام طور پر برگر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک اور طرح کا کھلا پنیر بھی وہاں پڑا تھا۔ یہ پشاور کے پنیر سے بہت مشابہ تھا۔

ہم نے مکھن اور دوسرے پنیر کے ساتھ یہ گولا بنا پنیر بھی کارٹ میں رکھ لیا۔ چونکہ ہم پشاور میں یہ پنیر بہت شوق سے کھاتے رہے تھے اس لیے یہ پنیر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

ہم آگے بڑھتے ہوئے مختلف فریزروں اور ان الماریوں میں رکھی چیزیں دیکھ رہے تھے۔

ایک ایسی ہی شیشے کے پٹ والی الماری میں آئس کریم نظر آئی۔ یہ بھی چھوٹے پیک سے لے کر بالٹی تک میں موجود تھی۔ مختلف ذائقوں کی اتنی اقسام کی آئس کریم تھی کہ منتخب کرنا مشکل ہو گیا۔ لٹر کے پیک بھی تھے لیکن شمو نے کہا تھا کہ بالٹی والی آئس کریمیں اٹھائیں۔ یہ آئس کریمیں بھی گائے کے خالص دودھ سے تیار کی ہوئی تھیں۔ بعض تو بادام پستے سے بھری ہوئی تھیں۔ ہر قسم کا فلیور تھا۔ ہم نے اپنی اپنی پسند سے پانچ پانچ لیٹر والی پلاسٹک کی خوبصورت بالٹیوں میں بند آئس کریم اٹھائی۔

اب ہماری ٹرالیاں بھی بھرتی جا رہی تھیں۔ آگے بیکری کے سٹال اور اسی طرح کی کھلی لیکن ایئر کنڈیشنڈ الماریاں تھیں۔ بیکری کی چیزوں پر درج ہوتا ہے کہ یہ چیزیں کس کس میٹریل سے تیار ہوئی ہیں۔ امریکہ میں اکثر سور کی چکنائی سے بسکٹ جنہیں کوکیز کہا جاتا ہے' تیار ہوتے ہیں۔ یہ پیکٹ کے اوپر لکھا بھی ہوتا ہے۔ یہاں کئی قسم کے بسکٹ' پیسٹریاں' پیزے تھے۔ کیک بھی ہر طرح کے موجود تھے لیکن ہم نے کوئی چیز نہ اٹھائی۔

"یہ شمو ہی لے گی۔ کہیں ہم سور کی چربی والی چیزیں ہی نہ لے لیں۔" نسیمی نے کہا۔

"ویسے تو سب کچھ اوپر لکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا "لیکن بہتر ہے یہ چیزیں شمو ہی خریدے......"

ہم دونوں اپنی اپنی کارٹ دھکیلتی آگے بڑھ گئیں۔ دیوار ختم ہو گئی تھی۔ اس لیے ہم وہاں سے بائیں ہاتھ والی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ وہاں چھوٹی چھوٹی دکانوں کے قسم کے سٹال تھے جن پر بند' ڈبل روٹی' انڈے اور کارن فلیکس' ویٹا بکس اور اسی طرح کے کئی قسم کے سیریل کے ڈبے پڑے تھے۔ ہم نے ہر قسم کے سیریل کا ایک ایک ڈبہ ٹرالی میں رکھ لیا۔ دوسرے سٹال پر انڈے تھے۔ جو گتے کے مخصوص ڈبوں میں الگ الگ خانے میں رکھے ہوئے تھے۔ ایسے ڈبوں میں اب پاکستان میں بھی انڈے مل جاتے ہیں۔ امریکہ میں انڈے گڈمڈ نہیں ملتے۔ یعنی کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ بلکہ وہاں انڈے دینے سے پہلے سیل گرل پوچھتی ہے کہ انڈے کس سائز میں چاہئیں۔ یعنی "سمال" میڈیم یا لارج۔ ان کی

قیمتیں بھی سائز کے حساب سے ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں خریدتے ہوئے ہم آگے بڑھے۔ سامنے والی قطار کے ریکس پر ہر قسم کے مربے' جیم' اچار اور کیچ اپ کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ ہم کچھ اٹھانے ہی والے تھے کہ رقیہ نے دوسری لین سے آواز دی۔ یہ سب ہم نے خرید لیا ہے۔

ہم آگے بڑھ گئے تو شمو اپنی کارٹ میں دودھ کی بڑی بڑی بوتلیں' اورنج جوس کے ڈبے اور بڑے سائز کی بوتلیں رکھے جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنی قسم کے جوس تھے۔

یہ سب جوس بالکل خالص ہوتے ہیں۔ جیسے تازہ پھل کا جوس بنتا ہے بالکل ویسا ہی ہوتا ہے۔ وہاں خشک جوس کے پیکٹ بھی عام ملتے ہیں جنہیں جب جوس پینا ہو تو چمچ بھر گلاس میں ڈال کر پی لیں۔

اب

اور

آگے بڑھے

تو شیشے کے بڑے بڑے ایئر کنڈیشنڈ شوکیسوں میں گوشت پڑا تھا۔ سؤر کا گوشت امریکیوں کو مرغوب ہے۔ اس لیے شوکیس میں سؤر کے مختلف حصوں کا گوشت پڑا تھا۔ ہم منہ بنائے ہوئے آگے بڑھے کیونکہ بحیثیت مسلم اس حرام شے کو دیکھ کر ہی جی متلانے لگا۔

اگلے شوکیس میں بیف تھا۔ مختلف جگہ کے مختلف ٹکڑے مختلف قیمتوں کی چٹوں کے ساتھ پڑے تھے۔ امریکہ میں بیف بہت مہنگا' مٹن بہت کم کھایا جاتا ہے۔ عام گروسری سٹور پر مٹن رکھا ہی نہیں جاتا۔

لیکن

یہاں پڑا تھا

اس کے بھی مختلف ٹکڑے ران' دستی' چانپ' گردن' سینہ وغیرہ الگ الگ۔

امریکہ میں مسلمان اور یہودی ذبیحہ گوشت کھاتے ہیں۔ یہودی اسے کوشر کہتے ہیں۔ ایک شوکیس میں کوشر بھی تھا۔

ایک شوکیس میں گائے کے پائے' زبان اور سری کا کٹا ہوا گوشت بھی پڑا تھا۔ اسی طرح ایک اور شوکیس میں بکرے کے پائے' سری کا گوشت اور زبانیں۔ اس کے علاوہ گائے اور بکرے کے مغز بھی پڑے تھے۔

شمو نے منع کیا تھا کہ گوشت یہاں سے نہیں خریدنا۔ وہ گوشت ایک مسلم دکاندار سے خریدا کرتی تھی۔ لاہور کا رہنے والا یہ مسلمان حلال گوشت دیتا تھا۔ بہت سے مسلمان اس سے ہی گوشت لیتے تھے۔ اس آدمی کا چھوٹا سا سٹور بھی تھا جس پر پاکستانی مصالحہ جات اور دیگر چیزیں ملتی تھیں۔ اس نے کیٹرنگ بھی شروع کر دی تھی۔ صائمہ کی مہندی کے کھانے کا آرڈر بھی شمو نے اسے ہی دیا تھا۔

گوشت کے شوکیسوں کو دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔ آگے مچھلی کا سٹال تھا۔ جہاں کئی قسم کی مچھلی تھی۔ دریائی بھی' سمندری بھی۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا حوض بھی ساتھ ہی بنا تھا جس میں زندہ سی فوڈ تھا۔ شرمپ کریب وغیرہ اس میں تیر رہے تھے۔ یہ لمبی لمبی ٹانگوں والے کیڑے مکوڑے دیکھ کر دل خراب ہونے لگا لیکن ہوٹل میں ایک دفعہ شرمپ کھائی۔ بے حد مزیدار چیز تھی۔

شمو نے مچھلی خود ہی خریدی۔

سب کارٹس بھر چکی تھیں۔ تقریباً سارا سودا خریدا جا چکا تھا اس لیے ہم کاؤنٹرز کی طرف آگے پیچھے بڑھنے لگیں۔

ہر کاؤنٹر کے قریب سٹینڈ والی سٹیل کی ٹوکریوں میں چاکلیٹس' ٹافیاں' آلو کے چپس وغیرہ پڑے تھے اور بھی کھانے پینے کی بہت سی چیزیں تھیں۔ ان کے سامنے الماریوں میں بند بوتلوں میں سرکے کے اچار چٹنیاں بھی تھیں۔ یعنی اگر یہ چیزیں سٹور سے لینا بھول گئی ہوں تو یہاں سے خرید لی جائیں۔

شمو نے بہت سے کٹ کیٹ کے پیکٹ' ٹافیوں کے تھیلے اور چاکلیٹس اپنی کارٹ میں ڈال لیں۔

اب کوک کے ٹنوں کے ڈبے باقی تھے۔ شمو نے ایک خالی کارٹ میں کئی درجن

کوک پیپسی اور سیون اپ رکھ لی۔

یہاں چونکہ خریداری کے لیے بے شمار لوگ آئے تھے' اس لیے اس طرف ایک ہی قطار میں کوئی آٹھ کاؤنٹر تھے' جن پر بیٹھی لڑکیاں خریداروں کا سامان اور قیمتیں چیک کر کے بل بنا رہی تھیں۔ کاؤنٹروں پر لیزر مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک لڑکی کارٹ میں سے چیزیں اٹھاتی' لکیروں والے حصے کو اس پر سے گزارتی' ہلکی سی ٹوں کی آواز آتی جس کا مطلب یہ ہوتا کہ کمپیوٹر نے چیز کی قیمت نوٹ کر لی ہے۔ یہ قیمت وہ خود ہی کیلکولیٹر کو دے دیتا ہے جو بل میں جمع کرتا جاتا ہے۔

اب ہمیں یہاں کچھ دیر انتظار کرنا تھا' کیونکہ پانچ ٹرالیاں تو ہماری ہی تھیں اور ہمارے آنے سے پہلے سارے کاؤنٹروں پر لوگ ٹرالی لیے کھڑے تھے۔ گو کام منٹوں میں نپٹایا جا رہا تھا۔

لیکن

پھر بھی

ہمیں کچھ دیر تو انتظار کرنا ہی تھا۔

ہم نے ٹرالیاں آگے پیچھے کر کے شمو کے حوالے کیں اور خود ان کاؤنٹروں کے پیچھے والی دو دکانوں کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ دکانیں کھانے پینے کی چیزوں کی تھیں۔ دونوں دکانوں پر خاصا رش تھا۔ کوئی برگر خرید رہا تھا' کوئی کافی' کسی نے پیزے کے لیے کہا تھا' کوئی کوکیز مانگ رہا تھا اور کوئی چپس لے رہا تھا۔

یہاں روسٹ گوشت اور چکن بھی تھا۔ چیز برگر بھی تھے۔ بسکٹ اور ٹافیاں بھی تھیں۔ سٹور میں ایسی دکانوں کو ''ڈیلی'' کہتے ہیں...... خریداری کرتے وقت کسی کو بھوک لگے تو یہاں آ کر کچھ نہ کچھ کھا لیتا ہے۔ یہاں ڈبوں میں بند مکمل لنچ بھی دستیاب ہوتا ہے۔ گتے کی ٹرے میں خانے بنے ہوتے ہیں' جن میں چکن روسٹ پیس یا گوشت کا فرائی چوکور ٹکڑا پڑا ہوتا ہے۔ دوسرے خانے میں آلو ابال کر ان کا گودا بنایا ہوتا ہے۔ کالی مرچ اور نمک

والا یہ گودا بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ تیسرے خانے میں مکئی کے ابلے ہوئے دانے ہیں اور ایک خانے میں چٹنی۔ یہ ٹرے بہت بڑی نہیں ہوتی۔ اس کے اوپر بعض اوقات ڈھکنا بھی ہوتا ہے جس پر اندر رکھی چیزوں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ آپ ڈھکنا کھولے بغیر ٹرے اٹھا لیں۔ ہر چیز آپ کو معیاری اور ویسی ہی ملے گی جیسی تصویر میں ہے۔

امریکہ میں کھانے پینے کے معاملے میں تو کسی چیز میں گڑبڑ ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر کام سائنٹیفک طریقے سے کیا جاتا ہے۔ فوڈ پراسسنگ میں امریکہ کی انڈسٹری بہت ٹاپ پر ہے۔ یہاں نمبر دو قسم کا مال رکھنے کا کوئی تصور ہی نہیں کیونکہ لوگ جانتے ہیں کہ ذرا سا بھی نقص ہونے پر دکاندار کو Sue کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اس پر مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔

ٹرے والے اور بھی کئی قسم کے لنچ یہاں دستیاب ہیں۔ کسی میں قیمے کے کباب' بند سلاد اور چٹنی ہے۔ کسی میں پنیر کے پیزے کے ساتھ روسٹ گوشت کے چوکور یا گول ٹکڑے ہیں۔ کسی میں پکی ہوئی چانپ کے ساتھ چپس اور ڈپ کی ڈبیہ ہے۔ غرضیکہ انواع و اقسام کے کھانے موجود ہیں جو آپ چاہیں تو وہیں اوون میں گرم کرا کے کھا لیں۔ چاہیں تو گھر جا کر فریزر میں رکھ دیں اور جب ضرورت ہو تو گرم کر کے کھا لیں۔ ایسے کھانے سٹوڈنٹس اور نوکری پیشہ افراد کے لیے بڑے اچھے اور بے سہولت ہیں۔

یہ تو بہت ہی بڑا سٹور تھا۔ امریکہ میں چھوٹے سٹور بھی اس طرز کے ہوتے ہیں۔ تین طرف دیواروں کے ساتھ شیشے کی الماریاں' فریزر' شوکیس اور درمیانی ہال میں پانچ چھ فٹ اونچے ریکس کی قطاریں جہاں سے ہر چیز مل جاتی ہے۔

آج کل پاکستان میں بھی اس طرح کے سٹور بن رہے ہیں...... پہلے لاہور میں ''پیس'' بنا تھا۔ اب لاہور ڈیفنس میں ''میس مارٹ'' ہے۔ ایچ کریم بخش ہے۔ لبرٹی میں الفتح بھی ہے۔ کراچی میں بھی یقیناً ایسے سٹور بنے ہیں اور بن رہے ہیں۔

لیکن

امریکہ کا چھوٹے سے چھوٹا سٹور بھی ''پیس'' یا ''میس مارٹ'' سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ پارکنگ کی جگہ بھی بہت وسیع ہوتی ہے اور وہاں کوئی گاڑیاں الٹ پلٹ کھڑی بھی نہیں کر سکتا۔

امریکہ کے بڑے اور نامی سٹوروں کی تو بات ہی اور ہے۔ ترتیب طریقہ سب کا یہی ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔ ایسے سٹوروں کی شاخیں پورے امریکہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔

گروسری کے ان سٹوروں میں جہاں تازہ چیزیں ملتی ہیں' وہاں ٹن فروٹ اور ٹن کی سبزیاں بھی عام ہیں۔ خشک قیمہ اور خشک مچھلی بھی بند ڈبوں میں ملتی ہے۔ فروزن مرغیاں بھی جتنی چاہیں' مل جاتی ہیں۔

ان کے علاوہ کئی قسم کے تیار سلاد بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ سلاد وہیں خرید کر کھائے لیکن گھر لے کر نہیں آئے۔

شمو نے چیزیں چیک کروائیں' بل لیا اور اپنے بینک کارڈ کے ذریعے ادا کیا۔

عام طور پر امریکہ میں خریداری کارڈ پر ہوتی ہے۔ ویسے سٹوروں کے باہر منی مشینیں بھی نصب ہوتی ہیں۔ کیش کی ضرورت ہو تو کارڈ ڈال کر مطلوبہ کیش لیا جا سکتا ہے۔

گھر آ کر سب نے مل کر سودا سلف سنبھالا۔ شمو کے دو بڑے فریزر گیراج میں بھی پڑے تھے۔ ان میں سے ایک کو تو گوشت' مرغی' قیمے وغیرہ کے لیے خالی رکھا گیا۔ باقی فریزر اور فریج چیزوں سے بھر گئے۔

"شمو یہ سارا سودا کتنے کا آیا ہے۔" رقیہ نے پوچھا۔

شمو ہنس کر بولی "کیوں پیسے دینے ہیں۔"

"نہیں تو۔ ویسے ہی پوچھ رہی ہوں۔ اتنا زیادہ سامان اتنی زیادہ چیزیں!"

"اور آئی ہیں کل ڈیڑھ ہزار میں۔ ان میں گوشت کے پیسے بھی شامل ہیں اور مرغیوں کے بھی جن کا آرڈر میں نے دے دیا ہوا ہے' کل لائیں گے۔"

"کل ڈیڑھ ہزار؟" نسیمی نے حیرانگی سے کہا۔

"یہاں کھانا پینا کافی سستا ہے۔" شمو بولی۔

"واقعی......" نسیمی بولی "ان پیسوں میں دو بکرے' بیس مرغیاں بھی شامل ہیں۔"

"گائے کے چار بڑے سائز کے پائے اور بکرے کے بارہ مغز بھی" شمو نے کہا۔

"بہت سستا ہے امریکہ۔ خوراک کے لحاظ سے۔"

میں ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور ڈیڑھ ہزار ڈالر کو پینتالیس سے ضرب دے کر سوچ رہی تھی کہ یہ سودا ہمارے ہاں کے ساٹھ ستر ہزار کا بنتا ہے۔ پھر بھی کہا جا رہا ہے کہ سستا ہے۔

میں نے یہی بات سب سے کہی تو شمو بولی "آپا ہم یہاں ایک ڈالر کو ایک روپیہ ہی گنتے ہیں۔ یہاں لوگ ڈالروں میں تنخواہ لیتے اور ڈالروں ہی میں خرچ کرتے ہیں...... اس لیے قطعاً کوئی چیز مہنگی نہیں لگتی۔ اب دیکھیں نا کوک کا ٹن یہاں ایک ڈالر کا ہے اور وہاں نو دس روپے میں تو ملتا ہوگا؟"

"لیکن ایک ڈالر کا مطلب پینتالیس روپے ہے شمو۔"

"وہ آپ لوگوں کے لیے۔"

"لیکن ہے تو......"

"آپا یہاں لوگوں کی آمدنی پاکستان سے بہت زیادہ ہے۔ دوسرا ڈالر میں کماتے اور ڈالر ہی میں خرچ کرتے ہیں۔ کھانا پینا امریکہ میں خالص اور سستا ہے۔"

میں چپ ہو گئی۔

بات ٹھیک ہی ہو گی۔

لیکن

مجھے ڈیڑھ ہزار ڈالر میں یہ سارا سودا پھر بھی سستا نہ لگا۔

خیر

آج ہم نے نیو جرسی کی کافی سڑکیں ماپی تھیں۔ شاہراہ پر سے بھی گزرے تھے اور بہت بڑے گروسری سٹور کا تفصیلی جائزہ بھی لیا تھا۔ دوسرے دن لاہور کے مسلم آدمی کے سٹور پر گوشت' قیمہ اور مرغیاں خریدنے بھی گئے۔ وہاں لاہوری تکے کباب بھی ملتے تھے اور نان بھی۔ ہم نے اس کے سٹور کے چھوٹے سے ریسٹورنٹ والے حصے میں کھانا کھایا۔ یوں لگا لاہور کی کسی تکے کباب کی شاپ میں بیٹھے ہیں۔ دکاندار نے اپنے شہر لاہور کے رہنے

والوں کی خوشدلی سے خاطر و مدارت کی۔ وہ تو کھانے کے پیسے بھی نہیں لے رہا تھا جو شمو نے زبردستی دیئے۔ اس کا چھوٹا بھائی بھی خاطر تواضع کرنے میں پیش پیش تھا۔ وہی تکوں اور کبابوں کی سیخیں لگا رہا تھا اور پیش کر رہا تھا۔ دیارِ غیر میں جا کر پرائے بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بالکل درست لگی۔

ہم سب اس شخص کی مروت سے بڑے مرعوب ہوئے۔ کچھ دیر اس سے باتیں بھی کیں۔ اسے امریکہ آئے پانچواں سال تھا۔ ایک بار بھی پاکستان نہ جا سکا تھا۔ اس لیے لاہور کی بابت ہم سے کئی باتیں یوں پوچھ رہا تھا جیسے پورے شہر میں ہی اس کے رشتہ دار رہتے ہوں۔ اس کے لہجے اور باتوں میں خلوص تھا۔ وہ اپنے شہر سے اداس بھی ہو رہا تھا۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے شمو ہنس کر بولی "بٹ صاحب آپ' ہور سے اتنے ہی اداس ہو رہے ہیں تو پاکستان کا چکر کیوں نہیں لگا آتے۔ اب تو ماشاءاللہ آپ کا سٹور بھی خوب سیٹ ہے اور کام بھی بہت اچھا چل رہا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب" وہ بولا "آپ کی بات بجا لیکن مجھ سے زیادہ میری بیوی وہاں جانے کی خواہشمند ہے اور یہ بھائی بھی اداس ہے۔ اب بتائیں تین بندے کیسے جائیں۔ ابھی تو بمشکل پیروں پر کھڑے ہوئے ہیں۔"

کچھ دیر ہم اس لاہوری بٹ سے باتیں کرتے رہے۔ وطن کی کشش ان کے دلوں میں تھی۔ امریکہ کا سفر وسیلۂ ظفر ضرور تھا لیکن اپنے وطن کی مٹی سے پیار انہیں اب بھی تھا جو شمو کے دل میں قطعاً نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اس کی باتوں پر تمسخرانہ ہنسی ہنس رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کے عزیز و اقارب' بھائی' بہن آپ کو آ کر مل جاتے ہیں نا...... اس لیے آپ کو پاکستان کی یاد نہیں ستاتی......"

شمو ہنس کر بولی "بٹ صاحب ایسی بات بھی نہیں۔ میں چھبیس سالوں میں چار بار پاکستان جا چکی ہوں......"

"شمو! بٹ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ہر سال تمہارے پاس کوئی نہ کوئی ضرور آتا ہے اس لیے تمہیں یہ دوری زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ پھر فون کے سلسلے بھی تم سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہر بات تم تک پہنچ جاتی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

گوشت' قیمہ اور مرغیاں لے کر ہم واپس نکلے۔ راستے میں سیون الیون پر رکے۔ شمو نے سب کو آئس کریم کھلائی۔

سیون الیون چھوٹے چھوٹے سٹور ہیں۔ جن میں عام ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ ان کی ہزاروں شاخیں پورے امریکہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔

واپس آ کر سودا سنبھالنے کے بعد بھابی نے بڑی مزیدار چائے بنائی۔ آمنہ اور آصف بھی آ گئے تھے۔ سعدیہ اور عاطف دونوں نیو یارک گھومنے پھرنے گئے ہوئے تھے۔ خالد بھی کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا اس لیے شمو کی گاڑی لے گیا ہوا تھا۔

امریکہ میں لائسنس کے بغیر گاڑی چلانے کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ باہر سے آئے وہی لوگ گاڑی چلا سکتے ہیں جن کے پاس انٹرنیشنل لائسنس ہو۔

وہاں تقریباً ہر بالغ بندے کے پاس گاڑی ہوتی ہے۔ وہاں گاڑیوں کی بہتات ہے۔ لائسنس لینے سے پہلے ٹریفک کے رولز اور قوانین کے متعلق ایک کتابچہ لائسنس لینے کے خواہشمند کو دیا جاتا ہے' جسے وہ اچھی طرح پڑھتا اور قواعد و ضوابط کے متعلق علم حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کا روڈ ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ وہ اگر ٹیسٹ پاس کر لے تو لائسنس ملتا ہے۔ ورنہ اسے پھر ٹیسٹ کی تیاری کرنا پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ گھر بیٹھے لائسنس بن جاتا ہے یا بنا لائسنس ہی نوجوان گاڑیاں اڑائے پھرتے ہیں۔ امریکہ میں اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے گاڑی چلانا ممنوع ہے' نہ ہی لائسنس ملتا ہے۔

لیکن

پاکستان میں چودہ چودہ' پندرہ پندرہ برس کے مالدار لوگوں کے بچوں کو میں نے گاڑیاں چلاتے خود دیکھا ہے۔ جانے ان کے والدین کو بھی ذمہ داری کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ ایسے بچے اکثر حادثے بھی کر بیٹھتے ہیں لیکن وہ اس بات پر شیر ہوتے ہیں کہ انہیں کسی

سزا سے ان کے والدین اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بچا لیں گے۔

جبکہ

امریکہ میں ایسی بات نہ کوئی بچہ نہ ہی اس کے والدین سوچ سکتے ہیں۔ وہاں قانون کی خلاف ورزی پر بڑے سے بڑے لوگوں کے بچوں کو بھی ویسے ہی سزا ملتی ہے جیسے عام لوگوں کے بچوں کو۔ امیر، غریب یا اثر و رسوخ استعمال کرنے کا عام طور پر تصور ہی نہیں۔

ہاں تو

ہم سب لیونگ روم میں بیٹھ کر گرما گرم چائے پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔

رات تھوڑی برف پڑی تھی۔ سڑکیں تو صاف فوراً ہی کر دی جاتی ہیں۔ ہاں کسی لان یا ٹیرس کے اوپر برف کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ شمو کے باربی کیو والے ٹیرس پر بھی برف نظر آ رہی تھی۔ کچھ پگھل چکی تھی۔ کچھ باقی تھی۔ گھر چونکہ گرم تھا اس لیے باہر کی برفانی ہوا کا کوئی اثر نہیں تھا۔

چائے مزیدار تھی۔

"رات برف گری ہمیں پتہ ہی نہ چلا۔" چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے میں نے کہا۔

"پتہ چلا کر کیا کرنا تھا آپا۔" شمو ہنس کر بولی۔

"گرتی برف کا نظارہ کرتے۔" میں بولی۔

"ابھی بڑے دنوں برف گرے گی۔" اس نے کہا "لیکن اس دفعہ لگتا ہے برف زیادہ نہیں پڑے گی۔ پچھلے سال ان دنوں میرے پچھلے ٹیرس پر برف چار فٹ تک آ گئی تھی اور ڈرائیو وے تو روزانہ ہی صاف کروانا پڑتا تھا۔"

"کس سے صاف کرواتے ہیں......" رقیہ بولی۔

"آدمی بلا کر۔ پیسے دے کر۔ ویسے جب آصف یہاں رہتا تھا تو وہ روز صبح خود بیلچہ لے کر برف صاف کر دیا کرتا تھا۔"

آصف اور آمنہ اب الگ کرایے کے گھر میں رہ رہے تھے۔ یہاں صرف شمو اور صائمہ ہی تھیں۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ ہم میں سے کسی نے کہا "شمو کل کرسمس ہے۔"

"ہاں......"

"سنا ہے امریکی عیسائی کرسمس بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔"

"مذہبی تہوار سب لوگ دھوم دھام ہی سے مناتے ہیں جیسے عید بقر عید مسلمان جوش و خروش سے مناتے ہیں۔"

جب سے ہم امریکہ گئے تھے امریکی کرسمس کی خریداریوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس موقع پر عام طور پر وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے نئے ملبوسات خریدتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ جس سٹور پر بھی سیل لگی ہے وہاں سے خریداری کی جائے۔ چونکہ یہ تہوار انہوں نے شاندار طریق سے منانا ہوتا ہے اس لیے وہ پروا نہیں کرتے۔ انہیں علم ہوتا ہے کہ کرسمس کے فوراً ہی بعد گرینڈ کلیرنس سیل لگتی ہے اور چیزیں آدھی قیمت سے بھی کم پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔

امریکی کرسمس پر اپنے گھروں کو بھی خوب سجاتے ہیں۔ برقی قمقموں سے گھر کے سامنے اگر کوئی پودا ہے یا درخت اسے جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ یہ رنگ برنگی روشنیاں بہت بھلی لگتی ہیں۔

گھروں کے اندر یہ لوگ کرسمس ٹری بھی بناتے ہیں۔ اسے بھی رنگا رنگ پھول پتیوں اور رنگ برنگی قمقموں سے سجایا جاتا ہے۔ اس درخت کے نیچے والدین بچوں کے لیے گفٹ لا کر چھپا دیتے ہیں۔ صبح جب بچے اٹھتے ہیں تو وہ درخت کے نیچے رکھے گفٹ تلاش کر کے حاصل کرتے ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ گفٹ انہیں سانتا کلاز نے دیے ہیں۔

سانتا کلاز ایک روایتی شخصیت ہے جو بچوں کو تحفے دے کر محبتیں بانٹتا ہے۔ یہ ایک سفید بڑی بڑی مونچھوں اور سفید پھیلی ہوئی داڑھی والا لال لکیر دار کپڑے اور لال ٹوپی پہنے کرسی پر براجمان ہوتا ہے۔ سٹوروں میں بھی کرسمس ٹری کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کسی مرد نے یہ روپ دھارا ہوتا ہے۔

اور

کہیں

اس شکل وصورت کا بت بنا ہوتا ہے۔

سانتا کلاز امحبت اور مہربانی کی علامت ہے۔ بچوں کو گفٹ بھی اسی کے نام سے منسوب کر کے دیئے جاتے ہیں اس لیے امریکی عیسائی بچے اس روائتی شخصیت سے بہت مرعوب ہوتے ہیں اور اس سے پیار کرتے ہیں۔

ہمارے اصرار پر رات شمیم ہمیں گھمانے پھرانے لے گئی۔ ہم جس طرف سے بھی گزرے گھروں کے سامنے درخت اور پودے رنگین قمقموں اور سنہری نیلے پیلے کاغذوں سے سجے ہوئے پائے۔ حیثیت کے مطابق ہر ایک نے گھر کا بیرونی حصہ سجایا ہوا تھا۔

ہم چند سٹوروں میں بھی گئے جہاں بڑے بڑے کرسمس ٹریز کے ساتھ بڑے سے سائز کے سانتا کلاز اصاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی سٹور میں عام آدمی سانتا کلاز ا کا روپ دھارے بیٹھا تھا۔

اس رات ہم کافی لیٹ واپس آئے۔ کھانا بھی باہر ایک مال کے ریسٹورنٹ میں کھایا۔

پچیس دسمبر کو کرسمس گزرا۔

اور

اب

ستائیس کو صائمہ کی مہندی کی تقریب تھی۔

سب جوش وخروش سے مہندی کی تیاری میں لگ گئے۔ پاکستان سے آنے والوں کے علاوہ شمو نے تقریباً ستر اسی لوگ یہاں سے مہندی پر مدعو کیے ہوئے تھے۔ شمو کی سہیلیاں' ڈاکٹرز جن کا تعلق ہندوستان اور پاکستان سے تھا۔ صائمہ کی دو چار امریکن دوست لڑکیاں۔ نیو جرسی میں مقیم کچھ دور پار کے عزیز سب کو شمولیت کا دعوت نامہ بھیجا تھا۔

یہ تقریب گھر پہ ہی منعقد ہونا تھی۔

کیٹرنگ لاہوری بٹ صاحب کے ذمہ تھی۔ شمو کی کچھ ہندو ڈاکٹرز بھی آ رہی

تھیں اس لیے ان کے لیے مختلف قسم کی بھجیا اور ایسا کھانا بنوانے کا آرڈر دیا تھا جو گوشت کے بغیر ہو۔

دھوم دھڑکا تو کئی راتوں سے ہی ہو رہا تھا لیکن مہندی کی تقریب کے لیے لڑکے لڑکیاں خاص طور پر بھنگڑوں اور ڈانس کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ لڑکیاں تو دو تین ہی تھیں۔ یہ نئی بیاہی حمیرا' بشرۃ' صائمہ' نسیم' آمنہ زیادہ جوش وخروش دکھا رہی تھیں۔ عاطف' خالد' نسیم وغیرہ بھی دھوم دھڑکے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

مہندی کی رسم خالص پاکستانی طریق سے منائی جانا تھی اس لیے ایک دن پہلے ہی بازار سے رنگین اور سنہری کاغذ' گوٹے کی لڑیاں' موم بتیاں وغیرہ آمنہ' نسیمی اور گڈی خرید لائی تھیں۔

خالد نے شمو کے گھر کا فرنٹ اور جتنے پودے' درخت تھے بجلی کے رنگ برنگے قمقموں سے سجا دیے تھے۔ کون مہندی پاکستان ہی سے لائی ہوئی تھی۔ سارا دن سب مل کر گھر کو اندر سے بھی سجاتے رہے۔ وہ کرسی جس پر صائمہ کو بٹھانا تھا آمنہ نے بڑی نفاست سے سجائی۔ جہاں اس کرسی کو رکھنا تھا اس کے پیچھے کی لیونگ روم کی دیوار پر بھی گوٹے کے پھولوں کی لڑیاں اور سنہری کٹے ہوئے کاغذ ٹیپ سے چپکا کر خوبصورتی سے سجایا گیا۔

اس دن ہر کوئی مصروف تھا اور خوشی خوشی کام کر رہا تھا۔ مردوں کے لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا اور عورتوں کے لیے لیونگ روم میں جگہ بنائی گئی۔ ہر کمرے کا صوفہ' کرسی اور کشن یہاں رکھ دیے گئے۔

کھانے کا بندوبست کچن ہال میں تھا۔

شمو سب کو اتنی محبت اور چاہت سے تیاریاں کرتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ شاید اسے اپنوں کی اپنائیت کا مدتوں بعد آج احساس ہو رہا تھا۔

پروین بھابی نے صائمہ کی مہندی کا خاص جوڑا پنڈی سے بنوا کر اپنی بہو اور بیٹے کے ہاتھ بھیجا تھا۔ سبز اور پیلے رنگ کے جوڑے پر گوٹے کا خوبصورت اور دیدہ زیب کام کیا ہوا تھا۔ مہندی بھی سعدیہ لائی تھی۔ یہ کون مہندی تھی۔ اب تھالوں کو سجانے

کے لیے یہ مہندی کام نہ آسکتی تھی۔

اور

تھال سجانے رسم کے لیے ضروری تھے۔ ان کے لیے موم بتیاں' سنہری نیلے اور پیلے کاغذ' گوٹے کی پنیاں سب کچھ آچکی تھیں۔ شاید کسی پاکستانی یا انڈین سٹور سے سوکھی مہندی مل بھی جاتی لیکن اس وقت لینے کون جاتا۔ گھنٹوں کی ڈرائیو پر تو ایسے سٹور تھے۔

خیر

رقیہ بھابی کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

وہ جلدی سے کچن میں گئیں۔ جلدی سے آٹا گوندھا۔ اس کے دو پیڑے بنا کر دو تھالوں میں پھیلا دیے۔ پھر ایک مہندی کی بڑی کون کھولی اور مہندی آٹے پر اس طرح بچھا دی کہ لگتا تھا دونوں تھال مہندی سے بھرے ہیں۔

سب رقیہ کی اس ہوشیاری پر بہت خوش ہوئے۔ اب تھالوں کو گوٹے کی کترنوں' کاغذوں کی جھالروں' پتیوں اور موم بتیوں سے سجا لیا گیا۔

چلیے

مہندی تیار۔

ہاتھوں پہ مہندی تو سب نے کون ہی سے لگانا تھی۔ رسم کے لیے تھال تیار ہوگئے۔ وقت پر مہمان آنا شروع ہوگئے۔ سب نے پاکستانی جھلمل کرتے لباس پہنے تھے۔ ہندو ڈاکٹرز قیمتی ساڑھیاں زیب تن کیے تھیں۔ چند امریکی عورتیں جن میں شمو کی دوست مسز ڈریزیلہ اور اس کی بیٹی آینٹ بھی شامل تھیں' قیمتی لانگ ڈریس پہنے تھیں۔

ویسے یہ امریکن عورتیں پاکستانی اور ہندوستانی ڈریسز میں ملبوس عورتوں کو بڑے شوق اور تجسس سے دیکھ رہی تھیں۔ شمیم نے بھی پروین بھابی کا بھیجا ہوا جوڑا پہنا تھا۔ وہ تو کبھی کبھار شلوار قمیض پہن لیتی ہے۔

لیکن

صائمہ کے لیے گوٹے کناری والے کپڑے پہننے کا نیا تجربہ تھا۔ بچپن میں رقیہ

بھابی اس کے لیے عید بقرعید پر گوٹے والے کپڑے بنایا کرتی تھی لیکن اب اس نے شاید برسوں سے شلوار قمیض نہیں پہنی تھی۔ نہ ہی دوپٹہ اوڑھا تھا۔

خیر

اس نے کپڑے پہنے۔ آمنہ نے اسے دوپٹہ اوڑھایا جسے وہ سنبھال نہ پا رہی تھی۔

صائمہ کی ایک بچپن کی امریکن دوست سینڈی نے بھی آمنہ کا ایک جوڑا پہنا۔ پیلا جوڑا اور دوپٹہ اوڑھ کر وہ پاکستانی لڑکی دکھائی دینے لگی۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ ہر ایک کو اپنا لباس دکھاتی پھرتی' پوچھ رہی تھی' "میں کیسی لگ رہی ہوں"

"بہت اچھی۔" سب تقریباً یہی کہہ رہے تھے۔

صائمہ کو سب سہاگنیں اور آصف' عاطف سبز کامدانی دوپٹے کو تان کر اس کے نیچے لے کر آئے۔ یہ دوپٹہ عمیرا کا تھا۔

اسے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ جس طرح اسے سمجھایا گیا تھا اس نے اسی طرح سے کیا۔ خالص پاکستانی لڑکی کی طرح سر جھکائے دوپٹہ اوڑھے بیٹھی رہی۔

ٹیپ آن کر دیا گیا۔ زوردار دھنوں میں پنجابی بھنگڑے اور ڈانس کے گانے بجنے لگے۔ صائمہ کے سر میں سات سہاگنوں نے تیل لگایا۔ پھر اس کے ہاتھ پر مہندی لگائی گئی جو اس نے ہتھیلی کی بجائے ڈالر کے نوٹ پر لگوائی۔ اس کا صدقہ شمو نے اور پھر ہم سب نے اتارا...... گانا بجانا اور ڈانس بھی ہوتا رہا۔ خوب گہما گہمی تھی۔ شمو نے مسز ڈریزیلہ اور آینٹ کو بھی ڈانس کے لیے اٹھایا۔ سینڈی بھی میدان میں آئی۔ وہ سب ہمارے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر اسی طرح ایکشن کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مہمان خوب محظوظ ہو رہے تھے۔

اس کے بعد ہمارے مرد بھی اندر آ گئے۔ خالد' عاطف' آصف' فاران اور نسیم بھی نے بھنگڑا ڈالا۔ پھر اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ ڈانس کیا۔ خالد کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس نے شمو کو میدان میں کھینچا۔ پھر دونوں بہن بھائی اتنا ناچے اتنا ناچے کہ بے دم ہو کر بیٹھ گئے۔ سب نے خوب تالیاں بجائیں۔ کپل ڈانس بھی سب نے بہت پسند کیا۔

شمو کا گھر اور دھوم دھڑکا لگ رہا تھا' کسی پاکستانی گھر کا منظر ہو۔ سب نے

بہت ہی انجوائے کیا۔

کئی مہمانوں نے بھی کون مہندی سے ہاتھوں پر پھول بنائے۔ مسز ڈریزیلہ نے بھی ہتھیلی پر گول سا ٹیکہ لگوایا۔ وہ ساتھ ساتھ اس رسم' اس روایت کے متعلق پوچھتی بھی جا رہی تھی۔

خوب گہما گہمی رہی۔

شمو کو خوب مبارکبادیں ملیں۔

کھانے کا وقت ہو رہا تھا اس لیے شمو نے مجھے کہا کہ مہمانوں کو کھانے کے لیے بلاؤں۔ میں نے سب کو کھانے کے لیے بلایا۔ ہلا گلا کرنے والے تو ابھی تیار نہ تھے۔ اپنے یہاں تو کھانے کو رات کے بارہ' بارہ بج جاتے ہیں۔

لیکن

یہاں بات اور تھی۔

مہمانوں نے واپس جانا تھا۔

"ہلا گلا ساری رات کرتے رہنا ابھی کھانا کھا لو۔ مہمانوں نے واپس جانا ہے۔"

شمو نے بھنگڑا' گِدا اور ڈانس کرنے والوں سے کہا۔ پھر ڈیک بند کر دیا۔

کھانا میزوں پر گتے پر ایلومونیم چڑھی بڑی بڑی ٹرے اور تھالوں میں چنا گیا تھا۔ ہندوؤں کے لیے ساگ' بھاجی' حلوہ پوری چنے وغیرہ الگ میزوں پر تھے۔ بٹ صاحب نے لاہور کے کھانے کی یاد دلا دی۔ پلاؤ قورمہ' چکن روسٹ' کباب' تکے' گوشت کے روسٹ پیس' اچار' چٹنیاں' سلاد اور گرم گرم نان بہت اچھا کھانا بنا ہوا تھا۔

سویٹ ڈشز بھی پاکستانی تھیں جن میں کھیر' گجریلا اور حلوہ کدو کی کھیر بہت ہی اچھے ذائقے کے تھے۔ کوک کے ٹن بے حساب تھے۔

مہمانوں نے رسم کی طرح کھانا بھی انجوائے کیا۔

ڈسپوزیبل برتنوں میں کھانا دیا گیا اسی لیے مہمانوں کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد کچن ہال میں نہ کوئی برتن تھا نہ ہی کھانے کا کوئی نشان۔ سب کچھ سمیٹ کر کوڑے کے

بڑے ڈبوں میں ڈال کر ہال صاف کر دیا گیا تھا۔ یہ کام کیٹرنگ والے بٹ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔

بٹ صاحب سے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

جی لیونگ روم میں ہلا گلا' ڈانس گانے زوروں پر تھے تو باہر کے دروازے کی بیل ہوئی۔ شور شرابے میں تو کسے سنائی دیتی۔ میں اتفاق ہی سے اس وقت اوپر سے نیچے سیڑھیاں طے کرتی آ رہی تھی۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

تو

سامنے ایک جوان مرد کھڑا تھا۔ وہاں روشنی اتنی زیادہ نہ تھی۔ مجھے وہ اپنا ایک عزیز لگا۔

اس نے سلام کیا تو میں نے جواباً وعلیکم کہتے ہوئے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "اتنی دیر سے آئے ہو؟"

"جی......" وہ شاید میری تھپکی سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔

"گاڑی کہاں ہے اور عصمہ؟"

اس نے گیراج والے ہاتھ پر کھڑی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرانگی سے مجھے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

تو میں ہنس کر بولی "عصمہ کو لے کر نہیں آئے نا؟ چلو تم تو اندر آؤ......"

وہ میری شفقت بھری تھپکی' بے تکلفی اور عصمہ کے نام سے پریشان ہو کر کچھ کہنے ہی کو تھا کہ شمیم آ گئی۔ اس نے شمیم کو سلام کیا۔

"آ گیا کھانا بٹ صاحب۔" وہ بولی۔

"جی ڈاکٹر صاحب میں گاڑی گیراج میں لاتا ہوں۔"

"اوہ......" اب میں پریشان ہو گئی تو یہ ارسلان نہیں بٹ صاحب ہیں۔ دونوں میں اتنی مشابہت......!

میں خفیف سی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ گڈی پتہ نہیں کس وقت میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بٹ صاحب کو پیار سے تھپکی دیتے اور باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی...... شمو کو بتایا۔ وہ بھی اپنی مخصوص قلقل کرتی ہنسی کو روک نہ سکی۔

ہنس کر بولی "آپا صرف پیار سے تھپکی ہی دی تھی یا سر، منہ بھی چوم لیا تھا۔" گڈی پھر ہنس پڑی۔

اور

پھر یہ لطیفہ سب گھر والوں تک پہنچ گیا۔ میں خفت مٹانے کو بار بار کہہ رہی تھی "تو کیا ہوا...... چھوٹا بھائی ہی ہے...... بیٹا ہی ہے...... اپنا پاکستانی ہے، بٹ ہے...... پیار سے تھپکی دے دی تو کیا ہوا......"

لیکن

سب اس لطیفے سے حظ اٹھا کر ہنسے جا رہے تھے۔

اگلی شام شمو کی ایک بہت پرانی دوست نزہت نے بلایا جو پشاور کی رہنے والی تھی۔ اس کے میاں اشفاق صاحب انجینئر تھے۔ ان لوگوں سے میری بڑی آپا نذیر کے سسرال سے رشتہ داری بھی تھی۔ تقریباً اٹھائیس سال سے امریکہ میں رہ رہے تھے لیکن اپنی پشاوری زبان کا لب و لہجہ نہیں بھولے تھے۔ ان کی بیٹی ڈاکٹر بن رہی تھی۔ بیٹا انجینئر تھا۔ بیٹی تو پھر پشاوری زبان بول لیتی۔

لیکن

بیٹا اردو یا پشاوری زبان نہیں بول سکتا تھا۔ صرف چند لفظ ہی آتے تھے۔

لیکن

اس نے والدین سے کہہ دیا تھا کہ وہ پشتو سپیکنگ لڑکی سے شادی کرے گا۔ نزہت بتاتی تھی کہ گاڑی میں ہر وقت پشتو کی کیسٹیں رکھتا ہے۔ ایک لفظ نہیں سمجھتا لیکن پشتو گیتوں کا شیدائی ہے۔ وہ ہنس ہنس کر ہم سب سے کہتی "اس کے لیے کوئی پیاری سی

پٹھان لڑکی ڈھونڈ دیجئے گا۔"

وہ بہت خوش خلق اور ہنس مکھ عورت تھی۔ میری تو فین تھی۔ شمو نے مجھے کہا تھا کہ میں پاکستان سے ایسے لوگوں کے لیے اپنی کچھ کتابیں لیتی آؤں۔

میں نے اسے اپنی دو کتابیں دیں۔ وہ تو خوشی سے جیسے پاگل ہی ہو گئی۔ بار بار میرے گلے ملتی، میرے ہاتھ چومتی اور جانے کتنے کتنے بھاری بھرکم الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔

اس نے دعوت پر کافی پاکستانی لوگوں کو مدعو کیا ہوا تھا۔ صائمہ کی رسم حنا کا اس نے بھی بندوبست کیا ہوا تھا۔ پشاور کے رواج کے مطابق بہت قریبی عزیز ایسا کرتے ہیں۔ کئی کئی دن مہندی کی رسم اور دعوتیں ہی چلتی ہیں۔

اس نے امریکہ میں رہتے ہوئے پشاور کی یاد تازہ کر دی۔

ڈھولک بجی۔ ڈیک پر ڈانس کے گانے لگے۔ لڑکیوں نے خوب ہلا گلا کیا۔ صائمہ کو پھولوں سے سجی کرسی پر بٹھا کر کامدانی کام والا دوپٹہ اوڑھایا گیا اور اس کے ہاتھ مہندی لگائی گئی۔ وہی دس ڈالر کے نوٹ پر مہندی لگائی گئی۔ بعد میں یہ نوٹ خیرات کے پیسوں میں رکھ دیا گیا۔

مسز اشفاق نے کھانا بھی اتنا لذیذ اور ایسا پُرتکلف بنایا ہوا تھا کہ بس کیا کہوں۔ سب چیزیں انہوں نے خود بنائی تھیں۔ پشاوری پلاؤ، مرغ مصالحے، مرغ روسٹ، چپل کباب، سیخ کباب، فرائیڈ مچھلی، بیکڈ مچھلی، قیمہ گوشت، سبزیاں اللہ جانے اتنی بڑی میز کتنی چیزوں سے لدی ہوئی تھی اور تو اور مٹی کی کنالی میں دہی بھی گھر میں ہی جمایا ہوا تھا اور پشاوری خاص خمیری روٹیاں بھی خود بنائی ہوئی تھیں جو بالکل تنوری روٹیاں لگتی تھیں لیکن انہوں نے اوون میں پکائی تھیں۔ چٹنیاں، سلاد کئی قسم کے اچار دو تین طرح کے۔ انہوں نے حد ہی کر دی تھی۔

میٹھے میں بھی سات آٹھ چیزیں تھیں۔

یہاں اتنا کچھ دعوت میں رکھا جائے تو اتنا تردد نہیں ہوتا لیکن وہاں تو ہر چیز گھر

میں بنانا ہوتی ہے۔ان کی ہمت کی سب داد دے رہے تھے۔

ویسے بھی

دونوں میاں بیوی بڑے مخلص اور کھلے دل کے ہیں۔ پشاور کی مہمان نوازی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

بہت ہی بھلے' مخلص اور ملنسار لوگ تھے۔ وہ بھی شمو کی طرح وہیں سیٹل تھے۔ برسوں بعد کبھی کبھار پاکستان کا چکر لگتا تھا لیکن پاکستان کو بھولے نہیں تھے۔

وہ بار بار ہم لوگوں سے ہاتھ ملاتے' گلے ملتے اور کہتے ''پاکستان کی خوشبو ایک عرصے بعد نصیب ہوئی۔ان کے شکل وصورت اور زبان کے لحاظ سے امریکی بیٹے کو جب معلوم ہوا کہ ہمارا تعلق پشاور سے ہے تو وہ بار بار انگلش میں کہتا ''آنٹی میں پشاور میں شادی کروں گا۔''

''پشاور گئے ہو کبھی'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ایک دفعہ۔''

''کب؟''

اس کی جگہ اس کی امی نے کہا'' جب یہ دو سال کا تھا وہاں گیا تھا۔اس کے بعد تو یہ گیا ہی نہیں۔''

''پھر پشاور سے اتنی محبت۔''

''ہاں آنٹی آئی لو پشاور' آئی لو پاکستان۔'' (I Love Peshawar-I Love Pakistan)

میں نے اسے پیار کیا۔

''میرے لیے پٹھان لڑکی کا رشتہ دیکھے گا۔''

''خالی پٹھان یا خوبصورت پٹھان۔''

وہ ہنس کر بولا ''پشتو سپیکنگ بیوٹی فل پٹھان گرل۔''

سب ہنسنے لگے۔

ان کے گھر سے ہم رات ایک بجے لوٹے۔ وہاں اتنا لطف آیا۔اتنی اپنائیت پائی اتنا خلوص ملا کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔

29 دسمبر کو شام پانچ بجے صائمہ کا نکاح ہوا۔ دولہا چونکہ لاس اینجلس میں تھا' اس لیے رات ہی وہاں سے پہنچا تھا۔اس کی رشتے میں پھوپھی جو فلوریڈا میں رہتی تھی' ساتھ آئی تھی۔ ماں باپ دو دن پہلے آ چکے تھے۔ایک کزن اور دو دوست ساتھ تھے۔ رات ریسپشن اور رخصتی کی تقریب کا اہتمام شینڈ لیک ہال میں شمیم نے کیا تھا۔ یہ خوبصورت اور انتہائی بڑا ہال شادی کی تقریبات کے لیے ہی تھا۔ عام لوگ تو یہاں کھانے کا اہتمام نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ کھانا فی کس ایک سو پچھتر ڈالر تھا۔شمو نے کوئی دو سو لوگوں کو مدعو کیا تھا۔اس میں زیادہ امریکن ڈاکٹرز تھے۔ لیڈی ڈاکٹرز بھی تھیں۔ کچھ کالی موٹی موٹی نرسیں بھی مدعو تھیں۔

نرسنگ ہمارے یہاں کی طرح وہاں چھوٹا پیشہ نہیں ہوتا۔ بلکہ نرسوں کا وہاں جتنا احترام اور عزت ہے' وہ ڈاکٹروں سے کم نہیں۔ ڈاکٹر تو مریض کا علاج کرتے ہیں لیکن ان کی ساری دیکھ بھال اور خدمت نرس کرتی ہے اس لیے امریکہ کیا سب مغربی ملکوں میں یہ پیشہ انتہائی معزز اور محترم جانا جاتا ہے۔ انگلینڈ میں تو سنا ہے نرس کی گاڑی جا رہی ہو تو کوئین کی گاڑی بھی رک کر اسے راستہ دیتی ہے۔

جبکہ

ہمارے ملک میں نرسنگ کا پیشہ پروقار نہیں سمجھا جاتا۔ جو عزت نرسوں کو ملنا چاہیے' نہیں ملتی۔ تنخواہیں بھی واجبی سی دی جاتی ہیں۔

رات ہر کوئی اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ بہترین لباس زیب تن کیے جا رہے تھے۔ نئی بیاہتا بہوئیں اور بیٹیاں کپڑوں سے ملتا جلتا زیور بھی پہن رہی تھیں۔ میک اپ بھی بڑے اہتمام سے کیے جا رہے تھے۔ سب پاکستانی مہمانوں نے پاکستانی لباس پہنا تھا۔ مردوں نے سوٹ پہنے تھے۔

ہم گھر کے لوگ تو کچھ زیادہ نہیں تھے لیکن جو رشتہ دار عزیز نیوجرسی میں تھے بھی مدعو تھے۔ شمو کی قریبی پاکستانی دوست' ان کے میاں اور بڑے بچے سب کو بلایا ہوا تھا۔

لیکن

مہمانوں کی بڑی تعداد امریکنوں کی تھی۔ کچھ کولیگ' کچھ ملنے جلنے والے' کچھ پرانے واقف کار' کچھ باس قسم کے بڑے بڑے ڈاکٹرز۔

مہمانوں کو شینڈ لیک ہال لے جانے کے لیے شمیم نے دو لیموزین کرایے پر منگوائی تھیں۔

شینڈ لیک ہال کی انٹرنس میں دروازے کے دونوں طرف کوٹ وغیرہ ٹانگنے کے لیے لمبے لمبے سرکنے والے شیشوں والی الماریاں تھیں۔ لوگ باہر سے آتے تو کوٹ اتار کر ادھر ٹانگ دیتے۔ شام سے برفباری بھی ہو رہی تھی اس لیے تقریباً ہر مہمان نے لمبے لمبے کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ انٹرنس سے ایک کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ وہاں ٹیبل کے پیچھے ایک خوبصورت نوجوان گوری کھڑی سب کو ویلکم کرتے ہوئے ٹیبل نمبر دے رہی تھی۔

یہ ٹیبلز بڑے اور آخری ہال میں لگی تھیں...... وہاں ایک طرف سٹیج بنی تھی جو کافی لمبی چوڑی تھی۔ درمیان میں دولہا دلہن کے بیٹھنے کے لیے دو خوبصورت کین کی اونچی پشت والی سجی ہوئی کرسیاں اور سامنے اسی طرح کی میز تھی جس پر پھول ہی پھول تھے۔

دلہن دولہا کے بائیں طرف لڑکی والوں کے لیے لمبی میز تھی۔ اردگرد تقریباً بارہ کرسیاں تھیں۔

اسی طرح دائیں طرف لڑکے والوں کے لیے اسی طرح کی میز اسی انداز میں رکھی ہوئی تھی۔ دونوں میزوں پر ایک ہی طرح کے بہت بڑے بڑے سفید پھولوں اور سبز پتیوں والے ایک جیسے گلدستے گلدانوں میں سجے تھے۔ میز پر پلیٹیں اور تین تین قسم کے انتہائی نفیس گلاس' نیپکن اور چمکتے چھری کانٹے' بڑے چمچ اور چھوٹے چمچ سجائے گئے تھے۔ سٹیج پر کارپٹ تھا اور پیچھے دیوار کے ساتھ تقریباً پانچ پانچ فٹ اونچے پودے جو ایک ہی طرح کے اور ایک ہی سائز کے رکھے گئے تھے۔

ہال کے درمیان میں گول لکڑی کا بہت بڑا ڈانسنگ فلور تھا اور اس کے چاروں طرف کوئی ایک فٹ اونچا چبوترہ تھا جس پر باقی مہمانوں کے لیے ٹیبلز اور کرسیاں لگی تھیں۔

یوں اس گول ڈانسنگ فلور کے چاروں طرف مہمانوں کے بیٹھنے اور ڈنر لینے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ ان میزوں پر بھی بالکل اسی طرح کے اور اتنے ہی بڑے سائز کے گلدستے گلدانوں میں پڑے تھے لگتا تھا سارے ہال میں سجے یہ گلدستے مشینی ہیں۔ کسی گلدستے میں ذرہ بھر فرق نہیں تھا۔

سننے میں آیا کہ یہ گلدستے برازیل سے بن کر آئے ہیں۔

ہاں تو ٹیبل نمبر لے کر لوگ اگلے بڑے سے ہال میں آ رہے تھے جہاں دنیا جہان کے کھانے اور پھل اتنی خوبصورتی سے سجائے گئے تھے کہ دل چاہتا تھا کھانے کی بجائے دیکھتے ہی جائیں۔

یہاں بھی دیوار کے ساتھ میز کرسیاں پڑی تھیں اور لوگ اپنی من پسند چیزیں پلیٹوں میں ڈال کر کھا رہے تھے۔

ہم حیران تھے کہ ڈنر تو اندر والے ہال میں ہے۔ یہاں اتنی بہتات میں انواع و اقسام کے کھانے کیوں سجائے گئے ہیں۔ ہم نے انہیں اپی ٹائزر سمجھا یعنی اصل کھانا کھانے سے پہلے بھوک تیز کرنے کے لیے کھایا جانے والا تھوڑا سا کھانا۔ ہم نے واقعی یہاں کھانا چکھنے کے مترادف ہی کھایا۔

لیکن

بعد میں پتہ چلا۔ اسے Cock Tail Hours کہتے ہیں۔ یہاں لوگ خوب کھاتے پیتے ہیں۔ اندرونی ہال میں تو کھانا کورسز میں ہوتا ہے جو تکلفات زیادہ اور کھانا کم ہوتا ہے۔

بہرحال

اندر ہال میں مہمانوں کو بلانے کے لیے اناؤنسمنٹ ہوئی۔ لوگ پلیٹیں رکھ کر ٹشو پیپرز سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے جانے لگے۔

دروازے پر کھڑی چاک و چوبند گوریاں لوگوں کی چٹوں کو پڑھ پڑھ کر انہیں میزوں کی طرف لے جانے لگیں۔

ہمیں

اور

سسرالی مہمان کو بڑے اہتمام و احترام سے سوٹوں میں ملبوس آدمیوں نے ہماری میزوں تک پہنچایا۔

پھر صائمہ اور دولہا دونوں آئے۔ ہال میں خوش آمدید کی آوازیں بلند ہوئیں۔
دونوں انہیں ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
اب بینڈ ہلکے اور خوشگوار سروں میں بجنے لگا۔

پھر

سٹیج پر کھڑے ایک ویل ڈریسڈ امریکن نے مائیک پکڑا اور ہال کے لوگوں سے دولہا دلہن، سسرالی عزیزوں اور میکے کے رشتہ داروں کا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ صائمہ کے ہم قریبی عزیز یعنی خالائیں، ماموں، ماموں زاد عاطف اور سعدیہ پاکستان سے خاص طور پر شادی میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔

سسرالی عزیزوں کے متعلق بھی تعارفی جملے کہے۔ دولہے کا کزن کینیڈا سے آیا تھا اس لیے اس کا بھی خاص طور پر بتایا گیا۔

اس کے بعد اس نے مائیک ہماری میز کی طرف کیا۔ ''براہ مہربانی آپ اپنے تاثرات بتایئے۔''

ہم میں سے خالد، آصف اور عاطف نے دو دو منٹ کے لیے بات چیت کی۔
سسرالیوں کو مبارکباد دی۔ شمو کو شاندار الفاظ میں اس دعوت پر خراج تحسین پیش کیا۔ مبارکباد دی۔

ہماری طرف مائیک آیا۔ اتنے لوگوں میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی کون بولتا۔ امریکنوں کا تو لب و لہجہ بھی انگریزوں سے مختلف ہے۔ کچھ گول گول کر کے انگریزی بولتے ہیں۔
گڈی نے چند لفظ کہے۔ باقی ہم سب نے صرف مینجمنٹ کی ایک دو جملوں میں تعریف کی اور بس۔

غرضیکہ یہ تعارفی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ بینڈ بجتا رہا۔ دولہا میاں اور دلہن صاحبہ نے بھی اپنی خوشی کے تاثرات بیان کیے۔ خوب تالیاں بجیں۔ یہ خوشگوار ہنگامہ تھوڑی دیر جاری رہا۔

پھر

کھانا شروع ہونے کی اناؤنسمنٹ ہوئی۔ سب مہمان اپنی اپنی ٹیبلز پر بیٹھ چکے تھے۔
وہی امریکن آدمی جنہیں سوٹڈ بوٹڈ ہوتے ہوئے بیرے تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہر حال تھے کچھ اسی قسم کی چیز، ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھائے وہ سٹیج کی میزوں پر آئے۔ شمو نے انہیں بتا رکھا تھا کہ ہم پاکستانی لوگ شیمپئن نہیں پئیں گے اس لیے نازک گلاسوں میں ہمیں کوئی لذیذ سا مشروب سرو کیا گیا۔ ہال میں جتنے امریکن یا ایسے لوگ تھے جو شراب پیتے تھے انہیں شیمپئن سرو کی گئی ٹوسٹ ہوا یعنی گلاس ٹکرائے پھر مشروبات اور شراب پی گئی۔

یہ ختم ہوا تو وہی بیرے آئے اور خالی گلاس اٹھا کر لے گئے۔

دوسرے راؤنڈ میں صاف ستھری ٹرے میں رکھے چھوٹے چھوٹے بن اور روسٹ چکن کے پیس لائے گئے جنہیں دستانے والے ہاتھوں نے چمکتے دمکتے چمٹوں کے ساتھ پکڑ کر ہر ایک کی پلیٹ میں رکھا۔ ہال میں اسی طرح کے دوسرے بیرے کھانا پلیٹوں میں رکھ رہے تھے۔ ساتھ مشروبات بھی تھے۔ ہم لوگوں نے سیون اپ اور کوک پی لی۔

یہ کھا لینے کے بعد میز سے ساری پلیٹیں، گلاس، چمچ، چھری کانٹے اور نیپکن اٹھا لیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری صاف پلیٹیں، گلاس، کٹلری اور دھلے ہوئے تہ شدہ نیپکن ہمارے سامنے لگا دیئے گئے۔

اس طرح کوئی تین چار دفعہ کھانا سرو ہوا۔ کبھی مچھلی کا پیس کبھی سینڈوچ ٹائپ ڈبل روٹی کے پیس اور کبھی نمکین گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ ہر سروس کے بعد برتن اور دیگر چیزیں اٹھالی جاتیں اور دھلی ہوئی چمکتی کراکری، کٹلری اور نیپکن ڈال دیئے جاتے۔

کھانا تو جو تھا سو تھا۔ بس یہ نخرے دیدنی تھے۔ سروس نہایت عمدہ تھی۔

کھانے کے بعد لوگ اٹھ اٹھ کر صائمہ اور اس کے دولہا سے ملنے آنے لگے۔

صائمہ کے سامنے میز پر اس کے ڈریس ہی کے کپڑے کا ایک خوبصورت تھیلا پڑا تھا جو مہمان بھی آتا' اس کو مبارک دینے کے بعد ایک لفافہ پکڑا دیتا جو وہ تھیلے میں شکریے کے ساتھ رکھ لیتی۔

یہ بات بالکل ہمارے ہاں سلامی دینے جیسی تھی۔ کچھ لوگوں نے دولہا کو بھی لفافہ پکڑایا' اس نے بھی لفافہ بیگ میں ڈال دیا۔

یہ بیگ والی بات ہم سب کو اچھی لگی۔ ہمارے ہاں اکثر دلہن لفافے اور پیسے اپنے بٹوے میں ڈالے جاتی ہے۔ جب وہ بھر جاتا ہے تو لفافے ٹھونسنے پڑتے ہیں۔ عام طور پر پرس کا منہ کھل جاتا ہے اور لفافے اور پیسے زیادہ ہونے کی وجہ سے کھلا ہی رہتا ہے۔

یہ کتنا اچھا طریقہ تھا۔ صائمہ کا خوبصورت چھوٹا سا پرس ویسے کا ویسا تھا اور سارے لفافے بیگ میں ڈال دیے گئے تھے۔ بیگ کوئی فٹ بھر لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا تھا۔

اس کے بعد پھر اناؤنسمنٹ ہوئی۔ ڈانس کرنے والوں کو دعوت دی گئی کہ فلور پر آ جائیں۔ آرکسٹرا خوبصورت دھن بجانے لگا۔

ایک ایک دو دو کپل اٹھ کر فلور پر آ کر ڈانس کرنے لگے۔ پہلے امریکی لوگ اٹھے۔

پھر جب ہلا گلا تیز ہوا تو پاکستانی ڈاکٹرز اور ان کی بیویاں بھی میدان میں آ گئیں۔

ہنگامہ پر جوش ہوا تو اکثر کرسیاں خالی ہو گئیں۔ خالد اور نسیمی نے ڈانس کیا۔

بشرہ اور فاران بھی میدان میں آ گئے۔ آصف اور آمنہ نے بھی چند قدم اٹھائے۔

مقصد خوشی کا اظہار تھا۔ اکثر لوگ اچھل کود ہی میں مصروف تھے لیکن بعض لوگ باقاعدہ ڈانس کر رہے تھے۔

بہت ہی مسرور کن ہلا گلا تھا۔ ہنسی کی پھوار۔ قہقہوں کی بوچھاڑ۔ شور شرابہ...... شمیم

کی خوشیوں کا تو ٹھکانہ نہ تھا۔ اسے خوش دیکھ کر ہمیں دلی خوشی ہو رہی تھی۔

رات بارہ بجے تک یہی ہلا گلا رہا۔

پھر صائمہ اور دولہا کو رخصت کیا گیا۔ ان کے قیام کا بندوبست شمیم نے کسی ہوٹل میں کیا تھا۔

صائمہ کو رخصت کر کے شمو بہت روئی۔ ہم سب بھی اداس و دلگیر ہو گئے۔

آنکھیں نم ہو گئیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم (شمو کے شوہر) بہت یاد آئے۔

خیر

مہمانوں کو رخصت کر کے ہم سب گھر لوٹ آئے۔ رات کا ایک بج چکا تھا لیکن رات گئے تک ہم سب بیٹھے پرانی باتیں دہراتے رہے۔ صائمہ کی خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے بھی دعا کی۔ اس دوران آمنہ باقاعدہ وقفے وقفے کے بعد سب کو چائے اور قہوے سے نوازتی رہی۔



دوسری شام دولہا دلہن آ ئے۔ وہ ہنی مون کے لیے فجی آئی لینڈ جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ دس دن کی رخصت انہوں نے وہاں گزارنا تھی۔ فجی آسٹریلیا کے قریب ایک چھوٹا سا لیکن انتہائی خوبصورت جزیرہ ہے۔ وہاں ٹورسٹ کے لیے چند کمرے ہیں۔ ریسٹورنٹ ہے اور بس۔ بجلی تک وہاں نہیں لیکن قدرتی حسن سے یہ جزیرہ مالا مال ہے۔ اس کی خوبصورتی کو آرٹیفیشل چیزیں بنا کر چھیڑا تک نہیں گیا۔

ہنی مون کے بعد صائمہ نے سان فرانسسکو چلے جانا تھا۔

شادی ختم ہوگئی۔ ساتھ ہی سارے ہنگامے اور ہلا گلا بھی ختم ہوگیا۔ دو دن بعد شمو بھی کام پر جانے لگی۔

اور

ہم چاروں گھر میں سارا سارا دن گپ شپ میں مصروف رہنے لگیں۔

سعدیہ اور عاطف روزانہ گھومنے پھرنے چلے جاتے تھے۔ دو دن بعد انہوں نے بھی فلوریڈا چلے جانا تھا۔ ان کے پاس See America ٹکٹ تھے۔ ان پر وہ پانچ سٹیٹس میں گھوم پھر سکتے تھے۔

گپ شپ پر کب تک گزارہ ہوتا۔ ہم لوگ روز کی روٹین سے بور ہونے لگے۔

آمنہ سے بوریت کا ذکر کیا تو بولی ”یوں بیٹھ کر بور ہی تو ہوں گی۔ چلیں میں روز آ کر آپ کو باہر لے جایا کروں گی۔“

آمنہ کی پانچ سالہ بیٹی سلینہ ان دنوں اسلامک سنٹر جاتی تھی جہاں بچوں کو اسلام

کی بنیادی تعلیم دی جاتی ہے۔ آمنہ صبح آصف کو دفتر بھیج کر گھریلو کاموں سے فارغ ہو کر سلینہ کو سنٹر چھوڑنے جاتی تھی جس کا ٹائم 9 بجے تھا۔

آمنہ 9 سے 12 بجے تک کسی کمپیوٹر سنٹر میں جاب کرتی تھی۔ تب تک سلینہ کو بھی چھٹی ہو چکی ہوتی تھی۔

اس نے پلان بنایا کہ سلینہ کو سنٹر سے لے کر وہ سیدھی ادھر ہی آ جایا کرے گی۔ پھر کھانا کھانے کے بعد ہمیں باہر گھمانے پھرانے لے جایا کرے گی۔ وہاں گھومنا پھرنا یہی تھا کہ کسی سٹور میں گھس جائیں۔ چیزیں خریدیں یا یونہی دیکھتے پھریں۔ دو تین گھنٹے اس طرح آسانی گزر سکتے تھے۔ اس فیصلے سے ہم چاروں مطمئن بھی ہوئیں اور خوش بھی۔ آمنہ کے پاس اپنی کار تھی اس لیے سواری کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔

ہم 31 دسمبر کو آمنہ کے ساتھ پھرنے گئے۔ آج سب طرف بڑا رش تھا۔ سٹوروں میں لوگ تھے۔ سڑکوں پر کاروں کی دوڑ تھی۔ مال میں چھوٹے بڑے بھی شاداں و فرحاں گھوم پھر رہے تھے۔

اس کی وجہ پتا چلی

کہ

آج رات سال کی آخری رات بن کر اترنے والی تھی اس لیے New Year, Eve کے لیے لوگوں میں خوشی اور جوش و خروش تھا۔

اس رات کو بھی لوگ کسی بہت بڑی شاندار تقریب کی طرح مناتے ہیں۔ دعوتیں کرتے ہیں۔ دوستوں سے مبارکبادی کے تبادلے کرتے ہیں۔ اپنے اپنے گھروں میں اچھی اچھی ڈشز بناتے ہیں۔ رات بارہ بجے تک ہلا گلا رہتا ہے۔ بارہ بج کر ایک منٹ بھی نہیں ہو پاتا کہ نئے سال کی خوشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ شراب کے دور چلتے ہیں' سینڈوچ اور سنیکس کھائے جاتے ہیں' ناچتے گاتے ہیں۔

نیویارک میں تو اس رات اتنا رش ہوتا ہے کہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہے۔ اس رات امریکہ کے گنجان آباد علاقے ٹائم سکوائر میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے

ہیں۔ نیویارک کی سڑکیں شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً متوازی ہیں۔ یہاں بھی ریزیڈنشل ایریا ہے۔ بے شمار فلیٹس ہیں جن میں کئی کئی منزلہ اونچے فلیٹ بھی ہیں۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک تک ان فلیٹس کو بلاک کہتے ہیں۔ ہر سڑک کے دونوں طرف بارہ بارہ' پندرہ پندرہ منزلہ اور کہیں اس سے بھی زیادہ فلیٹس ہیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر آخری منزل کا فلیٹ دیکھنا پڑے تو گردن بالکل پیچھے مڑ جاتی ہے۔

انہی سڑکوں پر سال کی آخری رات لوگ جمع ہوتے ہیں۔ خون منجمد کر دینے والی سردی اور بعض اوقات برف بھی گر رہی ہوتی ہے لیکن لوگ دیوانہ وار ان گلیوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔

پھر

رات بارہ بج جانے پر جب پچھلا سال ختم ہوتا ہے' نئے سال کی خوشی میں بہت زیادہ اونچائی سے ایک روشنی کا گولا نیچے گرتا دکھائی دیتا ہے جو بکھر کر نئے سال کا سن بن جاتا ہے۔ یعنی جب 1998ء کا سال شروع ہوا تھا۔ روشنی کا گولا نیچے آتے آتے 1998ء میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ چیختے چلاتے خوشیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ سردی کی پروا ہوتی ہے نہ برف کی۔ بعض لوگ تو جوش میں آ کر قمیصیں بھی اتار دیتے ہیں۔ چونکہ رش بہت ہوتا ہے اس لیے دھکم پیل بھی ہوتی ہے۔ شراب کے نشے میں بدمست لوگ بدتمیزیاں بھی کرتے ہیں۔

بہرحال

وہ نئے سال کا اس طرح استقبال کرتے ہیں۔ ہم نے تو یہ منظر ٹی وی پر دیکھا تھا لیکن خالد' آصف' عاطف' سعدیہ اور آمنہ ٹائم سکوائر گئے تھے۔ انہوں نے صرف روشنی کا گولا دیکھا۔ 1998ء میں روشنی تبدیل ہوتے نہ دیکھ سکے کیونکہ انہیں جگہ ہی ایسی سمت میں ملی تھی جہاں سے یہ نظر نہ آتا تھا۔

اتفاق ہی سے ہم لوگ ان دنوں میں امریکہ گئے تھے جو امریکنوں کی کرسمس اور نئے سال کی آمد کے ہنگامہ پرور تجربے سے بھی روشناس ہوئے۔

ہاں

میں

صائمہ کی شادی کے بعد دی جانے والی مغل ہوٹل کی دعوت کا قصہ لکھنا ہی بھول گئی۔

یہاں چند امریکنوں اور دو ایک کالی نرسوں کے علاوہ ہندو مسلم ہی جمع تھے۔ ہندوؤں کے لیے الگ کھانا بنا تھا اور مسلمانوں کے لیے الگ لیکن سب نے ایک ہی ہال میں بیٹھ کر کھایا۔

یہاں بھی شادی کی خوشی میں لڑکے لڑکیوں نے خوب ہلا گلا کیا۔ بھنگڑے ڈالے' ڈانس کیے۔ ان کی دیکھا دیکھی امریکن عورتیں اور مرد بھی بھنگڑے میں شریک ہو گئے۔ ناچنے والوں کو دیکھتے جاتے اور اسی طرح کی حرکات کرنے کی کوشش کرتے۔

خوب پر لطف محفل رہی۔

سب نے بہت ہی انجوائے کیا۔ یہ دعوت شادی کے دوسرے دن تھی۔ رات بارہ ایک بجے تک سب مہمان محظوظ ہوتے رہے۔ ہال اس طرح سجا ہوا تھا کہ وہاں بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا کہ کسی پاکستانی ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔

ہاں

تو

شادی کے بعد خاموشی کے جمود کو توڑنے کے لیے ہمیں آمنہ نے راہ دکھائی تھی۔

وہ روزانہ آ جاتی۔ ہم لوگ تیار بیٹھے ہوتے۔ کھانا کھاتے اور اس کے ساتھ چل پڑتے۔

زیادہ تر سٹوروں پر ہی جاتے یا مرکز میں گھومتے۔ مارکیٹوں میں بھی وہ ہمیں لے جاتی۔

سب سٹور مال اور مارکیٹیں ایک ہی طرز کی تھیں۔ صرف وسعت میں فرق تھا۔ کوئی بے انتہا بڑی' کوئی قدرے چھوٹی۔ ڈیپارٹمنٹل سٹورز تو بہت بڑے بڑے۔ بعض بڑے سٹوروں میں ہر ڈیپارٹمنٹ کے لیے الگ کاؤنٹر ہے' جہاں چاک و چوبند عورتیں کھڑی گاہکوں کو نپٹا رہی ہوتی ہیں۔ قطار میں کھڑے لوگ اپنی باری آنے پر خریداری کا

سامان چیک ہونے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ ایک لڑکی اسے لیزر شعاعوں پر سے گزارتی ہے۔ جس سے قیمت کمپیوٹر حاصل کر لیتا ہے۔ پھر ساری چیزوں کی قیمت اکٹھی کر کے اس میں ٹیکس جمع کرتا اور کمپیوٹر پر کھڑی عورت کمپیوٹر سے باہر آنے والی قیمت کی لسٹ کا کاغذ نکال کر گاہک سے رقم وصول کرتی ہے۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسرے اور تیسرے کے بعد چوتھے گاہک کی باری آرام سے آ جاتی ہے۔ کوئی گاہک جلدی نہیں مچاتا' نہ ہی گاہکوں کو دھکیل کر آگے آنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرام و تحمل سے کام کرنا امریکیوں کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔

آپ کو گروسری سٹور کے متعلق میں نے وضاحت سے بتا دیا تھا۔ اب کسی ڈیپارٹمنٹل سٹور کے متعلق بھی اسی وضاحت سے بتانا چاہوں گی۔ گو اب ایسے سٹور پاکستان میں بھی بن گئے اور بن رہے ہیں لیکن یہ نہ تو ان سٹوروں کی طرح وسیع و عریض ہیں نہ ہی اس طرح کا منظم اور مستحکم طریق کار ہے۔ یہاں بعض سٹور ایسے ضرور بن گئے ہیں جن کے سسٹم کا امریکن سٹوروں کے ساتھ موازنہ کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال

آپ کو ایک بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور کے متعلق بتاؤں۔ یہ تین سٹور ہیں جو ایک دوسرے سے ملحق ہیں۔ سٹرن' میسی اور لارڈ اینڈ ٹیلرز۔

یہ سٹور ایک بہت بڑے ایئر کنڈیشنڈ ہال اور ایک ہی چھت کے نیچے ہیں۔ ان تینوں سٹوروں کی دوسری منزل بھی ہے چونکہ بہت وسیع و عریض ہال ہیں اس لیے اوپر جانے کے لیے ایسکلیٹرز بھی ہیں۔ سیڑھیاں بھی اور ایلی ویٹر یعنی لفٹ بھی۔

ایک سٹور کا نقشہ کھینچوں گی۔ باقی سٹورز بھی اسی طرز و طریق ہی کے ہیں۔

ان سب سٹوروں کے باہر ایک نہایت ہی وسیع و عریض پارکنگ لاٹ ہے چونکہ تین سٹوروں اور ان کے پیچھے لمبے چوڑے مال میں خریداری کے لیے لوگ آتے ہیں۔ اس لیے گاڑیوں کی تعداد بے حد و بے شمار ہوتی ہے' اسی لیے اس لاٹ میں مختلف حصے بنا دیے گئے ہیں اور ایک تختی پر ایک دو تین چار پانچ نمبر لکھ کر تختیاں دور دور پولوں پر لٹکا دی جاتی ہیں

اگر خریدار جب واپس آئیں تو پارکنگ لاٹ کا نمبر جس میں گاڑی پارک کی ہوئی ہے دیکھ کر آسانی سے گاڑی نکال سکیں۔

پارکنگ لاٹ کی وہی ترتیب ہے جو میں پہلے کہیں بیان کر چکی ہوں۔

لاٹ کے سامنے سڑک اور اس کے پار برآمدہ۔ جس میں کارٹس (ٹرالیاں) ایک دوسرے میں دھنسی کھڑی ہوتی ہیں۔ اسی برآمدے میں ٹی مشین بھی نصب ہے جہاں اپنا بینک کارڈ ڈال کر جتنی رقم چاہیے نکلوائی جا سکتی ہے۔ امریکہ میں خریداری عام طور پر کیش پیسوں سے نہیں ہوتی۔ بینک کارڈز کے ذریعے کمپیوٹرائزڈ منی مشینیں رقم نکال دیتی ہیں۔ بینک میں مطلوبہ رقم سے کم پیسے ہوں تو مشین کارڈ واپس کر دے گی۔

برآمدے ہی میں ایک طرف جوسز' کوک وغیرہ کے لیے تقریباً چھ فٹ لمبے چار فٹ چوڑے فریج قسم کے باکس نما ڈبے ہیں جن میں پیسے ڈالنے کے لیے سوراخ بنے ہوئے ہیں۔ کاغذی گلاس بھی ایک خانے میں موجود ہیں۔ پیسے سوراخ میں ڈالیے اور جو مشروب پینا ہو اس کا بٹن دبا کر گلاس بھر لیں۔ اسی طرح بعض جگہ خودکار آئس کریم مشینیں بھی نصب ہیں جس فلیور کی آئس کریم کھانا ہو پیسے ڈالیں' بٹن دبائیں اور آئس کریم لے لیں۔

ان چیزوں کے قریب ہی سٹور کا بڑا سا شیشے کے پٹوں والا دروازہ ہے' جو خودکار ہے۔ اندر جاتے ہیں تو دروازہ خود بخود اندر کھل جاتا ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا سیشن روم ہے' جس میں ایک طرف سٹینڈوں پر اخبار اور رسالے رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بنچ یا کرسیاں ہوتی ہیں۔ میزوں پر کیٹلاگ بکس بھی پڑی ہوتی ہیں۔ معلومات فراہم کرنے کا بھی لٹریچر ہوتا ہے۔

آپ جونسی اخبار اٹھانا چاہیں' اٹھا لیں۔ کیٹلاگ لے لیں یا معلومات کے پمفلٹ پڑھنے کے لیے لے لیں۔ اگر وہیں بیٹھ کر کچھ ضروری معلومات لینی ہیں تو بنچ پر بیٹھ جائیے اور اطمینان سے پمفلٹ اخبار یا کیٹلاگ دیکھئے۔ یہ ضروری نہ ہو۔

تو

پھر

اسی قسم کے چوڑے دروازے سے سٹور میں داخل ہو جائیے۔ یہ بھی خودکار دروازہ ہے اور ریسپشن کی طرف کھلتا ہے۔ بعض جگہ یہ سرکنے والے دروازے ہوتے ہیں۔ اندر جانا یا باہر آنا ہو تو سرک جاتے ہیں۔ پھر بندے کے نکل جانے پر بند ہو جاتے ہیں۔

دروازے میں سے سٹور میں داخل ہوتے ہی دائیں بائیں سامنے آپ کو مختلف اشیاء کے ڈیپارٹمنٹ نظر آئیں گے جہاں سامان کی اتنی بھرمار ہوگی کہ بوکھلا جانے والی بات ہوتی ہے۔ خریدار بھی بے شمار ہوں گے۔

چونکہ یہ بہت بڑا اسٹور ہے اس لیے نسبتاً چھوٹے سٹوروں کی طرح ہال میں داخل ہوتے ہی کاؤنٹرز اور ان پر مستعدی سے کام کرتی خوبصورت جوان لڑکیاں نظر نہ آئیں گی۔

یہاں ہر ڈیپارٹمنٹ کا اپنا کاؤنٹر ہے۔ تین تین چار چار کمپیوٹر پڑے ہیں۔ لڑکیاں بڑی مستعدی سے گاہکوں کو نپٹا رہی ہیں۔

داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو ہو جائیں تو یہ زنانہ کپڑوں کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔ یہاں ہینگروں پر زنانہ شرٹس' بلاؤز' پینٹس' کوٹ پتلون لٹک رہے ہوں گے۔ کئی کئی قطاروں میں کپڑے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ تہ شدہ کپڑوں کے بھی ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے کیبن بھی بنے ہیں جنہیں ٹرائی روم بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں دیوار گیر آئینے ہیں۔ کرسیاں ہیں۔

آپ نے کوئی کپڑا خریدنا ہے اور اس کی فٹنگ دیکھنی ہے جو بے شک جتنے کپڑے چاہئیں ٹرائی روم میں لے جائیں۔ آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا یا پوچھے گا۔ آپ ٹرائی روم میں جتنی بھی دیر لگا دیں۔ کوئی دوسرا اندر جانے والا باہر کھڑا ہوگا' لیکن وہ دروازے پر دستک دے کر آپ کو باہر بلانے کا مجاز نہ ہوگا۔ دلجمعی اور صبر سے باہر آنے کا انتظار کرے گا۔ مزاج میں ٹھہراؤ اور صبر و تحمل امریکیوں کی بہت بڑی خوبی ہے۔

ڈھیر سارے کپڑے ٹرائی کرنے کے بعد اگر خریداری کا موڈ نہیں بنتا تو آپ کپڑے واپس چاہیں تو ہینگروں پر لٹکا دیں' چاہے تو ڈھیر کر کے رکھ دیں۔ کوئی باز پرس

نہیں کرے گا۔ ہر کپڑے پر قیمت کا ٹیگ لگا ہوتا ہے' قیمت معقول سمجھیں تو خرید لیں' ورنہ چھوڑ دیں۔

گرینڈ سیل کے دنوں میں مختلف ڈیپارٹمنٹس کی چیزیں ہینگروں پر ڈال کر ایک تختی پر اجتماعی قیمت لکھ کر کسی راڈ پر لگا دی جاتی ہے۔ اب جو کپڑا بھی پسند کریں' ایک ہی قیمت کا ہوگا۔

زنانہ کپڑوں کے شعبے کے ساتھ ہی ایک بڑا حصہ لیڈیز انڈر گارمنٹس کے لیے ہوتا ہے۔ وہاں بھی وہی طریق کہ قیمتوں کے ٹیگ لگے ہیں یا مجموعی سیل پر قیمت کی تختی لگا دی گئی ہے۔ جو چیز پسند آئے۔ خرید لیں۔ نہ پسند ہو تو کوئی کہنے والا نہیں کہ چیز کیوں نہیں خریدی۔

کپڑوں کے شعبے کے ساتھ ہی بہت بڑے حصے میں لیڈیز کے جوتے سٹینڈوں اور ریکوں پر پڑے ہیں۔ ساتھ ہی میچنگ پرس بھی تاروں پر لٹک رہے ہیں۔ خیال رہے کہ سٹور کی ہر چیز پر قیمت کا ٹیگ لگا ہوتا ہے' وہاں کوئی سیل گرل آپ کو جوتا پسند آنے پر قیمت بتانے کھڑی نہیں ہوتی۔ لوگ یہاں جوتے ٹرائی کرتے ہیں۔ ڈیزائن پسند کرتے ہیں' قیمت دیکھتے ہیں۔ خریدنا ہو تو خرید لیتے ہیں نہ خریدنا ہو تو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

اسی طرح درمیان میں تھوڑا راستہ چھوڑ کر دوسری طرف مردانہ کپڑوں کا حصہ ہے۔ یہاں بھی ٹرائی کیبن بنے ہیں۔ شرٹس' ٹی شرٹس' پتلونیں' کوٹ' سویٹر' ٹائیاں' جرابیں' غرض ہر مردانہ چیز وہاں پڑی ہے۔ یہ بہت بڑا ہال ہے۔ یہاں بھی انڈر گارمنٹس کا شعبہ الگ اور جوتوں کا لیڈیز کی طرح الگ ہے۔

اب درمیان میں آئیں تو آرٹیفیشل جیولری کی بے شمار چھوٹی چھوٹی شاپس ہیں۔ آگے چلیں تو ہر قسم کی گھڑیاں مل جائیں گی۔ قیمتی سے قیمتی اور سستی سے سستی' ٹیبل کلاک' وال کلاک خوبصورت ترین' بعض ٹیبل کلاک کرسٹل کی بھی ہوتی ہیں' جو کافی قیمتی ہوتی ہیں۔

ادھر ہی آگے بڑھیں تو اصلی جیولری کے سٹال نظر آئیں گے۔ چاروں طرف شیشے کے شوکیسوں میں ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں' ٹاپس اور لاکٹ مختلف وضع قطع کے اور مختلف

قیمتوں کے ہوں گے۔ 18 کیرٹ گولڈ کی زنجیریں' بریسلٹس' ٹاپس' انگوٹھیاں بھی ملیں گی۔ اصلی پرل کے زیورات بھی ہوں گے۔ مہنگے پنک پرل کے زیور بھی دیدنی ہوں گے۔ ان دکانوں پر سیل گرلز یا آدمی ضرور ہوتے ہیں۔ اب دائیں ہاتھ آگے بڑھتے جائیں تو الیکٹرونکس وغیرہ کے سٹال ہوں گے۔ ہر قسم کی گھریلو چیز مل جائے گی۔

پھر چند سٹال گھریلو استعمال کے برتنوں کے ہوں گے۔ جہاں قیمتی اور سستے ہر طرح کے برتن مل جائیں گے۔ کٹلری کے خوبصورت اور چمکتے دمکتے سیٹ' خوبصورت ڈبوں میں سجے باعث کشش ہوں گے۔ کرسٹل کے برتن ڈیکوریشن پیسز دیکھنے کے لائق ہیں۔ پلاسٹک کے برتنوں کا الگ شعبہ ہے۔ ایک شعبہ فریم شدہ تصاویر کا بھی ہے۔

یہ سٹور چونکہ دوسری منزل پر بھی اتنا ہی وسیع و عریض ہے اس لیے آپ چاہیں تو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جائیں۔ ایلی ویٹر استعمال کریں یا اسکلے لیٹرز (متحرک زینے) استعمال کریں۔

اوپر کی منزل پر بھی انواع و اقسام کی چیزوں کے ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ بستر کی چادریں' کمفرٹ' کشن' ایک جگہ سجے ہوں گے۔ ساتھ ہی باتھ روم سیٹ ہوں گے۔ خوشنما گلدانوں میں سجے پھول ہوں گے۔ بالکل اصلی نظر آنے والے کاغذی مصنوعی پھول تو اس طرح سجائے گئے ہوتے ہیں کہ دل چاہتا ہے انہیں دیکھتے جائیں۔

ایک شعبہ بچوں کے کپڑوں کا بھی ہوگا۔ ہر عمر کے بچے کے ہر سائز کے مختلف قسم کے کپڑے مل جائیں گے۔ یہ ڈیپارٹمنٹ بھی بہت بڑا ہے۔

اس کے ساتھ ہی بچوں کے جوتوں کا سیکشن ہوگا۔ چھوٹے بڑے بیشمار بچے اپنی ماؤں یا باپوں کے ساتھ آئے ہوتے ہیں جو چیزیں دیکھنے سے زیادہ دوڑنے' بھاگنے اور کھیلنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

اس شعبے کے سامنے ہی بچوں کے کھلونوں کا شعبہ ہے۔ عام طور پر پانچ چھ سال کے بچوں کے لیے کھلونے صرف کھلونے نہیں ہوتے' ان میں تعمیری چیزیں ہوتی ہیں۔ بچے ان سے کھیلتے ہوئے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ کچھ کھلونے سٹال میں ڈبوں سے

نکال کر بھی رکھے گئے ہوتے ہیں تاکہ کھلونے کو اچھی طرح دیکھا جا سکے۔ اس کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا سکے۔

سب سے بڑی بات وہاں یہ ہے کہ آپ کوئی چیز خرید کر لے جاتے ہیں' دوسرے تیسرے دن آپ کو چیز پسند نہیں آتی یا معمولی سا نقص محسوس ہوتا ہے تو آپ بلا جھجک وہ چیز رسید دکھا کر واپس کر سکتے ہیں۔ اس بات کا کوئی برا نہیں منائے گا بلکہ بڑے مؤدبانہ انداز میں آپ سے معذرت کرے گا۔ چیز بدلوانا ہو تو بدل دیں گے۔ نہ لینا ہو تو پیسے واپس دے کر بھی معذرت کیے جائیں گے۔

اوپر ہی ایک طرف بکس ڈیپارٹمنٹ ہے۔ جہاں سینکڑوں ہزاروں کتابیں پڑی ہیں اور کم قیمت پر دستیاب ہیں۔ سٹیشنری بھی وہیں سے مل جائے گی۔

ہر سٹور میں ایک طرف یا کاؤنٹروں کے قریب چھوٹا سا ڈرگ سٹور بھی ہوتا ہے۔ جہاں سے چھوٹی موٹی تکلیف کی عام دوائیاں مل جاتی ہیں۔

سٹوروں میں عام طور پر خریداری چیک کے ذریعے ہوتی ہے۔ جو شخص چیک دیتا ہے' گارنٹی کے لیے اس کے پیچھے ورک پرمٹ نمبر اور ڈرائیونگ لائسنس نمبر لکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ چیک قابل قبول ہوتا ہے۔

چیک سے نہ چیزیں لینا ہو تو پھر باہر والی منی مشین میں بینک کارڈ ڈال کر جتنی رقم لینی ہو اس کا نمبر دبا دیں۔ کمپیوٹر بینک کارڈ کا نمبر نوٹ کر لے گا۔ بینک کا نام لکھ لے گا۔ وہ بینک کارڈ اندر کھینچ کر سب کچھ نوٹ کرنے کے بعد رقم کے ساتھ کارڈ اور رسید بھی باہر کر دے گا۔ پھر جب بینک سے ماہانہ سٹیٹمنٹ آپ کو ملے گی تو اس میں آپ نے جتنی بار جہاں جہاں بینک کارڈ استعمال کیا اور جتنی جتنی رقم نکلوائی' وہ سب درج ہوگی۔

میں نے ذکر کیا تھا کہ یہ تین سٹور ساتھ ساتھ تھے جو پیچھے واقع مال سے جڑے ہوئے تھے۔

سٹور سے خریداری کے بعد اگر پچھلے گیٹ سے دوسرے سٹور یا مال کی کسی دکان میں جانا ہو تو گیٹ پر کھڑی لڑکی آپ کی خریداری کے لفافوں کو سٹیپل سے بند کر کے اپنے

سٹور کی چٹ لگا دے گی۔ اس سے خریدار کو کسی قسم کا خدشہ نہیں رہتا کہ دوسرے سٹور میں
جانے پر وہ اس کی خریداری کی یا نہ پرس کر سکیں۔
ویسے بھی ان سٹوروں میں کوئی ہیرا پھیری اس لیے نہیں ہوتی کہ سٹور کی چھتوں
میں آویزاں سکیورٹی کیمرے ا ر سکیورٹی روم میں ٹیلی ویژن سکرینوں پر سٹور میں گھومنے
پھرنے والوں کی حرکات و سکنات عملے کے افراد دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ حرکات ویڈیو پر
بھی ریکارڈ ہو جاتی ہیں۔

ان تینوں سٹوروں کے پیچھے ایک بے حد لمبا چوڑا مال ہے۔ پچھلے گیٹوں سے اس
مال میں داخل ہو سکتے ہیں۔ خاصی کشادہ جگہ ہے۔ جہاں پر بنچ پڑے ہوتے ہیں۔ ایک
سائیڈ پر کئی ٹوائلٹ روم جو ہر دم صاف کیے جاتے ہیں ہوتے ہیں۔
"ڈیلی" بھی ہوتی ہے جہاں سے کھانے پینے کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ شاپنگ
کرتے تھک جانے والے بنچوں پر بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔ کچھ لوگ چپس کے لفافے اور
کوک کے ٹن ہاتھوں میں لیے متحرک زینوں سے اوپر جاتے ہیں۔ کچھ لوگ نیچے آ رہے
ہوتے ہیں۔

اوپر
دکانیں ہی دکانیں ہیں۔ بڑی بھی چھوٹی بھی۔ یہاں بھی دنیا کی ہر چیز مل جاتی
ہے۔ ہر چیز کی شاپ الگ ہے۔ آگے چلتے جائیں تو اصلی مال کا اوپر کی منزل کا حصہ آ جاتا
ہے۔ یہاں سامنے آنے جانے کے لیے بڑے چوڑے برآمدے ہیں۔ لوگ آسانی چلتے
پھرتے دکانوں میں جاتے مال خریدتے یا ونڈو شاپنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ سٹوروں کی
طرح یہاں بھی دنیا کی ہر چیز دستیاب ہے۔ سٹور سے فرق صرف یہ ہے کہ ہر چیز کی دکان
الگ ہے۔
کئی کلومیٹر لمبا یہ مال خوبصورت بھی ہے صاف ستھرا بھی۔ لگتا ہے لوگ پکنک
منانے آئے ہوتے ہیں۔
یہاں سے تھوڑی تھوڑی جگہ پر سے گول خوبصورت زینے نیچے جاتے ہیں۔ نیچے

بھی اتنا ہی لمبا چوڑا مال ہے۔ درمیان میں موزیک کے فرش والی کافی چوڑی جگہ چھوڑی گئی
ہے۔ سبزے اور پھولوں سے چھوٹے چھوٹے چبوترے بنے ہوئے ہیں۔ دو ایک جگہ حوض
بھی ہیں' جہاں فوارے چلتے رہتے ہیں۔ لوگ حوض کی سیڑھیوں پر بھی بیٹھ کر حوض کے
فواروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔
درمیانی چھوڑی ہوئی جگہ پر جا بجا سیمنٹ کے بنچ ہیں۔ تھک جانے والے وہاں
بیٹھ کر ستاتے بھی ہیں' کھاتے پیتے بھی ہیں' لیکن کیا مجال کہ کوئی کاغذ یا چپس اور کوک کا
ٹن زمین پر پڑا ہو۔
مال' خریداری سنٹر سے زیادہ تفریح کی جگہ لگتی ہے۔
یہ مال چونکہ تین سٹوروں کے پیچھے بہت زیادہ طوالت پر محیط ہے' اس لیے کچھ
کچھ وقفے پر باہر نکلنے کے راستوں کا لکھا ہوتا ہے۔ آپ نے میسی سے باہر جانا ہے' سٹرن یا
لارڈ اینڈ ٹیلرز سے' پتھر کی تختیوں پر راستہ لکھا پڑھیے اور باہر نکل جایئے۔
مال سے باہر جانے کے پیچھے بھی راستے ہیں۔ ان کی ہدایات بھی درج ہوتی ہیں
اس لیے اجنبی آدمی بھی گم نہیں ہو پاتا۔
اسی مال میں ایک بہت بڑا کھانے پینے کا سنٹر بھی ہے۔ جہاں گولائی میں
سینکڑوں دکانیں ہیں۔ درمیان میں سینکڑوں ہی کرسیاں میز پڑے ہیں۔ یہاں ہر قسم کا فوڈ
مل جاتا ہے۔ اپنی مرضی سے جس قسم کا کھانا آپ کھانا چاہتے ہیں خریدیے۔ ٹرے میں
رکھئے اور آ کر میز کرسی سیدھی کریں۔ ٹرے میز پر رکھیں' کھانا کھائیں۔
خالی ٹرے کوئی اٹھانے نہیں آتا۔ ٹرے میں پڑے ڈسپوزیبل برتن یا بچا کھچا
کھانا بڑے بڑے ڈسٹ بن پڑے ہوتے ہیں۔ ان میں آپ کو خود ڈالنا ہوگا اور خالی
ٹرے اس کے اوپر رکھنا ہوگی۔
صفائی یہاں بھی اتنی ہوتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سینکڑوں لوگ بچے
بوڑھے آتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں لیکن گند نہیں ہوتا۔ ویسے بھی صفائی پر مامور عملہ فرش
صاف کر کے انہیں چمکاتا رہتا ہے۔

سٹوروں اور مال میں کاسمیٹکس کی دکانیں اور شعبے بھی دیدنی ہیں۔ میسی میں تو ایسا ایک شعبہ تھا۔ خاصا بڑا بھی لیکن اس کے پیچھے مال کے نچلے حصے میں کاسمیٹکس کی اتنی بڑی مارکیٹ ٹائپ شاپ بھی کہ اس میں گھومتے پھرتے چیزیں دیکھتے کافی وقت لگ جاتا ہے۔

یہاں ہر قسم کے پرفیومز ڈھیروں کے حساب میں شوکیسوں اور ریکوں میں ترتیب سے رکھے ملتے ہیں۔ میک اپ کی ساری چیزیں اور ہر قسم کے ہینڈ' باڈی اور چہرے کے لوشن بھی دستیاب ہیں۔ شیمپو ہزاروں قسم کے موجود ہیں۔ اس جگہ میک اپ کرنے والی لڑکیاں بھی ڈیوٹی پر کھڑی ہوتی ہیں جو عورتوں کو مفت میک اپ کرتی اور بتاتی ہیں کہ ان کے چہرے پر کیسا میک اپ سوٹ کرتا ہے۔ بڑے بڑے گولائی میں گھومنے والے لکنگ گلاسز کے سٹینڈ ہیں۔ عورتیں میک اپ کروا کے ہر رخ سے اپنا جائزہ لے سکتی ہیں۔

پرفیومز کا تو حساب ہی نہیں۔ یہ عام طور پر شیشے کے شوکیسوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ لیکن گاہکوں کی پسند کے لیے کچھ پرفیومز شوکیسوں کے اوپر بھی پڑے ہوتے ہیں۔ گاہک انہیں بلاتردد استعمال میں لا کر خوشبو سونگھ سکتے ہیں۔ ہاتھ پر سپرے کریں یا جسم پر۔ صرف سونگھنے پر اکتفا کریں۔ یہ آپ کی مرضی ہے۔ اتنا کرنے کے باوجود بھی آپ کو کوئی سینٹ پسند نہیں آتا۔ آپ خریدتے نہیں تو کوئی سیل گرل آپ سے کچھ نہیں کہے گی بلکہ ملائمت سے کہے گی۔ کوئی بات نہیں ہم معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو ہمارے سٹاک میں رکھا کوئی پرفیوم اچھا نہیں لگا۔ یہ بات وہ مسکرا کر کہے گی۔

میرے خیال میں وہاں سٹوروں' دکانوں اور سٹالز میں کام کرنے والی خواتین لڑکیوں اور مردوں کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ گاہک سے شائستگی سے پیش آئیں۔ ان کی کسی تنقید کا برا نہ منائیں۔ انہیں کسی شکایت کا موقع نہ دیں۔

میں پچھلے مال کی بات کر رہی تھی جس میں نچلی اور اوپر کی منزل پر دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ کون سی شے تھی جو یہاں دستیاب نہ تھی۔ سٹوروں کے شعبے تھے تو مال کی دکانیں تھیں۔ لوگ خریداری کر رہے تھے۔ گھوم پھر رہے تھے اوپر کی منزل کے برآمدے کی جالی دار تین فٹ اونچی دیوار پر جھکے نیچے گھومنے پھرنے والوں کو دیکھ بھی رہے تھے۔ زیادہ

لوگ لگتا تھا خریداری سے زیادہ تفریح کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

اسی مال میں ایک Pets کی بھی دکان تھی۔ چھوٹے بڑے مختلف نسلوں کے کتے اور بلیاں وہاں ملتی تھیں۔ جال دار پنجروں میں بند یہ جانور بچوں کے لیے دلچسپ چیز تھی۔ اسی دکان میں ان جانوروں کی بند سیل کیے ہوئے ڈبوں میں خوراک بھی ملتی تھی۔ میں نے یونہی تجسس کے لیے ایک سرخ اور سنہری رنگ کا ڈبہ اٹھا کر دیکھا۔ امریکہ میں غذا انسانوں کی ہو یا حیوانوں کی اس کے اوپر پورے اجزاء لکھے ہوتے ہیں۔

میں ڈبے پر اجزاء پڑھ کر حیران ہو گئی۔ گڈی میرے ساتھ تھی۔ اسے دکھاتے ہوئے کہا: ''گڈی ہمارے ہاں تو اتنی توانائی کی غذا انسانوں کو بھی میسر نہیں۔'' اور چیزوں کے علاوہ گوشت اور پنیر کا پڑھ کر تو ہم دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

اسی دکان سے کچھ آگے پرندوں کی شاپ بھی تھی۔ کئی قسم کی چڑیاں' طوطے' ابابیلیں اور اللہ جانے کون کون سے پرندے تھے۔ یہاں خوبصورت پنجرے بھی تھے اور ان پرندوں کی خوراک کی تھیلیاں اور ڈبے بھی۔

Pets کی دکان پر جانوروں کے شیمپو' پٹے' زنجیریں اور برش بھی رکھے ہوئے تھے۔ سردیوں میں انہیں گرم رکھنے کے لیے خوبصورت رنگوں کے جیکٹ نما لباس بھی تھے جو کمر پر ڈال کر نیچے پیٹ پر کلپ کے ساتھ باندھ دیے جاتے ہیں۔

ہم دونوں کچھ دیر کھڑی ان جانوروں کا تماشا کرتی رہیں اور ان کا موازنہ اپنے ہاں کے جانوروں سے کیا' انسانوں سے کرتی رہیں۔

مال بے حد لمبا چوڑا تھا۔ گھومتے پھرتے ہم تھک گئیں۔ کھانا بھی کھا لیا تھا اور سیر بھی کر لی تھی۔ کچھ چیزیں سٹورز سے اور کچھ مال کی دکانوں سے خریدی تھیں۔ میں نے گڈی سے کہا: ''اب واپس چلتے ہیں۔''

آمنہ' نسیمی اور بھائی کہیں نظر نہیں آ رہیں۔''

''یہیں کہیں ہوں گی واپس چلتے ہوئے مل جائیں گی۔ مجھ سے تو اب یہ بوجھ اٹھا کر چلا نہیں جا رہا۔''

میں نے اپنے نواسوں کی فرمائش پر ان کے لیے جوگرز اور بوٹ خریدے تھے۔
اپی، بی رفعت کے دونوں بیٹوں بلال اور زلفی نے یہ چیزیں منگوائی تھیں۔ ایک عدد جوگر فری کے بیٹے شیری کے بھی لیے تھے۔ کچھ سویٹر بھی لیے تھے۔ اس لیے انہیں لیے لیے چلنا مشکل تھا۔ گڈی پہلے ہی لدی پھندی تھی اس لیے وہ بھی واپسی پر رضامند تھی۔

ہم کوئی دو فرلانگ واپس ہوئیں تو ہمیں آمنہ نسیمی اور رقیہ مل گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں بھی شاپنگ کے لفافے ہی لفافے تھے۔ اس لیے سب نے واپسی پر رضامندی ظاہر کی۔ آمنہ کے ہاتھ میں چیونگ گم' ٹافیاں اور چاکلیٹس تھیں۔ ساتھ ہی اس نے رقیہ اور امی کا بار بھی اٹھایا ہوا تھا۔

ہم سب نے ایک ایک چیونگ گم منہ میں ڈالی اور باتیں کرتی واپس ہو لیں۔

تو

یہ تھا

ایک بڑے سٹور اور مال کا مختصر سا تعارف۔ اس طرح کے سٹورز اور مال کا سلسلہ پورے امریکہ میں پھیلا ہوا ہے۔ کہیں یہ بہت بڑے ہیں' کہیں قدرے چھوٹے لیکن سلسلہ اور طریق کار ایک جیسا ہے۔ نیو یارک ہی میں جو میسی سٹور ہے وہ پورے امریکہ میں غالباً سئیرز کے بعد بڑا سٹور ہے۔ یہ کئی منزلوں پر مشتمل ہے اور ہر منزل لمبائی چوڑائی میں کافی بڑی ہے۔ یہ شاپنگ سنٹر افقی انداز میں ہے یعنی نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ نچلی منزل میں داخل ہوں تو بازار کے ساتھ ساتھ دکانوں کے سامنے بنے ہوئے چوڑے برآمدے سے گزر کر اندر جاتے ہیں۔ پھر ایلی ویٹر یا سیڑھیاں استعمال کر کے جاہے جس منزل پر جانا ہو چلے جائیں۔

آمنہ نے ہمیں نیو جرسی کے سارے ہی سٹور دکھا دیے۔ ان سٹوروں پر بھی لے گئی جہاں صرف الیکٹرونکس یعنی ٹی وی' ویڈیو کیمرے' عام کیمرے' ریڈیو' ڈیک اور اسی نوعیت کی چیزیں تھیں۔ ایک سٹور فریج' فریزر' آئس باکس قسم کی چیزوں سے بھرا بھی دیکھا۔ آمنہ وہاں بھی لے گئی جہاں صرف فرنیچر ملتا تھا۔ اوک کا نئے طرز کا فرنیچر۔ وکٹورین سٹائل

فرنیچر' سستا بھی اور مہنگا ترین بھی۔

گاڑیوں کے شوروم بھی دیکھے۔ سپورٹس سائیکلیں بھی دیکھیں۔

امریکہ میں ہر چیز اقساط میں مل جاتی ہے۔ مکان' گاڑی' فرنیچر' آرائش کا سامان' کارپٹس' پردے' باتھ روم کا سامان جو چیز بھی لینا چاہیں اقساط میں مل جاتی ہے۔ کچھ ڈاؤن پے منٹ کریں' پھر ماہانہ اقساط میں برسوں اقساط دیتے رہیں۔ ان کے لیے کریڈٹ کارڈ کی سہولت بھی مہیا کی جاتی ہے۔

آمنہ ہمیں تفصیل سے اقساط میں چیزیں خریدنے کے متعلق بتا رہی تھی۔ کریڈٹ کارڈ کا سمجھا رہی تھی۔ بینک بیلنس کی گارنٹی...... جاب کی گارنٹی ان چیزوں کے خریدنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

"آمنہ۔" ایک دن یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ میں نے آمنہ سے پوچھا۔

"جی رضیہ خالہ۔" وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔

"اس طرح چیزیں دینے میں کمپنیوں یا سٹوروں کو نقصان نہیں ہوتا۔"

"نہیں ان کا مارجن تو ہوتا ہے نا منافع کا۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"تو۔"

"دیکھو نا جب بندہ کار قسطوں میں خریدتا ہے یا کوئی اور چیز۔"

"ہوں۔"

"اگر وہ فراڈی ہو تو یہ چیزیں لے کر بھاگ بھی سکتا ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔

پھر

بولی: "کبھی کبھار ایسا ہو بھی جاتا ہوگا لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔"

"کیا تم کہنا چاہتی ہو کہ یہاں سو فیصد لوگ ایماندار ہیں۔"

"اصول کے پکے ضرور ہیں۔ یہ فراڈ اگر کوئی کرتا بھی ہوگا' تو غیر ملکی یا کالا......

عام لوگ ایسا نہیں کرتے۔ اقساط میں چیزیں خریدنا یہاں اتنا عام ہے سو لوگ اس سہولت
سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جعلسازی نہیں کرتے۔ پھر ایسا کر کے وہ جائیں گے کہاں؟ یہاں
پولیس چوکس اور خبردار ہے۔ میرے خیال میں یہاں فراڈ ہوتا ہوگا تو نہ ہونے کے برابر۔
ورنہ کمپنیاں اتنے احمقانہ سودے کریں ہی نہیں۔"

میں نے یوں ہی سر ہلایا۔

آمنہ بولی: "اب ہمیں دیکھیں ہم نے کتنی چیزیں کریڈٹ پہ لے رکھی ہیں۔
آصف کی گاڑی تو شمیم خالہ نے دی تھی۔ میں نے اقساط میں خریدی ہے۔ ہر ماہ باقاعدگی
سے قسط ادا کرتی ہوں۔"

چند منٹ یہی باتیں ہوتی رہیں

پھر روز کی طرح

سب

اپنے اپنے شاپنگ کے لفافے لے آئیں۔ نسیمی گڈی رقیہ اور میں نے آج جو
کچھ خریدا تھا' وہ ایک دوسرے کو دکھانے لگیں۔

یہ ہمارا تقریباً روز ہی کا معمول تھا۔

کوئی چھوٹی سی بھی چیز لیتا' دوسروں کو ضرور دکھاتا۔

پھر ہم چاروں اپنی شاپنگ کا حساب کتاب کرنے لگتیں۔

"میرے اتنے ڈالر خرچ ہوئے ہیں۔"

اور

"میرے اتنے۔"

"آج میں نے زیادہ ہی چیزیں خرید لیں۔ کافی ڈالر خرچ ہو گئے ہیں۔"

ہمارا

معمول تھا کہ روزانہ جتنی شاپنگ کرتے' جتنے ڈالر خرچ کرتے' ان کا حساب
کتاب کرتے۔ ان دنوں ڈالر پینتالیس روپے کا تھا۔ ہم چاروں کاغذ پنسل لے کر

جتنے ڈالر خرچ کیے ہوتے' ان کو پینتالیس سے ضرب دے کر روپوں میں تبدیل کرتے کہ
آج اتنے روپے خرچ کیے' کل اتنے کیے تھے۔

ہمارے اس حساب کتاب پر آمنہ' شمیم اور اکثر خالد بھی بہت ہنستا۔

وہ کہتا: "جو خرچ کر چکے ہو...... وہ ختم...... اس طرح روپوں میں تبدیل کرنے
کا فائدہ؟"

"بھئی تم امیر آدمی ہو...... تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اور آپ لوگوں کو کیا فرق پڑتا ہے......"

"ہم لوگ روپوں سے ڈالر خرید کر لائے ہوئے ہیں اور بے حساب بھی نہیں۔ ہر
ایک کے پاس ہزار ڈالر سے زیادہ نہیں۔ ہم نے تو دیکھنا ہے پینتالیس ہزار روپے کو کس
طرح خرچ کیا اور اس میں سے کیا کیا چیز خریدی۔"

وہ پھر بھی ہمارے حساب پر ہنستا رہتا اور شمو بھی۔

آمنہ ہنس کر کہتی: "ماموں انہیں کرنے دیا کریں حساب۔ یہ لوگ روپوں میں
کماتے ہیں اس لیے روپوں میں حساب کر کے انہیں تسلی ہوتی ہے۔"

یہ بات ٹھیک بھی تھی۔

ہاں تو آمنہ نے ہمیں نیوجرسی کی خوب سیر کرائی۔ سٹوروں' مارکیٹوں اور مالز کے
ساتھ اس نے ہمیں گرد و نواح میں بہت بڑے بڑے "آؤٹ کٹس" بھی دکھائے۔ یہ ایک
طرح کے سٹور کم گودام ہوتے ہیں۔ یہاں سے کمپنیاں سٹوروں کو مال بھیجتی ہیں۔ یہاں جو
گوداموں کے ساتھ سٹور ہوتے ہیں' وہاں سٹوروں کی نسبت قیمتیں کافی کم ہوتی ہیں کیونکہ
یہاں سے تھوک کے حساب سے سامان سٹوروں کو جاتا اور فروخت ہوتا ہے۔

آمنہ ہمیں ایک کوٹ بنانے والی فیکٹری بھی دکھانے لے گئی۔ لونگ' شارٹ
درمیانے ہر قسم کے تیار کوٹ ہزاروں کی تعداد میں ہینگروں پر لٹکے تھے۔ گرم' ٹراپیکل اور
ٹھنڈے ہر قسم کے کوٹ وہاں پڑے تھے۔

یہاں سے بھی یہ تیار مال سٹوروں میں جاتا تھا۔

ہم اب سٹور دیکھ دیکھ کر بور ہو چکے تھے اس لیے کچھ دن اپنے عزیزوں اور شمو کی سہیلیوں کے ہاں جانے کا پروگرام بنا...... ہم لوگ پاکستان سے گئے ہوئے تھے اس لیے ہر عزیز اور دوست کی خواہش تھی کہ ہم ان کے ساتھ کھانا کھائیں' دن گزاریں...... امریکی ماحول میں غیر ملکیوں کو ہر سہولت حاصل ہوتی ہے' لیکن ان کی رشتہ داروں سے دوری...... دوستوں سے الگ تھلگ ہو کر رہنے اور ایک مشینی ملک میں جہاں عورتیں مرد صرف لگتا ہے کام کرنے کے لیے ہی بنے ہیں' ان حالات میں اپنا ملک چھوڑ کر یہاں بس جانے والوں کو تنہائی بہت ڈستی ہے اور جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ ان کا کوئی ہم وطن کچھ دنوں کے لیے یہاں آیا ہے تو اس سے ملنے اسے مدعو کرنے میں وہ بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ خاص کر اپنے قریبی عزیز آئے ہوں تو ان کی خوشی دوچند ہو جاتی ہے۔

صائمہ فجی جزیرے میں ہنی مون منا کر واپس آ گئی تھی۔ اس کا شوہر سیدھا لاس اینجلس چلا گیا تھا' کیونکہ سرجری کے اس کے تقریباً چھ مہینے باقی تھے۔ صائمہ یہاں سامان لینے آئی تھی۔ گھر ڈاکٹر صاحب نے لے لیا ہوا تھا یعنی سنگل بیڈ روم اپارٹمنٹ۔

صائمہ کو سب نے گھیر لیا۔ فجی کے متعلق پوچھا۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''ہم نے وہاں بہت انجوائے کیا۔ کوئی مصنوعی چیز وہاں نہیں دیکھی۔ قدرت کا حسن ہی حسن ہے۔ بارشیں بہت ہوتی ہیں۔ مچھر بھی بہت ہے لیکن جو ہوٹل قسم کے کمرے وہاں چند ایک بنے ہیں' وہاں بجلی وغیرہ نہیں ہے...... ہاں مچھر دانیوں کا انتظام ضرور ہوتا ہے۔''

''اور کھانا پینا۔'' کسی نے کہا۔

''چائے۔ ناشتہ اور کھانا وغیرہ وہیں سے مل جاتا ہے' لیکن وہاں اتنی خوبصورتی ہے' اتنا نیچرل پن ہے کہ کھانے پینے کے متعلق نخرے کرنے کا سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی......''

''تو گویا تم خوب خوش باش رہی ہو۔''

''بالکل۔''

پھر اس نے اپنی تصویریں ہمارے سامنے رکھ دیں۔ جو وہاں اتروائی اور پتہ نہیں کس جزیرے سے ڈویلپ کروائی تھیں۔

''صائمہ۔'' گڈی نے کہا۔

''جی۔''

''تمہاری شادی ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں۔ تم نے نہ تو نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ نہ زیور۔ نہ میک اپ......''

وہ مسکرائی

اور

بولی: ''میرے پاس پہننے کو کپڑے ہیں نا......''

''شادی سے پہلے کے...... پرانے؟......'' نسیمی نے کہا۔

''ہاں...... پرانے کہاں ہیں۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں......''

''یہی اب سان فرانسسکو اور لاس اینجلس لے کر جاؤں گی۔''

''ہائے ہائے نسیمی خالہ۔ تو کیا انہیں پھینک کر نئے خریدوں گی۔ بس نانی نے شادی کا اتنا مہنگا جوڑا میرے منع کرنے کے باوجود بنا دیا تھا...... وہ بھی ایک دن پہنا...... اب الماری ہی میں ٹنگا رہے گا...... آپ لوگ تو شادی کے کپڑوں پر بہت پیسہ ضائع کرتے ہیں......''

''چلو کپڑوں کو چھوڑو۔ تم نے یہی امریکی لباس ہی پہنا ہے۔ لیکن نئی دلہن ہو کانوں میں' گلے میں' بانہوں میں زیور تو پہنو......''

''

کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ''میں نے صرف یہ انگوٹھی پہنی ہے اور پہنے رہوں گی۔'' اس نے شوہر کی دی ہوئی بیش قیمت ڈائمنڈ کی انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا۔

''اور وہ جو شادی کے جوڑے کے ساتھ امی نے سونے کا روبیز اور زرقون کا سیٹ بنوایا ہے۔''

"میری الماری میں پڑا ہے۔ میں زیور نہیں پہنتی۔"

"اور میک اپ تو کر لیا کرو۔"

"میں میک اپ بھی نہیں پہنتی......"

اس کی بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ وہ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگی اور بولی:

"کیوں ہنسے ہیں آپ۔"

"صائمہ بیٹے میک اپ پہنتے نہیں کرتے ہیں۔ تمہاری اس اردو پر سب ہنسے ہیں۔"

وہ بھی ہنس پڑی۔

"چلو میک اپ پہنو یا نہ پہنو' تھوڑی سی لپ اسٹک ضرور لگا لیا کرو۔ شادی شدہ تو لگو۔" آمنہ نے اسے ٹہوکا دیا۔

"لپ اسٹک لگانا شادی کی سند تھوڑا ہی ہے۔ کئی لڑکیاں' غیر شادی شدہ عورتیں بھی اسے استعمال کرتی ہیں۔"

"چلو تم بھابی کی بات مان لو نا۔" نسیمی نے کہا۔ "لپ اسٹک لگا لیا کرو۔ امی نے اتنی ڈائمنڈ' پرل اور سونے کی چیزیں دی ہیں وہ پہنا کرو۔ کبھی کبھی پاکستانی لباس بھی پہن لیا کرو۔ یہ جو پاکستان سے تمہارے لیے اتنے خوبصورت خوبصورت کپڑے آئے ہیں' وہ الماری ہی میں ٹنگے رہیں گے؟"

"نسیمی خالہ! میں اب سان فرانسسکو جا رہی ہوں۔ وہاں یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ ویسے بھی مجھے ان کپڑوں کی عادت نہیں۔ ضائع نہیں ہوں گے۔ آمنہ پہن لے گی۔"

"میں؟" آمنہ ہنس کر بولی۔ "تمہارے کپڑے مجھے پورے آ سکتے ہیں۔ جو تم سے فٹ بھر لمبی ہوں۔"

آمنہ کی بات پر سب ہنس پڑے۔ وہ صائمہ سے فٹ بھر نہ سہی چھ انچ ضرور لمبی تھی۔

ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔

پھر صائمہ اٹھی۔ "یہاں آپ سب میں بیٹھ کر گپ شپ کرنا اچھا تو لگتا ہے لیکن میں نے بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"کام؟"

"تو اور کیا...... سب سے پہلے تو اپنی گاڑی سان فرانسسکو کے لیے بک کرانی ہے۔ پھر گھریلو ضرورت کا سامان اکٹھا کرنا ہے۔ اسے پیک کرنا اور بک کروانا ہے...... اپنی ٹکٹ لینی ہے...... اس طرح بڑے کام ہیں۔"

"میں مدد کر دیتی ہوں۔" آمنہ بولی۔

"نہیں نہیں تم اپنی امی' ماموں اور خالاؤں سے باتیں کرو۔ ان کی خاطر مدارات کرو۔ اپنے کام میں خود کر لوں گی۔"

امریکہ میں لوگوں کو اپنے کام خود کرنے کی اتنی عادت ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں کسی دوسرے کی مدد لینے کو اسے تکلیف دینے یا اس کا وقت ضائع کرنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

چنانچہ

صائمہ نے اپنی گاڑی خود ہی جا کر بک کروائی۔

اپنا سامان تہ خانے سے خود ہی اوپر لا لا کر رکھا۔ جتنے گفٹ تھے وہ اٹھا کر لاؤنج میں رکھے۔ وہ ساری گھریلو ضرورت ہی کی چیزیں تھیں لیکن اسے جو کچھ اپنے گھر کے لیے چاہیے تھا' نکال کر الگ کر لیا۔

پھر وہ گتے کے بڑے بڑے کارٹن بھی خود ہی لے کر آئی۔ سارا سامان اس نے چیک کر کے خود ہی ان ڈبوں میں بھرا۔ آمنہ نے زبردستی اس کے ساتھ پیکنگ کروائی۔

اگلے دن اس نے اپنے استعمال کے کپڑے اپنی الماری کے ہینگروں سے اتار کر دو سوٹ کیسوں میں رکھے۔ کپڑے بہت زیادہ نہ تھے۔ سان فرانسسکو میں اتنی سردی بھی نہ تھی' اس لیے ضرورت کی اشیاء ہی لیں۔ ہاں بیڈ شیٹس اور تولیے ایک بکس میں بھر لیے۔ وہ نہاتے وقت دو تولیے استعمال کرتی تھی۔ ایک بال لپیٹنے کے لیے' دوسرا جسم پونچھنے کے لیے۔ یہ تولیے استعمال کے بعد وہ دھونے کے لیے ٹوکری میں ڈال دیتی تھی۔ بیڈ شیٹس بھی دوسرے دن بدلتی تھی۔ اس لیے اس نے یہ چیزیں سوٹ کیس میں بھر لیں۔

وہ ہمیں تو کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ ہم سب اس کی تیاریوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

ہم کیا اس کے کسی کام میں نہ تو شمیم نے دخل دیا نہ ہی صائمہ نے اس سے پوچھا۔

ہاں دو ایک چیزیں جو شمیم کی تھیں وہ لے جانا چاہ رہی تھی۔ اس لیے شمیم سے پوچھا: ''امی آپ کا رائس کُکر لے جاؤں۔''

''جو چیز چاہے لے جاؤ۔'' شمو نے کہا۔

''نہیں صرف رائس کُکر اور گولڈ پلیٹڈ ٹی سیٹ۔''

''یہ دونوں چیزیں میں نے تمہارے لیے ہی رکھی ہوئی تھیں۔ میرے پاس پہلے والا رائس کُکر ہے......''

شمیم نے ویسے تو صائمہ کی شادی پر بے انتہا پیسہ لگایا تھا' لیکن ہمارے یہاں کی شادیوں کی طرح کوئی جہیز نہ بنایا تھا۔ وہی پہنے ہوئے کپڑے صائمہ ساتھ لے جا رہی تھی۔ اپنے استعمال شدہ تولیے اور بیڈشیٹس بھی اپنی استعمال شدہ تھیں۔ گھریلو استعمال کی وہ چیزیں جو برائیڈل شاور میں اسے ملی تھیں' لے جا رہی تھی۔

کمال کی بات ان گفٹس کی لسٹ صائمہ نے بنا کر دینے والے کا نام لکھ کر اپنے پاس رکھی تھی۔ شادی والے دن جو بند لفافوں میں لوگوں نے ڈالر دیے تھے' وہ حساب کتاب بھی اسی کے پاس تھا۔ یعنی جب ان لوگوں میں سے کسی کو کچھ دینا پڑا' شادی یا کسی اور خوشی کے موقع پر' تو وہ شمیم نے نہیں صائمہ اور ڈاکٹر صاحب نے لوٹانا تھا۔

ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ شادی یا کسی خوشی کے موقع پر بیٹی بیٹے کو جو کچھ ملا ہے وہ تو گیا ان کے کھاتے میں' لیکن ماں باپ ان دینے والوں کے گفٹ اور پیسے کسی نہ کسی صورت اتارتے رہتے ہیں۔

صائمہ کا جہیز تو ایک طرف لڑکے کی طرف سے بری قسم کی بھی کوئی چیز نہ تھی۔ صرف اس کے شوہر نے ایک بیش قیمت ڈائمنڈ کی رنگ اسے پہنا دی تھی۔ دوستوں نے پھولوں کے تحفے دیے تھے۔ کزن اور پھوپھی صائمہ کے لیے پریزنٹ لائے تھے۔ کزن

نے دونوں کو پرفیوم اور پھوپھی نے صائمہ کو ایک لانگ ڈریس دیا تھا۔

یہ گفٹ سمجھ لیں یا بری۔ بات ختم۔

امریکہ میں بہت کم پاکستانیوں نے ان کی یہ رسمیں اپنائی ہیں۔ یہ لوگ وہاں بھی دھوم دھام سے شادیاں کرتے ہیں اور جہیز بری کی ہر چیز دی جاتی ہے۔ وہاں تو لوگ پیسہ بھی خوب کماتے ہیں' اس لیے خرچ کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ اب وہاں پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو گئی ہوئی ہے۔ اس لیے دیکھا دیکھی اپنے رسم و رواج پورے کرتے ہیں۔

مجھے صائمہ کی شادی کا سٹائل اچھا لگا۔ شمیم چھبیس ستائیس سال سے امریکہ میں اُستھیزیا کی سپیشلسٹ ہے۔ روپے پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں۔ چاہتی تو اکلوتی بیٹی کے لیے ڈھیروں کپڑے بنا سکتی تھی۔ ضروری اور غیر ضروری چیزیں وافر مقدار میں دے سکتی تھی۔

لیکن

اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیش ضرور دیا تھا لیکن فالتو چیزیں نہیں بنائی تھیں۔ ہاں شادی کے سارے فنکشن بڑی دھوم دھام سے کیے تھے۔ پاکستان سے آنے والوں کی خاطر مدارات میں کمی نہ کی تھی۔

چلیے۔

اپنی اپنی سوچ۔ اپنی اپنی پسند۔

صائمہ لاس اینجلس چلی گئی۔ اس نے اپنے سارے کام خود ہی کیے تھے۔ گاڑی کی بکنگ' سامان کی پیکنگ اور بکنگ۔ حتیٰ کہ ٹکٹ بھی خود ہی خرید لائی۔ نہ اس نے ماں کو تکلیف دی' نہ ہم میں سے کسی کو۔ وہ تو ایئرپورٹ پر جانے کے لیے ٹیکسی بھی بلانے والی تھی کہ شمیم اور خالد نے منع کر دیا۔ وہ دونوں اسے خود ایئرپورٹ لے گئے۔

امریکہ میں ٹیکسی گھر پہ منگوانا بھی کوئی مشکل کام ہے۔ یہاں کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ٹیکسی سروس کا نہایت عمدہ انتظام ہے۔ آپ کسی ٹیکسی سروس کا نمبر ٹیلی فون

ڈائریکٹری سے لے سکتے ہیں۔ جس سروس کو چاہیں فون کر کے ٹیکسی منگوالیں' چند منٹ میں ٹیکسی آپ کے دروازے پر ہوگی۔

امریکہ میں گاڑیوں کی بہتات ہے۔ ہر بالغ فرد کے پاس اپنی گاڑی موجود ہوتی ہے۔ امیر لوگوں کے پاس کئی کئی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ بعض شوقین امراء گاڑیوں کے فلیٹ رکھتے ہیں۔

لیکن

بعض اوقات ٹیکسی کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے۔ اگر شمیم اس دن گھر نہ ہوتی اور خالد بھی کہیں گیا ہوتا تو گھر میں گاڑیاں ہونے کے باوجود صائمہ کو ٹیکسی منگوانا پڑتی اور یہ بات وہاں معیوب نہ ہوتی کہ گاڑیوں کے ہوتے ہوئے وہ ٹیکسی پر جا رہی ہے۔

اتفاق ہی کی بات تھی کہ اس دن شمیم جلدی آ گئی۔ نہ بھی آتی تو خالد گھر پہ تھا۔ اس کے پاس انٹرنیشنل لائسنس تھا۔ وہ وہاں گاڑی ڈرائیو کر سکتا تھا۔

خیر

صائمہ چلی گئی۔ اس کے پاس یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اس نے وہاں جا کر اپنا گھر ٹھیک ٹھاک کر کے گھرداری شروع کرنا تھی۔

پاکستان سے جب کوئی لڑکی بیاہ کر امریکہ جاتی ہے تو اسے سب سے زیادہ مسئلہ گھرداری کا ہوتا ہے۔ چونکہ گھر کے سارے ہی کام خود کرنا پڑتے ہیں' اس لیے شروع شروع میں لڑکیاں گھبرا جاتی ہیں۔ ایک کام کرتی ہیں تو دوسرا رہ جاتا ہے۔ چونکہ پاکستان میں نوکر آسانی اور تھوڑے مشاہرے پر مل جاتے ہیں' اس لیے ایسی لڑکیوں کو جن کے گھروں میں ہر کام کرنے کے لیے نوکر موجود ہوتے ہیں' امریکہ جا کر خاصی کوفت ہوتی ہے اور کام کرنے کی وہ آہستہ آہستہ ہی عادی ہوتی ہیں۔

لیکن صائمہ کے لیے گھرداری کوئی مسئلہ نہ تھی۔ وہ ہر کام خود کرنے کی عادی تھی۔ کھانا پکانا ٹھیک طرح سے آتا تھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کھانے پینے کے شوقین۔ مرچ مصالحے والی چیزوں کے عادی۔ رنگا رنگ کراری اور چٹ پٹی چیزیں مرغوب' لیکن صائمہ

کسی گھبراہٹ کا شکار نہ تھی۔ بہت سی چیزیں بنانا تو اس نے رقیہ مامی سے سیکھ بھی لی تھیں۔ بہت سے کھانوں کی ترکیبیں رقیہ سے پوچھ کر لکھ لی تھیں۔ انہیں پکانے سے پہلے اس نے کہا تھا: ''مامی میں فون پہ آپ سے پھر طریقہ اچھی طرح سمجھ لیا کروں گی۔''

صائمہ کی سوچ سمجھ اور مزاج امریکیوں جیسا بن چکا تھا۔ اس لیے ایسی باتوں پر وہ بالکل گھبرانا نہیں جانتی تھی بلکہ ہر کام کا تجربہ کرنے کا اسے تجسس بھی تھا۔



صائمہ کے جانے کے بعد شمیم کی دوستوں نے ہم پاکستانیوں کو کھانوں پر بلانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سب سے پہلے ہمیں ڈاکٹر منظور اور پروین نے مدعو کیا۔ یہ لوگ شمیم سے بھی پہلے کے امریکہ میں آ چکے تھے۔ تین بچے تھے۔ بیٹا انجینئر' بیٹی ڈاکٹر اور دوسری بیٹی لا کر رہی تھی۔ بہت مخلص لوگ تھے۔ ٹھیٹھ پنجابی میں باتیں کرتے تھے۔ اپنی زبان اور اپنے ملک کو بھولے نہیں تھے۔ ہاں ان کے بچے بھی صائمہ کی طرح تھے۔ زیادہ روانی سے اردو نہیں بول سکتے تھے۔ بیٹی نے چونکہ میڈیکل پاکستان سے کیا تھا اور شادی بھی ایک پاکستانی سے ہوئی تھی' اس لیے وہ بول چال میں ٹھیک ٹھاک تھی۔

ہمارے علاوہ انہوں نے چند اور لوگوں کو بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ وہ لوگ بھی ان سب کی طرح انتیس تیس سال پہلے پاکستان سے یہاں آ کر سیٹل ہوئے تھے لیکن اس محفل میں سب اپنے پاکستانی لباس میں شریک ہوئے تھے۔ گپ شپ بھی اسی طرح لگ رہی تھی جیسے سب نیویارک کے کسی حصے میں نہیں لاہور کے کسی گھر میں جمع ہوئے ہیں۔

انہوں نے بھی بڑا پر تکلف کھانا بنایا ہوا تھا۔ نفس کھرا اور بے تکلف ہو جانے والے لوگ تھے' اس لیے ان کے ہاں محفل رات کے بارہ بجے تک چلی۔ واپس نیوجرسی نہ آنا ہوتا تو شاید ایک دو گھنٹے اور بیٹھنا بھی سب کو اچھا لگتا۔

منظور میڈیسن کے سپیشلسٹ تھے۔ ان کا گھر نیوجرسی سے نیویارک داخل ہونے کے بعد صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ ان کا کونڈو مینیم بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ ایک

سر سبز سے ٹیلے پر خوش رنگ درختوں سے گھرا ہوا تھا جو دیکھنے میں بڑا پر بہار لگ رہا تھا۔ سردی اور برفباری میں درختوں پر زیادہ پتے نہیں تھے لیکن پھر بھی بڑا اچھا تاثر دے رہے تھے۔ امریکہ کے ہر متمول گھرانے کی طرح ان کا گھر بھی ہر سہولت سے آراستہ تھا۔

وہیں ہمیں ڈاکٹر حلیم جو چائلڈ سپیشلسٹ تھے اور ان کی بیگم ریحانہ نے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ ریحانہ میری بہن نسیم کی نند ہے۔ وہ بھی نیویارک ہی میں رہتی ہے۔

نیویارک اور نیوجرسی کو دریائے ہڈسن ملاتا ہے۔ اس پر بنا ہٹری برج تین میل لمبا ہے۔ دریا یہاں بڑی سبک خرامی سے بہتا ہے۔ اس کے دونوں کناروں کی ڈھلانوں پر نیچے تک مکان بنے ہوئے ہیں۔ رات کے وقت اس پل پر سے گزرنے کا اپنا ہی لطف ہے۔ مکانوں میں جلتی بتیوں کا عکس پانی میں پڑتا ہے تو یوں لگتا ہے' ہزاروں دیئے جلا کر پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

یہ پل تین میل لمبا ہے۔ ٹنوں لوہا استعمال ہوتا ہے۔ ٹریفک ہر وقت رواں دواں رہتی ہے۔ اس پل کی بڑی بات یہ ہے کہ دونوں کناروں پر تھوڑی دور اندر تک ستون ہیں جن پر یہ پل کھڑا ہے۔ باقی درمیانی حصہ بغیر ستونوں کے ہے۔ اربوں ٹن لوہا اور بے ستون پل...... جس پر ہر لمحہ ٹریفک چلتی رہتی ہے۔ ایک عجوبہ ہی لگتا ہے۔

ریحانہ کے ہاں دعوت میں ابھی ایک ہفتہ تھا۔ اس دوران بشریٰ اور عمیرا نے سب کو گھر بلانے کی دعوت دی۔

لیکن ہم نے ابھی دو تین ماہ اور یہاں رہنا تھا' اس لیے ان سے کہہ دیا کہ اتنی جلدی نہ کریں۔ ہفتے میں ایک ہی دعوت ٹھیک رہے گی۔ ویسے بھی دونوں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اس لیے ہم نے ان کی دعوتوں کو فی الحال اگلے ماہ پر ڈال دیا۔

اب ہم نیوجرسی کے تقریباً سارے ہی سٹورز دیکھ چکے تھے۔ آمنہ ہمیں لے جاتی تھی۔ سیلیں لگی ہوئی تھیں' اس لیے ہم لوگ بھی کوئی نہ کوئی چیز خرید لیتے۔ مجھے میری بیٹیوں نے اپنی اپنی شاپنگ کے لیے پیسے بھی دیئے تھے۔ ان کی مطلوبہ شے ملتی تو وہ بھی خرید لیتی۔

اب ہم نے روزانہ سٹوروں کی سیر چھوڑ دی تھی۔ بار بار انہی جگہوں پر جانا' چیزیں دیکھنا' کچھ خریدنا اور تھک کر لوٹ آنا کچھ زیادہ من نہیں بھاتا تھا۔ ہاں کسی دن ضرورت کی کوئی چیز لینا ہوتی تو آمنہ کے ساتھ چلے جاتے۔

اس دن بھی ہم صرف رقیہ بھابی کے جوتے خریدنے کے لیے گئے۔ رقیہ کا پاؤں نہ تو بچوں میں آتا ہے نہ بڑوں میں' اس لیے ماپ کا جوتا ملنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اس دن آمنہ آئی تو بولی۔ "امی میں نے آپ کے ماپ کے شوز ایک جوتوں کی دکان پر دیکھے ہیں۔"

"سچ......" رقیہ تو خوشی سے اچھل پڑی۔

"ہاں......"

"تو چلو مجھے ابھی لے چلو۔"

"صرف تمہیں کیوں ہم سب جائیں گے۔" نسیمی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "صبح سے گپیں ہانک ہانک کر تھک چکے ہیں......"

"خیر تھکے نہیں۔" میں بولی۔ "ہاں یہ کہو کہ ہنس ہنس کر تھک چکے ہیں تو بات ٹھیک ہے۔"

"واقعی۔" گڈی بولی۔

ہم چاروں جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔ رقیہ کو جوتا ملنے کی خوشی تھی اور ہمیں باہر کی ہوا میں سانس لینے کی۔ آج کسی قسم کی خریداری کا موڈ نہ تھا۔

آمنہ ہمیں اسی دکان پر لے گئی جہاں اس کے خیال میں رقیہ کے ماپ کے کورٹ شوز تھے۔

شوز تو بہت اچھے اور کمفرٹ ایبل تھے لیکن وہی مسئلہ' تھوڑا کھلے تھے۔

"ہائے اللہ۔" آمنہ ہنس کر بولی۔ "امی آپ کے لیے جوتے ڈھونڈنا کتنا مشکل ہے۔"

لیکن

یہ مشکل حل ہوگئی۔ سیلز مین نے کہا کہ اس میں پتاوے (جوتوں کے اندر پاؤں کی شکل کا چمڑہ) ڈال لیں تو ٹھیک رہے گا۔"

"چلیں ڈال لیں۔" آمنہ نے کہا۔ "ٹرائی کر لیتے ہیں۔"

وہ ایک ایک پتاوا ڈال کر جوتے لے آیا۔ جب رقیہ نے پہنے تو وہ فٹ آئے۔ اس کی خوشی کی تو انتہا نہ رہی۔ پھر اسی خوشی میں اس نے دو چار اور دکانوں پر جوتے ٹرائی کیے۔

باقی ہم مارکیٹ میں ونڈو شاپنگ کرتے رہے۔

واپس لوٹ رہے تھے کہ ایک کافی شاپ پر نظر پڑی۔

آمنہ نے ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی پوچھا: "کافی پئیں گی آپ سب......"

"ضرور......" ہم سب بولے۔

ہم برآمدہ عبور کر کے شاپ کا شیشے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

یہ ایک چھوٹی سی شاپ تھی۔ دائیں ہاتھ کاؤنٹر پر ایک کالا بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک شیشے کا شوکیس تھا جس میں پیٹیز' کوکیز اور پیسٹریز پڑی تھیں۔ آدھا شوکیس خالی ہو چکا تھا۔ آدھے میں یہ چیزیں پڑی تھیں۔

اس کے سامنے دیوار کے ساتھ چھوٹی چھوٹی چوکور ٹیبلز تھیں جن کے آمنے سامنے کرسیاں تھیں' یعنی ایک ٹیبل پر دو بندے بیٹھ کر کھا پی سکتے تھے۔

ہم بیٹھ گئے۔ آمنہ نے کافی کا آرڈر دیا۔

"ساتھ کیا لیں گی۔" اس نے سب سے پوچھا۔

سب نے پیٹیز کے لیے کہا۔ "پوچھ لینا ان میں سور کی چربی تو استعمال نہیں ہوئی۔"

"پوچھ لیا ہے اور شوکیس پر لکھا ہوا بھی ہے۔" آمنہ بولی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور بولی: "پانچ بجے یہ دکان بند ہو جاتی ہے۔"

"دس منٹ ہی رہ گئے ہیں۔" گڈی نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔

"ہاں۔" آمنہ نے کہا۔ "پھر بولی۔" آپ لوگوں نے پیٹیز لینے ہیں تو لے لیں' پورے پانچ بجے شوکیس کا سارا سامان ڈسٹ بن میں پھینک دیا جائے گا۔"

"کیوں؟" ہم سب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بس پانچ بجے دکان بند ہو جاتی ہے۔ دوسرے دن صبح کھلتی ہے۔ تب تک یہ سامان رکھا نہیں جاتا۔ سب کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ان کے ٹھیک رہنے کا اتنا امکان نہیں ہوتا۔ فوڈ پوائزننگ سے یہ لوگ بہت ڈرتے ہیں کیونکہ کسی ایک گاہک کی بھی ایسی شکایت ہو جائے تو مقدمہ درج ہو جاتا ہے۔ لوگ یہاں Sue کرنے سے بالکل نہیں پیچھے ہٹتے......" آمنہ نے کافی کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"دس منٹ پہلے ایک چیز ٹھیک ہے اور دس منٹ بعد خراب ہو جاتی ہے۔ یہ کیا تک ہوئی۔ ابھی ہم یہ چکن پیٹیز کھا رہے ہیں۔ پانچ منٹ بعد بھی پیٹیز کھانے کے قابل نہ رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"رضیہ خالہ۔" آمنہ بولی۔ "یہ پاکستان نہیں جو چار چار دن کی باسی چیز بھی لوگ خرید لیں گے۔ یہ امریکہ ہے اور خوراک کے معاملے میں تو یہاں دکاندار کیا ہوٹل والے کیا ریسٹورنٹ والے کیا بھی بے حد محتاط ہوتے ہیں۔"

آمنہ نے مزید بتایا کہ پاکستان سے ان کا ایک واقف لڑکا پڑھنے کے لیے یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ جز وقتی کام بھی کرتا ہے۔ اس نے کچھ دن کے ایف سی میں کام کیا۔ وہاں بھی یہی اصول ہے کہ ٹائم گزر جانے پر سارا سامان کوڑے دانوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس لڑکے نے دو چار دن تو یہ تماشا دیکھا کہ چکن کی بھری ٹریز بن 'پیٹیز' آلو کے چپس جو کچھ بچتا ہے ٹین میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ رہ نہ سکا: "آپ لوگ اتنا خود ضائع کرتے ہیں' ان چیزوں کا کچھ بگڑا نہیں ہوتا۔ یہ باقی بچا خود پھینکنے کی بجائے کسی خیراتی ادارے یا غریب لوگوں میں بانٹ دیا کریں۔"

"کیوں؟ کیا وہ لوگ انسان نہیں۔ انہیں فوڈ پوائزننگ نہیں ہو سکتی۔ امیروں اور غریبوں کے پیٹ الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں۔"

وہ لڑکا اس جواب پر چپ تو ہو گیا لیکن کئی دن سوچتا رہا کہ پاکستان میں تو غریب لوگ کوڑے کے ڈھیروں سے چیزیں نکال نکال کر کھا لیتے ہیں۔ کیا وہاں غریبوں کے پیٹ

امیروں کے پیٹوں سے واقعی الگ قسم کے ہوتے ہیں۔

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ دکان کے اندر ایک نوجوان گوری داخل ہوئی۔ کاؤنٹر پر بیٹھے کالے سے اس نے دو چار باتیں کیں۔ پھر آگے بڑھی۔ شوکیس کھولا اور ہمارے سامنے چکن پیٹیز' کوکیز' کیک اور دیگر چیزوں کی ٹریز اٹھا اٹھا کر کوڑے دان میں پھینکنے لگی۔ کوئی ٹرے آدھی تھی۔ کوئی بھری ہوئی۔ اس نے سارا سامان پھینک دیا۔ غالباً وہ مالکن تھی۔

سامان پھینک کر وہ چلی گئی۔

ہم نے کافی ختم کی۔ لیکن اٹھنے سے پہلے ہم نے دیکھا کہ اس کالے نے ایک سیاہ شاپر میں کوڑا دان میں پھینکی ہوئی کچھ چیزیں بھر کر کری کے پیچھے چھپا کر رکھ لی تھیں۔

ہمیں اتنے دنوں میں پہلی بار احساس ہوا کہ غریب یہاں بھی غریب ہیں۔ یہ چیزیں وہ یقیناً گھر لے جائے گا اور بال بچوں کا پیٹ بھرے گا۔

ہم اسی تفاوت اور تضاد کی باتیں کرتے واپس ہو لیے۔ آمنہ ہم سے متفق نہ تھی۔ اس کی سوچ بھی اس معاملے میں امریکی ہو چکی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ "یہ کالا لالچ میں آ کر یہ چیزیں گھر لے جا رہا ہے ورنہ جو اصول ہے قانون ہے اسے اس کا پابند ہونا چاہیے۔ یہ اس شاپ پر کام کرتا ہے۔ ٹھیک ٹھاک پیسے لیتا ہوگا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی کام کر کے کچھ نہ کچھ کما لیتے ہوں گے۔ پھر اسے یہ چیزیں اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

خیر

باتیں ہوتی رہیں

اور

ہم مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔

گھر آئے تو دو تین جگہوں سے میرے نام فون آئے ہوئے تھے۔ امریکہ میں ہر فون پر آنسرنگ مشین لگی ہوتی ہے۔ جو فون کرنے والے کا پیغام نوٹ کر لیتی ہے۔ فون نمبر بھی ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ ایسی مشینیں اب پاکستان میں بھی دستیاب ہیں لیکن استعمال بہت کم کی جاتی ہیں۔

میں نے پیغام سنے اور باری باری سب کو فون کیا۔

مقررہ شام ہم ڈاکٹر کلیم اور ریحانہ کے ہاں کھانے پر پہنچے۔ یہ لوگ نیویارک کے کسی پوش علاقے میں رہتے تھے۔ پہلے ان کا بھی شیمو ہی کی طرح بہت بڑا گھر تھا لیکن اب وہ گھر بیچ کر یہ نیا کونڈومینیم لے لیا تھا۔ ان کے دو بچے بیاہے جا چکے تھے۔ ایک بیٹی ڈاکٹر تھی جو ابھی غیر شادی شدہ تھی۔ وہ نوکری کے سلسلے میں کہیں دور رہتی تھی۔ اس لیے اب ریحانہ اور کلیم کے لیے بہت بڑا گھر غیر ضروری تھا۔ یہ گھر بھی بہت خوبصورت تھا' تین بیڈ رومز کے علاوہ بڑی سی بیسمنٹ بھی تھی اور ایک طرف نہایت ہی پیارا سا سن روم بھی تھا۔

ریحانہ کے لاؤنج میں چنیوٹی فرنیچر تھا۔ رنگین پیڑھے بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ فرنیچر وہاں اتنا خوبصورت اور نایاب لگ رہا تھا کہ محتاج بیان نہیں۔ ریحانہ دو تین سالوں بعد پاکستان کا چکر لگاتی رہتی ہے۔ اس لیے وہاں سے فرنیچر وغیرہ بھی لے آتی ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی کا شوق اور نفاست طبع کا غماز بھی ہے۔ اب تو یہ لوگ بچوں سے بھی فارغ ہیں۔ اس لیے اکثر پاکستان آئے ہوتے ہیں۔

ریحانہ اور کلیم نے مل کر کھانا بنایا ہوا تھا' جو بے حد لذیذ تھا۔ ان لوگوں نے بھی بہت زیادہ ڈشز بنائی ہوئی تھیں۔ ان کا گھر بھی اتنا صاف ستھرا تھا کہ لگتا ہے ساری چمک دمک یہاں اتری ہوئی ہے۔ میں کسی کام سے اس کے کچن میں گئی۔ اتنا صاف ایسا نکھرا لگتا تھا کہ نہ تو یہاں کوئی چیز پکائی گئی ہے نہ ہی پکا کر رکھی گئی ہے۔ ایک چھلکا' ایک تنکا تک کہیں نظر نہیں آیا۔ اس گھر میں خوبصورتی کے علاوہ کمال کی صفائی بھی دیکھی۔

محفل خوب رہی۔ بے تکلفی سے گپ شپ بھی ہوتی رہی۔ چند اور پاکستانی جوڑے بھی مدعو تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ یہاں یہ سب لوگ بڑی خوشگوار زندگی جی رہے تھے لیکن ان کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وطن سے ان کے دل کے تار ابھی تک جڑے ہوئے ہیں اور رشتہ داروں' عزیزوں کی کمی انہیں یہاں شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

اس دن بھی رات گئے واپسی ہوئی۔

پٹڑی برج سے پھر گزرے۔ ہڈسن کے پانی میں بہتے ہوئے جلتے چراغ دعوت

نظارہ دے رہے تھے۔ یہ منظر کتنا خوبصورت تھا۔ شاید لفظ خوبصورت ان کی لو دیتی خوبصورتی کا احاطہ نہ کر پائے۔

بہر حال۔

ہمارے شب و روز اچھے گزر رہے تھے۔

عاطف اور سعدیہ اب فلوریڈا جا رہے تھے۔ وہ کئی دنوں سے روزانہ نیویارک جا کر وہاں کی چیدہ چیدہ چیزیں دیکھ آئے تھے۔ آج انہوں نے سٹیچو آف لبرٹی دیکھنے جانا تھا کیونکہ کل ان کی فلائٹ فلوریڈا کی تھی۔

اب تک

ہم لوگوں نے نیویارک کی سیر نہیں کی تھی۔ دعوتوں پر شام کو جاتے تھے اور رات گئے واپس آتے تھے۔

شمیم سے ایک دن ہم نے کہا تھا کہ ہمیں سٹیچو آف لبرٹی تو دکھالائے لیکن وہ ہنس کر بولی۔ "چھبیس سالوں میں میں نے سٹیچو آف لبرٹی جا کر نہیں دیکھا۔ آپ لوگوں کو وہاں لے جاؤں...... اوں ہوں...... ہاں میں آپ کو فلیمنگٹن کے آؤٹ لٹس اور اٹلانٹک سٹی دکھاؤں گی...... یہ میرا وعدہ......"

ہم نے دو ایک بار پھر بھی اسے سٹیچو آف لبرٹی دکھانے کا کہا' لیکن اس نے ناک منہ چڑھا کر انکار کر دیا۔

اب سعدیہ اور عاطف وہاں جا رہے تھے۔ ہم نے سوچا چلو انہی کے ساتھ جا کر مجسمہ آزادی دیکھ آتے ہیں۔

یوں تو وہ روز ہی نیویارک جاتے تھے۔ خالد ان کو بس سٹاپ پر ڈراپ کر آتا۔ واپسی پر وہ فون کر دیتے تو انہیں جا کر لے بھی آتا۔ شمیم کے گھر سے وینڈی ہوٹل جس کے سامنے بس سٹاپ تھا' تقریباً تین چار کلومیٹر تھا۔ اس کے گھر کے قریب سے کوئی وین وغیرہ بھی نہ چلتی تھی' اس لیے وینڈی تک تو کسی نہ کسی کو ڈراپ کرنے جانا ہی پڑتا۔

سعدیہ اور عاطف ہمارے سامنے ہی روزانہ جاتے تھے لیکن ان کے ساتھ جانے

کا ہمیں کبھی خیال ہی نہ آیا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے یہاں تھوڑی دیر رہنا تھا۔ ان کے پاس See America کا ٹکٹ تھا' جس پر وہ چار اور ریاستوں کا وزٹ کر سکتے تھے۔ فلوریڈا میں سعدیہ کی بہن بھی رہتی تھی۔ اس لیے یہاں سے وہ فلوریڈا جا رہے تھے۔ فلوریڈا کے شہر اور لینڈو میں تفریحی سرگرمیاں اور دلچسپیاں اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں ہر وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ یہاں والٹ ڈزنی لینڈ کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ یہاں بیشمار ایسی تفریح گاہیں ہیں جنہیں دیکھنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ فلوریڈا زولوجیکل پارک' گیز لینڈ کا چڑیا گھر' میڈول ٹائمز' میڈول لائف ولیج' فلوریڈا یونیورسل سٹوڈیو اور میجک کنگڈم وغیرہ قابل دید جگہیں ہیں۔

سعدیہ عاطف کے پاس ان جگہوں کی تفصیلی لسٹ تو تھی لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ سب مقامات پر جا سکیں گے کیونکہ ایک ہفتہ وہاں گزار کر انہوں نے کیلیفورنیا جانا تھا۔

خیر یہ تو ان کا فلوریڈا کا پروگرام تھا۔ اس دن وہ نیویارک کے آخری وزٹ پر جا رہے تھے اور مجسمہ آزادی دیکھنا تھا۔

''سعدیہ۔'' گڈی نے اسے تیار ہو کر آتے دیکھا تو بولی۔ ''تمہارا آج کا کیا پروگرام ہے۔''

عاطف جو پہلے سے کچن ہال میں کھڑا تھا بولا: ''آج ہم سٹیچو آف لبرٹی دیکھنے کو جا رہے ہیں۔''

''تو ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔'' وہ بولی۔

جھٹ سے رقیہ نے کہا۔ ''ہاں ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔''

''تمہیں ہمیں ساتھ لے جانے پر کوئی اعتراض تو نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اعتراض کیوں ہوگا۔'' عاطف سے پہلے ہی نسیمی بولی۔ ''ہم صرف ان کے ساتھ جائیں گے۔ باقی انہوں نے خود جہاں گھومنا پھرنا ہوا گھوم لیں گے۔''

''پھپھو۔'' سعدیہ جلدی سے بولی۔ ''آپ ضرور چلیں......''

''پھر جلدی سے تیار ہو جائیں۔'' عاطف نے کہا۔

''ہم نے کیا تیار ہونا ہے۔ کوٹ چڑھا لیتے ہیں۔ مفلر' ٹوپیاں اور شالیں اٹھا کر جاگرز پہن لیتے ہیں......''

''آج سردی بہت ہے۔'' رقیہ بولی۔ ''صبح برف بھی گر رہی تھی۔''

''تو کیا ہوا؟ یہ لوگ بھی تو جا رہے ہیں۔'' گڈی نے کہا۔

''بالکل۔ چلئے جلدی سے تیار ہو جائیے۔'' سعدیہ نے کہا۔

ہم بھاگم بھاگ الماریوں کی طرف لپکے۔ موٹی سویٹرز پہنیں' کوٹ چڑھائے' دستانے' ٹوپیاں' شالیں ہاتھوں میں لیں' موٹی جرابوں کے ساتھ جاگرز روز ہی پہن کر جاتے تھے۔ سو منٹوں میں تیار ہو گئے۔

خالد' سعدیہ اور عاطف کو بس سٹاپ چھوڑنے کے لیے اوپر سے تیار ہو کر اترا تو ہمیں دیکھ کر بولا: ''آپ لوگ بھی جا رہے ہیں۔''

''تو پھر وین لے جانی پڑے گی۔ گاڑی میں تو اتنے بندے نہیں آ سکتے......''

''جس میں مرضی ہے لے جاؤ۔ لیکن آج ہم جائیں گے ضرور۔''

خالد ہنسا اور بولا: ''آج عقل آئی ہے۔ روز سارا دن آپ چاروں گپیں لگا کر قہقہے ہی لگاتی رہتی ہیں۔ امریکہ آئی ہیں تو جہاں تک گھوم پھر کر دیکھ سکتی ہیں اسے دیکھیں...... امریکہ صرف سٹوروں تک تو محدود نہیں......''

''پہلے کہتے نا...... سعدیہ عاطف کی طرح ہمیں بھی بس سٹاپ پر چھوڑ آیا کرتے......''

''چلو آج سے سہی۔ روز تیار ہو جایا کرنا۔ میں ڈراپ کر آیا کروں گا۔ اس گھر کا پتہ اور فون نمبر جیب میں ڈال لیا کرنا...... بس سٹاپ کا نام یاد کر لینا۔ کہیں گم نہیں ہوں گی۔'' وہ مذاق کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جس دن بھی نیویارک دیکھنے کا پروگرام بنا کریں گے تمہیں بتا دیا کریں گے۔ ہمیں بس سٹاپ تک لے جایا کرنا......''

''نو پرابلم......'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں مخصوص الفاظ ادا کرتے ہوئے بولا۔

''ہم چاروں سعدیہ عاطف کے ساتھ بس سٹاپ پر جانے کے لیے گیراج میں کھڑی جیپ کے پاس آ گئے۔ خالد نے آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ سیفٹی بیلٹ پہنی' دوسری سیٹ پر عاطف بیٹھا۔ اس نے بھی سیفٹی بیلٹ پہن لی۔

''سیفٹی بیلٹ کے تم لوگ خوب عادی ہو گئے ہو۔'' میں نے دونوں سے کہا۔

''آپا۔ اس کے بغیر یہاں کار چلانا جرم ہے۔ فوراً تگڑا سا ٹکٹ مل جاتا ہے۔'' خالد نے کہا۔

''پاکستان میں تو جن کاروں میں سیفٹی بیلٹ ہوتی بھی ہے' سیٹ کے پیچھے ہی لٹکتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی استعمال ہی نہیں کرتا......''

''صرف سوزوکی ہی میں نہیں ہوتی ورنہ ہر بڑی گاڑی میں یہ بیلٹ ہوتی ہے۔'' خالد بولا۔ ''لیکن باندھتا کبھی کوئی نہیں۔''

''مادر پدر آزاد لوگ ہیں ہم۔'' نسیمی حسب عادت سب کو ہنسانے کے لیے تمسخرانہ انداز میں بولی۔

''اصول اور قانون کے قاتل کہیں پھپھو۔'' عاطف نے کہا۔ اس کی بات پر سب ہنس پڑے۔ خالد ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ ہے ہماری ذہنیت۔'' عاطف نے جو بات کہی اس پر تو رونا چاہیے۔ سب کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں......''

''ہنسی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ تم دونوں امریکی بننے کی کوشش کر رہے ہو۔'' نسیمی نے پھر کہا۔

''میں تو امریکی بن چکا ہوں۔'' خالد شوخی سے بولا: ''دیکھ لو۔ کتنی مہارت سے یہاں الٹے ہاتھ ڈرائیونگ کرتا ہوں۔ کتنی بار آ چکا ہوں۔ بہت ڈرائیونگ کی ہے' لیکن ایک بار بھی ٹکٹ نہیں ملا......''

''ہمارے ساتھ جایا کرو گے تو کسی نہ کسی دن تمہیں ٹکٹ دلا ہی دیں گے۔'' نسیمی نے کہا۔ سب اس کی بات پر ہنس پڑے۔

ہم سب یوں ہی ہنستے مسکراتے شمو کے گھر سے نکلے اور مختلف چھوٹی بڑی سڑکوں

سے ہوتے وینڈی ریسٹورنٹ کے قریب بس سٹاپ پر پہنچ گئے۔

ہم سب اترے تو خالد نے ہنس کر عاطف اور سعدیہ سے کہا۔ ''ان چاروں کو نیویارک سٹی میں گھومنے پھرنے کے لیے تنہا چھوڑ دینا......''

''انکل۔'' عاطف بولا۔ ''آج تو ہم سٹیچو آف لبرٹی دیکھنے جا رہے ہیں۔ سیدھے ادھر ہی جائیں گے۔ آج یہ ہماری ذمہ داری ہیں......''

''اوہ...... اچھا۔'' خالد ہنسا۔

سعدیہ بولی۔ ''تو اور کیا انکل...... یہ کہیں گم ہو گئیں تو آپ اور شمو پھپھو ہمارے سر ہو جائیں گے کہ ہماری موٹی تازی پیاری پیاری تین بہنیں اور بھابی کہاں چھوڑ آئے ہیں۔ تب ہم کیا کریں گے۔''

اس بات پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

پھر

خالد نے ہم سب کو اللہ حافظ کہا اور گاڑی نکال کر لے گیا۔ ہم اس کے انتظار میں بس سٹاپ کی سرخ ٹین کی ڈھلائی چھت تلے جہاں بیٹھنے کے لیے بنچ بھی پڑے تھے آ کر کھڑے ہو گئے۔

یہاں سے ہر پانچ سات منٹ کے بعد نیویارک کے لیے بس ملتی تھی۔ ایک نکل جاتی تو پانچ سات منٹ بعد دوسری آ جاتی۔

عاطف نے ہم سے کہا: ''جلدی نہ کیجئے گا۔ جس بس میں جگہ ہو گی اس میں سوار ہوں گے۔ ہر پانچ سات منٹ کے بعد بس آ جاتی...... جو یہاں سے لوگوں کو نیویارک کے بسوں کے اڈے پورٹ اتھارٹی تک لے جاتی ہے۔ ہم نے وہیں جا کر اترنا ہے۔''

ہم سب نے اچھا کہا۔

اور

پھر

دائیں طرف۔ جدھر سے بس نے آنا تھا لمبے لمبے کے بعد گردنیں موڑ موڑ کر دیکھنے لگے۔

آج ہم بذریعہ بس پہلی بار امریکہ میں سفر کرنے والے تھے۔ اس لیے قدرے تجسس بھی تھا۔

بس سٹاپ پر زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ہم تھے اور دوسرے سرخ وسپید ادھیڑ عمر کے امریکی۔ بس کے آتے آتے ایک موٹی تازی کالی عورت بھی آ گئی جو گہرے موٹے کوٹ میں اور بھی موٹی لگ رہی تھی۔ اس نے شوخ میک اپ کیا ہوا تھا اور جیولری بھی وافر مقدار میں پہنی ہوئی تھی...... سر پر گہرے موٹی سی ٹوپی تھی۔ موٹی تو تھی لیکن چہرے پر جاذبیت تھی۔ جوانی میں یقیناً بلا کی مقناطیسی کشش والی عورت ہو گی۔

وہاں ہم نے اکثر کالی عورتوں کو دیکھا۔ موٹے موٹے نقش ونگار' گھنگھریالے بال' چمکتے ہوئے سیاہ رنگ' اکثر بھدی اور بدوضع۔ لیکن بعض کالیاں بلا کی حسین اور مقناطیسی کشش والی بھی دیکھیں۔ کالے رنگوں کے باوجود ان کے نقوش دلآویز اور آنکھوں میں خیرہ کن چمک۔ بعض تو ایسی کہ لگتا صندل کی لکڑی سے تراشی ہوئی مورتیاں ہیں۔ انہیں دیکھو تو دل چاہتا ہے دیکھتے ہی چلے جائیں۔ بالکل کالی کاسنی کی مورتیوں جیسی بھی کالی حسینائیں دیکھنے کو ملیں۔

اس موٹی کالی گہرے رنگ کے پہاڑ کے تودے ایسی عورت نے ہمیں مسکرا کر دیکھا اور خوشدلی سے ''ہائے'' کہا۔

جواب میں ہم سب کے منہ سے جس طرح بیک وقت ہائے نکلا کہ یوں لگا سینہ کوبی کرتے ہوئے یہ لفظ منہ سے نکل گیا ہے۔ آواز بھی خاصی بلند جانے کیوں نکلی۔ شاید اس کی ہائے کا جواب جوش وخروش سے دینا مقصود تھا۔ اپنی آوازوں پر شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ تو شکر کہ اسی وقت بس آ گئی۔

عاطف نے بس دیکھی اور بولا: ''آ جائیں کافی سیٹیں خالی ہیں۔''

ہم ایک دوسرے کی طرف مسکراہٹیں اچھالتے بس کی طرف بڑھے۔

''عاطف۔'' میں نے کہا۔

''جی پھپھو۔'' وہ بس کے قریب کھڑے بولا۔

''ٹکٹ کہاں سے لیتے ہیں۔''

''آپ سوار ہو جائیں ٹکٹ بس ڈرائیور ہی دیتا ہے۔ میں لے لوں گا۔ آپ اندر جا کر اپنی اپنی سیٹ لیں۔''

ہم بس میں سوار ہوئے۔ گورا درمیانی عمر کا چاک و چوبند ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا ٹکٹوں کے پیسے وصول کر رہا تھا۔

میں اور نسیمی اکٹھے بیٹھے۔ ہمارے پیچھے دونوں سیٹیں گڈی اور رقیہ نے لیں۔ بائیں ہاتھ کی دو سیٹوں پر عاطف اور سعدیہ بیٹھ گئے۔ ہم سب کو اب بھی اپنے با آواز بلند اور بیک زبان ''ہائے'' کہنے پر ہنسی آ رہی تھی۔

ہم سب میں سے نسیمی ہنسنے ہنسانے کا فن بخوبی جانتی ہے۔ بچپن ہی سے وہ اس کام میں ماہر تھی۔ اب یہاں بھی جب سے ہم اکٹھے ہوئے تھے اس کا کام ہی یہی تھا۔ وہ باتیں اس انداز میں کرتی ہے اور شکلیں واقعے کے مطابق اس طرح سے بناتی ہے کہ ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

بڑی مدت کے بعد ہم پانچوں یعنی شمو' نسیمی' گڈی' رقیہ اور مجھے موقع ملا تھا کہ ہم دن رات اکٹھی رہ رہی تھیں۔ خالد بھی ہماری پارٹی میں شامل ہوتا۔ سعدیہ اور عاطف تو روزانہ سیر کے لیے نکل جاتے' لیکن ہم سب ہر وقت اکٹھے ہوتے۔ نسیمی کی باتیں ہوتیں اور ہم سب کے قہقہے۔ زندگی میں شاید ہم اتنا کبھی نہ ہنسے ہوں گے جتنا ان دنوں ہنسے۔ بعض اوقات تو یوں لگتا تھا جیسے ہم سب بہنیں اور بھائی اماں کے آنگن میں اکٹھے رہنے اور کھیلنے والے بچے بن گئے ہیں۔ بس کھانا پینا۔

اور

ہنسنا ہنسانا ہی کام رہ گیا ہے۔ بہت خوبصورت اور یادگار دن تھے وہ۔

شمیم ہسپتال سے آتے ہی ہماری محفل میں شامل ہو جاتی۔ زندگی کے کتنے ہی سال وہ ایسی خوبصورت محفل کے بنا تنہائی کی نذر کر چکی تھی۔ وہ تنہا رہنے کی عادی تھی لیکن اب تو لگتا ہم واپس چلے گئے تو اس کی زندگی اور سونی ہو جائے گی۔

-------O-------

بس

اب نیویارک کی جانب جا رہی تھی۔ سنا تھا کہ امریکہ میں بس کا سفر بڑا آرام دہ ہوتا ہے۔ آ ج دیکھ بھی لیا۔ بس نئی بھی تھی۔ نرم و گداز سیٹیں نہ رش نہ رولا...... صاف ستھری ہموار سڑک پہ روانی سے چلی جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف دور دور کہیں فیکٹریاں تھیں' کہیں سٹورز کہیں مکانات یعنی راستہ آباد تھا۔

ان بسیں اب پاکستان میں بھی آ گئی ہیں۔ ڈائیوو کی بسیں بھی اسی طرح کی ہیں جیسی امریکہ کی ہیں۔ تب یہ بسیں یہاں نہیں تھیں' اس لیے امریکہ کی بسیں ہمیں زیادہ ہی پُرسہولت اور آرام دہ لگیں۔

ہم باتیں کرتے ہنستے ہنساتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی بس کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ بھی کر لیتے۔ جب بس لنکن ٹنل میں داخل ہوئی تو ہم نے اپنی اپنی معلومات کے توسط سے اس ٹنل کے بارے میں ایک دوسرے کو بتانا شروع کر دیا۔ اس ٹنل کے اوپر سے دریا گزرتا ہے۔ اور نیچے سے اس کی Lanes میں سے ٹریفک آ جا رہی ہوتی ہے۔ ٹنل بالکل روشن ہے۔ کہیں بھی برقی روشنی کم نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہیں کہیں دیواروں میں پانی کی سیلن تھی۔

پل تین راستوں پر مشتمل ہے۔ ہر سڑک کی چوڑائی 21.6 فٹ ہے۔ بیرونی ڈایا میٹر 31 فٹ ہے اور سڑک سے دریا کی اونچائی 97 فٹ ہے۔ ٹنل کی تینوں ٹیوبز کی لمبائی کچھ مختلف ہے کیونکہ یہ اونچے نیچے تقریباً پہاڑی علاقوں سے گزرتی ہے۔

North Tube	7.482 Feet
Center Tube	8.215 Feet
South Tube	8.006 Feet

سنٹرل ٹیوب سب سے پہلے ٹریفک کے لیے کھولی گئی تھی۔ یعنی دسمبر 1937ء میں اسے استعمال میں لایا گیا تھا۔

نارتھ ٹیوب 1945ء اور ساؤتھ ٹیوب 1957ء کے لیے ٹریفک کے لیے کھولی گئی تھی۔

نیویارک کی آبادی جوں جوں بڑھتی جا رہی تھی' ٹریفک کی بہتات بھی مسئلہ بنتی جا رہی تھی۔ تب کروڑوں ڈالر خرچ کر کے یہ ٹنل بنائی گئی۔ اس سے نیویارک اور نیوجرسی کے درمیان ٹریفک کے رش پر کنٹرول کر لیا گیا۔ یہ ٹنل مین ہیٹن اور نیوجرسی کے درمیان بڑا اہم رابطہ ہے۔ صبح کے وقت جب دفتروں اور کام پہ جانے والوں کا بے حد رش ہوتا ہے۔ اس وقت یہ ٹنل بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ بوقت ضرورت یعنی اگر رش بہت ہی زیادہ ہو تو درمیانی ٹیوب کو دو حصوں میں منقسم کر کے دونوں طرف تین تین Lanes بنا دی جاتی ہیں جو ٹریفک کا بوجھ بڑی سہولت سے اٹھا لیتی ہیں۔

ٹنل سے نکل کر بس اب پورٹ اتھارٹی (نیویارک کا بسوں کا اڈا) کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بس اپنے مقررہ مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ یہ ایک بڑے گیراج سے مشابہ جگہ تھی۔

یہاں ہم سب اترے۔

اور

پھر

عاطف کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ پہلے دائیں ہاتھ کے ایک دروازے میں داخل ہوئے جو بہت بڑے ہال میں کھلتا تھا۔ وہاں سے ایسکے لیٹر کے ذریعے نچلے ہال میں آئے۔ کئی جگہ چوڑی چوڑی سیڑھیوں سے اترے اور کئی جگہ ہموار فرش پر چلتے گئے۔ پورٹ

اتھارٹی بہت ہی بڑی عمارت ہے جس میں بسیں آ کر رکتی اور چلتی ہیں۔ یہ عین نیویارک کے ایونیو کے اوپر ہے۔ سڑک کی طرف سے نظر آنے والی اوپر سے نیچے تک شیشے کے بلاک کی ہے۔ یعنی آپ سڑک پر کھڑے ہوں تو پورٹ اتھارٹی کے اندر اوپر سے نیچے آنے والی بسوں کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ بسیں اس عمارت کا چکر اس طرح کاٹتی آتی ہیں جیسے پہاڑوں پر چڑھتے یا اترتے وقت بسیں پہاڑ کے اردگرد چکر کاٹتی آتی ہیں۔ باہر سے دیکھیں تو اونچائی سے سڑک پر دوڑتی بس عمارت کا چکر کاٹتی نیچے چلی آتی ہے تو بہت اچھی لگتی ہے اور دیکھنے والا محظوظ بھی ہوتا ہے کہ ایک عمارت کے اندر بس اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر کیسے جاتی ہے۔

پورٹ اتھارٹی بہت زیادہ وسیع عمارت ہے۔ ہمارے ہاں کے ایئرپورٹ بھی اتنے بڑے نہیں ہوتے۔ انتہائی خوبصورت اور صاف وشفاف یہ عمارت ہر وقت مسافروں سے بھری ہوتی ہے۔ رش ہوتا ہے رونق ہوتی ہے۔ اس کے کئی حصے ہیں۔ ہر حصے میں آپ کو بیشمار لوگ آتے جاتے دکھائی دیں گے۔ اس کے پچھلے حصے میں ہماری بس داخل ہوئی تھی اور پھر ہم لوگ اسکلے لیٹر (متحرک زینے) سے اتر کر نیچے آئے تھے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کا پچھلا حصہ پہاڑی علاقہ تھا اور نیویارک کے ایونیو بہت نیچے تھے۔

پورٹ اتھارٹی میں جگہ جگہ سجی ہوئی ہمارے ہاں کی ریڑھیوں کی ٹائپ کی چیزیں تھیں' جن پر ضرورت کی مختلف چیزیں پڑی تھیں۔ کسی پر دستانے اور گرم ٹوپیاں بیچی جارہی تھیں' کسی پر رنگارنگ کھلونے تھے۔ کوئی آرٹی فیشل جیولری سے بھری تھی۔ تھیں تو یہ ریڑھیاں ہی لیکن بہت خوبصورت سائیکلوں کے ٹائروں جیسے پہیے۔ اوپر چھتر پر رنگین پھولدار کپڑا اور جھالریں لٹک رہی تھیں۔ سامان بھی نفاست اور قرینے سے سجا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انسان انہیں دیکھنے کو رک جاتا ہے اور چیز لینا ہو یا نہ' ریڑھی والا آپ سے بڑی شائستگی سے پیش آئے گا۔ مسکرا کر پوچھے گا آپ کچھ خریدنا پسند کریں گے۔

اگر آپ اثبات میں جواب دیں گے تو وہ آپ کو اپنی من پسند چیز دیکھنے چننے اور لینے کی بخوشی آفر کرے گا۔

اور

اگر نہیں کہیں گے تب بھی وہ شائستگی سے آپ کو مسکرا کر دیکھے گا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے اپنے ہاں کے اکتائے بوکھلائے اور تھکے ماندے ریڑھی بان یاد آ گئے۔ اتنی شگفتگی اور ایسی شائستگی ہمارے بہت کم ریڑھی بانوں کے حصے میں آتی ہے۔ ہم ایک بہت کشادہ ہال سے چند سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے' تو ایک جگہ لوگوں کا جمگھٹا دیکھا اور ایک عجیب منظر تھا۔

دور سے تو ہم سمجھے کہ یہاں کوئی جھگڑا وغیرہ ہو گیا ہے۔

لیکن

یہ بات نہ تھی۔

ایک سٹول پر آدمی کھڑا تھا جو سرتاپا سفید پلاسٹر نما چیز سے ڈھکا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا سفید پلاسٹر آف پیرس سے کسی نے مجسمہ بنا کر کھڑا کیا ہوا ہے۔

لیکن

وہ مجسمہ نہیں تھا۔

انسان تھا۔ حرکت کر رہا تھا اور مختلف پوز بنا بنا کر کھڑا ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے زمین پر ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی جس پر ڈالر کے نوٹ پڑے تھے۔ کچھ پانچ اور دس ڈالر کے نوٹ بھی تھے۔

عاطف ہمیں وہاں رک کر حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا: ''یہ امریکہ کا فقیر ہے اور اس کے مانگنے کا یہ طریقہ ہے۔ جو کوئی اسے رک کر دیکھتا ہے چادر پر ڈالر دو پانچ دس ڈالر خیرات کے طور پر پھینک دیتا ہے۔ خاصی رقم جمع ہو جاتی ہے اسے......''

''واہ۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''یہاں بھی فقیر ہوتے ہیں۔'' گڈی نے حیرانگی سے کہا۔

''ہاں پھپھو......'' عاطف جو کئی دنوں سے نیویارک آ رہا تھا اور ان سے واقف ہو چکا تھا ہنس کر بولا: ''لیکن ان کے مانگنے کے انداز مختلف ہیں......''

سعدیہ بولی: ''آپ یہاں بازاروں میں گھومیں پھریں گی تو کئی فقیر ملیں گے۔''

''لیکن ہمارے ہاں کے فقیروں کی طرح کے نہیں۔'' عاطف بولا۔

''ہاں یہ لوگ مانگتے بھی بڑے طریقے سے ہیں......'' سعدیہ بولی۔ ''اس دن ہم بازار میں گھوم رہے تھے تو ایک معزز شکل کے بڑی عمر کے مرد نے جو پرانے صحیح لیکن ٹھیک ٹھاک کپڑے پہنے ہوئے تھا' نہ تو پاؤں سے ننگا تھا' نہ اس سردی میں اوورکوٹ پہننا بھولا تھا' ہم گزرے تو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا الٹا ہیٹ ہمارے سامنے کر دیا۔''

''یعنی ہیٹ میں کچھ پیسے ڈال دیں۔'' نسیمی نے کہا۔

''ہاں۔''

''تو پھر ڈالے آپ نے؟''

''ہاں عاطف نے اس کے ہیٹ کے ڈالروں میں ایک ڈالر کا اضافہ کر دیا۔''

ہم سب ہنس پڑے اور جب نسیمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''چلو ہم نے امریکہ کو پاکستان کا قرض دار تو کر دیا......''

اس بات پر پھر سب ہنس پڑے۔

''ان کے مانگنے کے اور بھی طریقے ہیں۔''

''یعنی۔''

''یعنی یہ کہ کسی فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر گٹار بجائیں گے۔ اور بھونڈی آواز میں گانے گائیں گے۔ زمین پر کپڑا بچھا ہوگا...... لوگ گزرتے ہوئے کچھ نہ کچھ اس کپڑے پر ڈال جائیں گے......''

''ویسے عاطف۔'' میں نے کہا۔ ''اپنے یہاں کے فقیر دیکھو اور ان سے مقابلہ کرو۔ دونوں کام ایک ہی کرتے ہیں۔ لیکن انداز کتنا مختلف!''

''ہاں پھپھو۔ یہ بات تو ہے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے پورٹ اتھارٹی کے کئی حصوں سے ہوتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں اڈے کے دفاتر بھی تھے۔ ٹکٹ گھر بھی تھے۔ یقیناً مختلف علاقوں سے یہاں

بسیں آتی جاتی ہوں گی۔ اس لیے ٹکٹ گھر بھی الگ الگ ہوں گے اور بسوں کے ٹھہرنے اور چلنے کی جگہیں بھی۔

یہاں بیشمار لوگ آ جا رہے تھے۔ سارے گورے امریکی نہ تھے۔ نہ ہی کالے بلکہ یہاں ہر نسل اور ہر جگہ کے لوگ دیکھنے میں آئے تھے۔ گورے چٹے سرخ و سپید بھی کالے سیاہ اور صندلی رنگ کے بھی۔ پیلی رنگت اور کھنچی آنکھوں والے چینی بھی جاپانی بھی ہندوستانی اور پاکستانی۔ پگڑیوں والے سکھ حضرات بھی۔ سنہری رنگت اور سیاہ بالوں والے ہسپانوی بھی۔ یورپ کے ہر ملک کے باشندے۔ اٹلی کے لوگ' یونانی' عربی' افریقی' میرے خیال میں دنیا کے ہر گوشے سے آئے لوگ نیویارک میں بستے ہیں۔ اسی لیے نیویارک کو منی ورلڈ بھی کہا جاتا ہے۔

ہم اب بیرونی خودکار دروازے کی طرف باہر نکلنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ دروازہ ہر لحظہ کھل اور بند ہو رہا تھا۔ اندر آنے والے بھی بیشمار اور باہر جانے والے بھی۔ اک تانتا سا بندھا تھا۔

ہم دروازے سے باہر نکلے اور اینٹوں کے فٹ پاتھ پر آ گئے۔ سامنے سڑک تھی اور سڑک کے دونوں طرف چوڑے برآمدے جن کے پیچھے دکانیں تھیں۔ باہر سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ برآمدوں میں شاپنگ کے لیے دکانوں میں جانے آنے والے لوگ تھے۔ سڑک کے پار والے برآمدوں اور دکانوں میں بھی اسی قسم کا رش تھا۔ دکانوں کے اوپر کئی کئی منزلہ فلیٹ تھے۔ کہیں آٹھ دس منزلہ کہیں پندرہ بیس اور کہیں اس سے بھی زیادہ۔

یہاں بھی مختلف نسلوں اور خطوں کے لوگ دیکھنے کو ملے۔ دو ایک تو شلوار قمیض میں ملبوس مرد بھی نظر آئے۔

''پھپھو۔'' عاطف نے ہم سے کہا۔

''جی۔''

''آپ ان سٹوروں اور دکانوں میں جانا پسند کریں گی یا سیدھے سٹیچو آف لبرٹی چلیں......''

''عاطف۔'' سعدیہ جلدی سے بولی۔ ''سیدھے ادھر ہی جاتے ہیں۔ وہاں آنے جانے اور مجسمہ دیکھنے میں کافی وقت لگے گا۔ جلدی لوٹ آئے تو نیویارک کے یہ بازار بھی سب دیکھ لیں گے......''

''ٹھیک ہے۔'' ہم سب نے کہا۔

نسیمی بولی: ''ہمیں رستہ پتہ چل گیا ہے۔ نیویارک میں گھومنے پھرنے اب ہم خود ہی آ جائیں گے۔''

''تو بس ٹھیک ہے......'' عاطف بولا۔ ''تھوڑا چل کر ہمیں سامنے والے برآمدوں میں جانا پڑے گا یعنی سڑک کراس کرنا پڑے گی۔ ادھر ہی سب وے کا ٹکٹ ملے گا......''

سب وے زیرِ زمین ریلوے کا نظام ہے جو لندن میں بھی اور امریکہ میں بھی...... انسانی عقل کا یہ کارنامہ حیرت انگیز ہے۔

ہم نے سڑک کراس کی اور سامنے والے اس برآمدے میں جا پہنچے جس کے کارنر پر شیشوں والے شاپ نما کمرے میں ٹکٹ گھر تھا۔ شیشے ہی کی دیواروں کے پیچھے کاؤنٹر تھا جس پر دو انتہائی خوبصورت گوری لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک سنہری بھٹے ایسے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی تھی' جو شیشے کی دیوار کے پیچھے اس میں بنی چھوٹی سی کھڑکی سے ٹکٹ دے اور پیسے لے رہی تھی۔ دوسری کے بال قدرے براؤن تھے' اس کی آنکھوں کا رنگ بھی شربتی تھا۔ چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے یہ لڑکیاں ٹکٹ لینے والوں کو تیزی سے نپٹا رہی تھیں۔

عاطف نے آگے بڑھ کر سب کے لیے ٹکٹ خریدے اور ہم سب کو ایک ایک ٹکٹ تھما دیا۔

''اب کدھر جانا ہے۔'' رقیہ نے پوچھا۔

''ادھر......'' عاطف نے ساتھ والے دروازے کی طرف اشارہ کیا جس کے اندر جانے کے لیے ریوالونگ لوہے کے راڈوں سے رکاوٹ بنی تھی۔ یعنی بیک وقت اس میں کئی لوگ نہیں گھس سکتے تھے۔ اس قسم کے دروازے یہاں بھی کئی بنگلوں میں یا مشہور

بلڈنگوں میں بنے ہوئے ہیں' لیکن اس ٹکٹ گھر کے دروازے کے یہ راڈ جب تک ان میں بنے سوراخ میں کائن نہ ڈالا جائے حرکت نہیں کرتے۔ کائن دروازے کے راڈ نما جنگلے کا لاک کھول دیتا ہے۔ آپ اندر جا سکتے ہیں۔

بہرحال ہم سب باری باری اندر گئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں لوگ چل پھر رہے تھے۔ ایک طرف آفس تھا' جس میں چاک و چوبند دو آدمی کھڑے تھے۔ دیوار پر بہت بڑے بورڈ پر معلومات درج تھیں۔ اس ریلوے نے کہاں سے کہاں جانا تھا۔ کون کون سا سٹیشن راستے میں آنا تھا' واپسی کی صورت میں کہاں سے سوار ہونا تھا' یہ سب کچھ اس بورڈ پر لکھا تھا۔ اگر پھر بھی پتہ نہ چلے تو آفس میں کھڑے دونوں آدمی مسافروں کی مدد کے لیے تیار تھے جو بڑی ملائمت سے سارے روٹ کے متعلق بتا دیتے تھے۔ وہ لوگوں کو نقشے بھی فراہم کرتے تھے۔

ہمارے ساتھ عاطف اور سعدیہ تھے جو پہلے بھی کئی بار اس سب وے سے سفر کر چکے تھے۔ اس لیے ہمیں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی عاطف نے ہمیں بتا دیا کہ اگر ہم پھر ادھر اکیلی آئیں تو کوئی پرابلم ہو' ان آدمیوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔

ہم سب عاطف کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ باتیں بھی پوچھ رہے تھے۔ تجسس بھی بڑھا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ ریلوے ٹریک کہاں ہے۔

لیکن ریلوے ٹریک اوپر والے ہال میں تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو زیرِ زمین تھا جس کے لیے ہمیں نیچے جانا تھا۔ ہم ہال کے اس حصے کی طرف گئے جہاں سے نیچے جانے کے لیے متحرک زینہ بھی تھا اور ساتھ ہی بیشمار سیڑھیاں بھی۔ ہم ایسکے لیٹر کے ذریعے نیچے گئے اور پھر ایک ہال سے گزر کر چند سیڑھیاں نیچے اترے۔ اب ہم پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ کافی لوگ گاڑی کے انتظار میں پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ سامنے دو ریلوے لائنز تھیں۔ ایک پر گاڑی دائیں طرف سے آتی اور دوسری سے بائیں طرف سے۔

اس وقت ہم کئی سو گز کی گہرائی میں زمین کے اندر تھے۔ روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ روشنی تو خیر برقی ٹیوبوں اور بلبوں سے تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زمین کی اتنی

گہرائی میں ہوا کہاں سے آ رہی تھی۔ ہم ویسے ہی سانس لے رہے تھے جیسے باہر لیتے ہیں۔ ذرہ بھر گھٹن نہ تھی۔ ہم سب تازہ دم تھے۔

ٹرین کی ٹن ٹن کرتی گھنٹوں کی آواز پر ہم سب نے ادھر دیکھا۔ ٹرین پوری تیز رفتاری سے دور سے آتی دکھائی دی۔ لگتا تھا کہ قریب سے وہ زن سے گزر جائے گی۔

لیکن

پلیٹ فارم پر آتے ہی وہ ایک سیکنڈ میں رک گئی۔ اس کے خودکار دروازے کھل گئے۔ اندر سے لوگ باہر نکلے۔ باہر سے اندر۔ کوئی دھکم پیل نہیں ہوئی۔ ہم آرام سے اندر داخل ہو گئے۔

یہ ٹرین پلیٹ فارم کی سطح پر تھی۔ یعنی دروازے پلیٹ فارم کے ساتھ لگ رہے تھے۔ پاکستان کی ٹرینوں کی طرح دو تین سٹیپ اتر کر پلیٹ فارم پر نہیں آنا پڑتا تھا۔ یہ تو یوں لگا جیسے ایک کمرے کے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلے آئیں۔ سٹیشن پر گاڑی چند سیکنڈ ہی رکتی ہے۔ دروازے چلنے سے پہلے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی رش کی وجہ سے اترنے یا چڑھنے سے رہ جائے تو اسے اگلی ٹرین کا انتظار کرنا پڑتا ہے جو زیادہ دیر بعد نہیں آتی۔ اندر رہ جانے والے کو اگلے سٹیشن سے واپسی کی ٹرین لینا ہوتی ہے۔

مزے کی بات کہ آپ نے ایک بار ٹکٹ خرید لیا ہے اور اندر آ گئے ہیں تو جتنی بار چاہیں گاڑی میں آئیں جائیں اور ٹکٹ نہیں لینا پڑتا۔ ٹکٹ صرف اسی صورت میں لینا پڑتا ہے' جو آپ ریوالونگ دروازے سے باہر نکل جائیں اور دوبارہ اندر آنے کی ضرورت پڑے۔

ہم سب یعنی چاروں پہلی دفعہ سب وے ریلوے میں بیٹھے تھے۔ اس لیے خاصے اکسائیٹڈ تھے۔ ٹرین کی بوگی عام بوگیوں کی طرح تھی۔ چمڑے کی سیٹوں والی۔ کمر کے ساتھ لگنے والے لکڑی کے تختے' بہت سے لوگ سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ بہت سے کھڑے تھے جن کو اگلے ہی سٹیشن پر اترنا تھا' وہ دروازوں کے قریب کھڑے تھے۔ ٹرین میں زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ سوار تھے۔ سٹوڈنٹس بھی تھے اور بعض معزز بھی۔ زیادہ تر کالی

لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ موٹی موٹی گوری ادھیڑ عمر عورتیں بھی۔ ہمیں بیٹھنے کو جگہ مل گئی تھی۔ صرف عاطف کھڑا تھا جس نے اپنی سیٹ ایک معمر آدمی کو دے دی تھی۔

گاڑی گولی کی سی تیزی سے چلنے لگی۔ پلیٹ فارم کا حصہ کچھ دور چھوڑنے پر وہ جیسے کسی سرنگ میں داخل ہو گئی تھی لیکن اگلے اسٹیشن پر رکنے سے پہلے ہی وہ روشن اور ہوادار پلیٹ فارم پر آ گئی تھی اور ایک لمحے ہی میں اس کی رفتار ساکن ہو گئی تھی۔ دروازے کھلے تھے۔ لوگ اترے چڑھے اور دروازے پھر بند ہوتے ہی ٹرین نے گولی کی سی رفتار پکڑ لی۔

پلیٹ فارم عام چھوٹے سٹیشنوں کی طرح تھا۔ ایک دو سائیڈوں پہ کمرے اور درمیان میں باہر نکلنے کو دروازہ۔ یقیناً باہر نکل کر وہاں سے بھی ایسکلیٹر ہی سے اوپر جانا پڑتا ہو گا۔

حیرانگی ہو رہی تھی کہ ہم زمین کے نیچے ٹرین میں بیٹھے تھے۔ اوپر نیویارک کے بازار تھے' سڑکیں تھیں' ٹریفک رواں دواں تھی اور تو اور کئی کئی منزل اونچے فلیٹ تھے۔ اللہ جانے یہ سٹیشن کس طرح بنے ہوں گے۔ کتنی کھدائی ہوئی ہو گی۔ پھر اوپر کی زمین کو انہوں نے کس طرح سہارا دے کر یہ ہال اور پلیٹ فارم بنائے ہوں گے۔ یہ نظام دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ہم نے جس سٹیشن پر اترنا تھا' عاطف نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا۔ ہم احتیاطاً سب اٹھ کھڑی ہوئیں اور دروازے کے نزدیک آ گئیں۔

ٹرین زن سے جاتے جاتے ایک دم ہی رک گئی۔ دروازے کھل گئے اور ہم سب ایک سیکنڈ میں باہر آ گئے۔ پہلی بار تھی نا اس لیے ڈر لگ رہا تھا' کہیں آدھے لوگ اندر نہ رہ جائیں۔

بہر حال

ہم لوگ پلیٹ فارم سے باہر نکلے۔ سیڑھیاں چڑھے اور مخصوص راستے سے ہوتے ہوئے باہر آ گئے۔

عاطف ہمیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا: ''اب آپ کو بھی اکیلے آنا پڑے تو

آ سکتی ہیں۔"

"کیوں نہیں۔" نسیمی نے سینہ تان کر کہا۔

"لیکن سب وے کا ایک ہی راستہ نہیں' مختلف جگہوں سے ٹکٹ گھروں سے ٹکٹ لے کر جا سکتے ہیں۔ یوں سمجھیں زمین کے نیچے کسی حد تک ٹرینوں کا جال بچھا ہے...... آج ہم سٹیچو آف لبرٹی جا رہے ہیں اس لیے اس طرف سے آئے ہیں......"

"یعنی اور جگہوں پر بھی ایسے ہی ریلوے اسٹیشن ہیں۔"

"بالکل۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے باہر نکل آئے...... ہم ایک بہت ہی خوبصورت سرسبز اور شاداب علاقے میں آ گئے تھے۔ یہ بیٹری پارک تھا جو ایک وسیع و عریض سیر گاہ بھی ہے۔ یہاں سے دور سمندری جزیرے پر کھڑا مجسمہ آزادی نظر آتا ہے۔ چونکہ یہاں سے وہاں جانے میں سمندر حائل ہے۔ اس لیے بذریعہ بڑی کشتی جسے فیری کہا جاتا ہے' وہاں پہنچتے ہیں۔ یہاں لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ کچھ مجسمہ آزادی دیکھنے جانے والے کچھ وہاں سے آنے والے۔

ہم سب چلتے چلتے اس طرف بڑھنے لگے جہاں سے فیری چلتی تھی۔ فیری کے لیے بھی ٹکٹ عاطف نے خریدے۔ ساٹھ سال سے زیادہ عمر والوں کے لیے ٹکٹ میں خاصی رعایت تھی۔ اس لیے مجھے یہ رعایت ملی۔

اس دن بلا کی سردی تھی۔ ہلکی ہلکی برفانی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ موٹے کوٹ' دستانے' ٹوپیاں' شالیں' مفلر لپیٹنے کے باوجود بھی دانت بجنے لگے تھے۔ انڈر گارمنٹس کے باوجود شلواروں میں ٹانگیں سن ہوئی جا رہی تھیں۔

ہم بحرِ اوقیانوس کے ساحل پر کھڑے تھے۔ فیری آ چکی تھی۔ لوگ از خود قطار میں لگ گئے تھے۔ فیری کو چھوٹا سا بحری جہاز کہہ لیں یا بڑی سی کشتی۔ دو منزلہ تھی' تیسری منزل ڈیک تھا۔ لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں ڈیک پر ہی جگہ ملے تا کہ وہ ایک طرف ٹھاٹھیں مارتا غراتا لہراتا بحرِ اوقیانوس دیکھ سکیں اور دوسری طرف نیویارک کی اونچی اونچی پُرشکوہ

عمارتیں بھی دیکھ سکیں۔ مین ہٹن کا ایک حصہ بھی یہاں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نظارہ بڑا دلفریب ہوتا ہے۔

ہم باری آنے پر کنارے پر گیلے اور پانی سے بھرے حصوں پر موٹی موٹی لکڑی کی گیلیوں پر ڈرتے ڈرتے قدم رکھتے فیری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں ایک تختے پر سے گزر کر اس میں داخل ہونا تھا۔

عاطف اور سعدیہ تو اس بلا کی سردی میں بھی ڈیک پر چڑھ گئے۔

لیکن

ہم چاروں کو فیری کی اوپر والی منزل میں جگہ ملی۔ بہت سے لوگ نچلی منزل میں چلے گئے۔ ہمیں بیٹھنے کو تو جگہ مل گئی تھی لیکن ہم نے شیشے کی کھلی کھڑکیوں سے باہر کا نظارہ لینے کو ترجیح دی۔

فیری چل پڑی۔ اٹلانٹک اوشن کے نیلے پانیوں پر بہتے ہم جزیرہ ایلس کی طرف رواں تھے۔ فیری میں یہ بیس پچیس منٹ کا راستہ ہے۔

ہم محوِ نظارہ تھے کہ عاطف نیچے آ گیا۔ اس کے بالوں پر برف کی ہلکی ہلکی پھوار پڑی تھی۔ کندھوں پر بھی پھوار کی سفیدی تھی۔

"چلیں اوپر۔" وہ بولا۔

"کیوں؟"

"تصویریں کھنچوا لیں یادگار رہے گی۔"

"لیکن اوپر اتنی سردی ہے۔"

"اوہ کچھ نہیں ہوتا آئیں جلدی سے۔"

ہم چاروں اس کے پیچھے چند سیڑھیاں چڑھ کر ڈیک پر آ گئے۔ سردی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ بلا کی سردی تھی۔ اس پر برف کی پھوار...... لیکن اس کے باوجود ڈیک پر لطف آ گیا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی اور اس پر بہتی فیری۔ دور سے ایک اور فیری بھی دکھائی دی۔ شاید ہر گھنٹے بعد فیریز مجسمہ آزادی کے دیدار کے

شائقین کو لے کر آ جا رہی تھیں۔

عاطف نے ایک نوجوان امریکی سے درخواست کی کہ وہ ہمارا گروپ فوٹو لے لے۔ نوجوان نے بڑے خلوص سے کہا: ''ضرور' ضرور'' اور عاطف سے کیمرہ لے لیا۔ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ نوجوان نے ہماری دو فوٹو کھینچیں۔

''شکریہ۔'' عاطف نے نوجوان سے کیمرہ لیتے ہوئے کہا۔

ہم کچھ دیر اوپر رکے' لیکن بلا کی سردی کو سہارنا کم از کم میرے لیے مشکل تھا۔ اوپر رش بھی بہت تھا۔

اس لیے

ہم چاروں نیچے آ گئیں۔

اب

ہمارے والی کھڑکی میں ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی کھڑے تھے جو باہر کا نظارہ کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے دیدار میں مصروف تھے۔ سن رکھا تھا کہ امریکہ میں لڑکے لڑکیاں سرعام عشق و محبت کی عملی تصویر بنے ہوتے ہیں نہ ارد گرد کی خبر نہ لوگوں کا ہوش۔ بانہوں میں بانہیں ڈالے بوس و کنار میں مصروف ہوتے ہیں' اتنے دنوں تو ایسا دیکھنے میں نہیں آیا لیکن آج یہ بھی دیکھ لیا۔

وہ دونوں بمشکل سترہ اٹھارہ سال کے ہوں گے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر لگ رہے تھے۔ باتیں کم اور چوما چاٹی زیادہ تھی۔ ہم چاروں کو یہ انتہائی بدتمیزی اور بری بات لگ رہی تھی لیکن اور لوگ جیسے اس معاملے کو لفٹ ہی نہ دے رہے تھے۔ نہ ان کی طرف متوجہ تھے...... نہ ہی کوئی ریمارکس دے رہے تھے۔ شاید یہ ان کے لیے معمولی معاملہ تھا۔

کشتی کنارے پر لگی تو سب لوگ اپنی سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی اپنی باری پر فیری کے دروازے سے باہر نکلنے لگے۔ ڈیک والے بھی نیچے اتر آئے تھے اور نچلی منزل والے بھی اوپر آ گئے تھے۔

فیری کو خالی ہوتے کافی وقت لگ گیا۔

سٹیچو آف لبرٹی جزیرہ ایلس سے ملحق جزیرہ آزادی جسے پہلے جزیرہ بیڈلوئس کہا جاتا تھا نیویارک کی بندرگاہ میں واقع ہے۔ ہم فیری سے اتر کر اب اس جزیرے کی سرزمین پر قدم رکھ چکے تھے۔ مجسمہ آزادی جسے امریکی عام طور پر ''دی لیڈی'' کہتے ہیں اور ہم چاروں نے اسے آنٹی کہنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔

میدان میں لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ اتنی سردی کے باوجود یہ مجسمہ دیکھنے کو آ رہے تھے۔

ہم گیارہ بجے کے قریب یہاں پہنچ چکے تھے۔ کافی آگے تک چل کر جانا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس پیڈسٹل کی طرف جاتے' جس پر مجسمہ ایستادہ تھا' دائیں ہاتھ ہمیں ریسٹورنٹ کی عمارت نظر آئی۔ ہم نے سوچا یہاں کچھ دیر کے لیے چل کر بیٹھتے ہیں' گرما گرم چائے یا کافی پیتے ہیں۔ ساتھ کچھ کھا بھی لیں گے تاکہ تازہ دم ہو جائیں۔ سنٹرلی ہیٹڈ ریسٹورنٹ میں جسم بھی گرم ہو جائیں گے اور ہاتھ پاؤں جو یخ ہو گئے تھے' ٹھیک ہو جائیں گے۔

ہم سب ریسٹورنٹ میں گئے۔

یہ ایک بڑا ہال تھا جس میں بیٹھنے کے لیے گدے دار بنچ اور کرسیاں میز پڑے تھے۔ بہت سے لوگ گپ شپ لگاتے ہوئے چائے یا کافی پی رہے تھے۔ بچے ادھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ایک پوری دیوار شیشے کی تھی جس کے پار سے سمندر نظر آ رہا تھا اور بل کھا کھا کر اٹھتی شوریدہ سر لہریں بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ حد نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ آسمان کہاں ختم ہوتا ہے اور سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ بالکل پتہ نہ چل رہا تھا۔ لگتا تھا آسمان یا تو پانی میں ڈوب گیا ہے یا سمندر آسمان تک جا پہنچا ہے۔ دور سینۂ سمندر پر ایک فیری نیویارک کی طرف جا رہی تھی۔

ہال کے بیچوں بیچ دیوار سے لگا ایک کیبن تھا' جس کے تینوں طرف کاؤنٹروں سے اوپر چھت تک شیشے لگے تھے۔ تینوں طرف چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں جن میں سے اندر کھڑی چاک و چوبند حسینائیں لوگوں سے آرڈر لے رہی تھیں اور منٹوں میں انہیں

مطلوبہ چیزیں دے رہی تھیں۔ ٹرے وہ کھڑکی سے لوگوں کو تھما دیتیں اور پیسے وصول کرلیتیں۔ وہ خوبصورت اور خوش خلق لڑکیاں تھیں۔ میں نے جہاں کہیں بھی خریداری کی' یا ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا' اکثر وہاں لڑکیاں ہی کام کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے ہشاش بشاش ہوتے اور خوش آمدیدی مسکراہٹ رقصاں ہوتی۔ میں نے کسی لڑکی خاتون یا مرد کو ایسی جگہوں میں متین اور بے طرح سنجیدہ مشینی انداز میں کام کرتے نہیں دیکھا۔

یہاں میں اور نسیمی کھڑکیوں پر گئے۔ دوسری طرف عاطف اور سعدیہ پہنچے۔ ہم نے گرما گرم کافی اور ساتھ کھانے کے لیے برگر قسم کے پیکٹ لیے۔ اور چیزیں بھی تھیں لیکن ایگ اور چکن برگر صرف اس لیے خریدے کہ کہیں سؤر کی چربی سے چیزیں تیار نہ ہوئی ہوں...... ویسے ہر چیز پر اجزاء لکھے ہوتے ہیں۔ غلطی سے کوئی ایسی چیز اٹھالے تو اٹھالے' پڑھ کر یا سیل گرل سے کہہ کر چیز لیں تو پھر غلط نہیں ہوسکتی۔

امریکہ میں فروزن مرغی تو عام ملتی ہے۔ ان میں اسلامی ممالک سے حلال شدہ مرغیاں بھی امپورٹ کی جاتی ہیں۔ مسلم لوگ ایسی فروزن مرغیاں ہی لیتے ہیں یا ان سے بنی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔

خیر

ہم چاروں ایک گول ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔ عاطف اور سعدیہ شیشے کی دیوار کے قریب چلے گئے۔

برگر کھانے اور کافی پینے سے جسم میں گرمائی اور توانائی آگئی۔ ہم نے ایک ایک گلاس اور کافی کا پیا۔ کچھ دیر بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور ریسٹورنٹ میں آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتے رہے۔

پھر

عاطف اور سعدیہ ہماری طرف آگئے۔ "ابھی اور یہاں بیٹھیں گی' یا چلیں۔"

"چلو۔" ہم نے کہا اور پھر ٹرے میں ڈسپوزیبل گلاس اور پلیٹیں...... کاغذی نیپکن رکھ کر اٹھائے اور کوڑا دان میں پھینک کر ٹرے اس کے اوپر رکھ دی۔

اب ہم "دی لیڈی" کو دیکھنے کے لیے چاک و چوبند ہو کر جارہے تھے' جسے بہت دور سے فیری میں سے دیکھا تھا۔

ہم باہر نکلے......

باہر ہوا چل رہی تھی جو بھیگی بھیگی تھی۔ برف کی پھوار شاید اب نہیں پڑ رہی تھی کیونکہ اندر جانے والوں کی ٹوپیاں اور کوٹ سفید برادہ نما برف سے خالی تھے۔

میدان میں اب بھی بہت سے لوگ تھے جو اس میدان کی طرف رواں دواں تھے جس میں پیڈسٹل تھا۔ اس میدان اور اس میدان کے درمیان تاروں سے رکاوٹ بنی تھی۔ ایک طرف سے راستہ دیا گیا تھا' مقصود شاید یہ تھا کہ لوگ ایک دم ہی رش ڈال کر اندر نہ پہنچنے لگیں۔

راستہ جو چھوڑا گیا تھا' اس میں سے ایک ایک دو دو آدمی ہی اندر جارہے تھے۔ باقی جانے والے وہاں تک پہنچتے ہوئے خود ہی قطار میں لگتے جارہے تھے۔ چنانچہ ہم بھی اس ملک کے اصول اپناتے ہوئے قطار میں لگ گئے۔ ایک کی جگہ دو قطاریں بنی تھیں۔ میں نسیمی آگے ہمارے پیچھے گڈی اور رقیہ اور سب سے پیچھے عاطف اور سعدیہ۔ ان کے درمیان دو اور امریکی مرد آگئے تھے۔

قطار جوں کی رفتار سے کھسک رہی تھی۔

دائیں ہاتھ سامنے ہی چبوترہ جس پر مجسمہ نصب تھا' نظر آرہا تھا۔ اندازاً یہ چبوترہ کوئی نو دس فٹ اونچا تھا۔

ہمیں اس راستے سے اگلے میدان میں جاتے ہوئے کافی وقت لگا لیکن اس سے یہ ہوا کہ تباہ کن سردی سے کچھ تھوڑی سی نجات مل گئی کہ سب آپس میں جڑے کھڑے تھے اور سرکتے ہوئے آگے جارہے تھے۔ اب ہم چبوترے کی دیوار تک پہنچ چکے تھے۔ یہاں بھی ایک ہاتھ چبوترے کی دیوار اور دوسری طرف زنجیریں اور تاریں ڈال کر راستہ بند کیا ہوا تھا تاکہ مجسمہ آزادی کے اندر جانے والے لوگ پورے میدان میں نہ پھیل جائیں کیونکہ اس میدان سے مجسمہ دیکھ کر آنے والے باہر جاتے تھے۔

دیوار کے ساتھ لگے لگے ہی قطار آگے بڑھ رہی تھی۔ برفانی ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ ناکوں کی پھنگیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہاتھ دستانوں سمیت کوٹوں کی جیبوں میں ڈالے تھے۔ پھر بھی یخ بستہ تھے۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے کافی ڈگری نیچے تھا' جو ہم جیسے گرم ملک کے رہنے والوں کے لیے خاصا اذیت ناک تھا۔

لیکن

ہم سب ہنستے مسکراتے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔

کبھی کہتے: "ہائے ہائے اتنی سردی میں آنٹی جی کو دیکھنے آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

کبھی گویا ہوتے: "چلو یہ بھی ایک خوشگوار تجربہ ہے۔"

"بس ساتھ ساتھ جڑے کھڑے رہو...... سردی کم لگے گی۔"

"دھیان سے...... صرف ہم ہی نہیں اور لوگ بھی ہیں......" نسیمی نے ہنس کر سب سے کہا۔ تو ہم سب بھی ہنسنے لگے۔

یوں ہی باتیں کرتے ہم انچ انچ آگے کھسک رہے تھے۔ ابھی ہمارے آگے خاصی لمبی قطار تھی۔

لیکن

اپنے روایتی انداز میں سب لوگ حوصلے اور صبر سے آگے بڑھ رہے تھے۔ کسی قسم کی دھکم پیل یا افراتفری نہ تھی۔ کمال تو یہ ہے کہ دوسرے ایسے ملکوں کے لوگ جہاں ایسے اصول وضوابط کو توڑنا بڑا فخر سمجھتے ہیں' گھس گھسا کر آگے نکل جاتے ہیں' وہ بھی اطمینان کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

میں اور نسیمی ساتھ ساتھ تھے۔ ایک کالی عورت اور گورا امریکی تھا جو ہاتھ میں ہاتھ دیئے کبھی ہنستے کبھی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

"یہ شادی شدہ ہیں یا صرف دوست؟" میں نے ہنس کر نسیمی سے کہا۔

"یہاں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لوگ زندگی کو ہر طرح سے انجوائے کرتے ہیں۔" یہ بات کہتے ہوئے نسیمی زنجیروں کے پرلی طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر

اس نے اچانک مجھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ زمین پر بیٹھ گئی اور ہاتھ زنجیر اور تاروں کی باڑ کے دوسری طرف لے جاتے ہوئے زمین سے کوئی چیز اٹھائی۔ اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کیا تھا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ۔" اس نے ایک چمکتا ہوا چنے کے برابر گول سا ٹاپس مجھے دکھایا۔

"سونے کا لگتا ہے۔" میں نے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی کان میں ڈالنے والی پتلی سے ڈنڈی بھی گولڈ ہی کی تھی......"

"سونے ہی کا ہے۔"

"تمہیں کیا پتہ مصنوعی بھی ہو سکتا ہے۔"

"نہیں سونے کا ہے۔ اور بالکل میرے ٹاپس جیسا۔"

"ہاں آپا...... ایسا ہی ایک ٹاپس میرے پاس پڑا ہے۔ دوسرا کہیں گم گیا تھا۔ یہ بالکل ویسا اور اسی جتنا ہے......"

"وہی ہوگا......"

وہ ہنسی۔ "وہ تو گوجرانوالہ میں گم ہوا تھا' کتنی دیر ہو چکی ہے۔"

"ہو سکتا ہے گم نہ ہوا ہو' تمہارے کوٹ میں کبھی کا اٹکا ہوا ہو اور آج یہاں گر گیا ہو......"

وہ اس طرح ہنسی جیسے میں نے انتہائی بے وقوفی کی بات کی ہو......

"آپا...... وہ ٹاپس کوئی سال بھر پہلے گم ہوا تھا' بہت ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا تھا۔"

"اور وہ اب تمہیں ملنے کو امریکہ آ پہنچا...... کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں کپڑوں میں الجھ جاتی ہیں اور اس طرح اچانک مل جاتی ہیں......"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اب رقیہ اور گڈی بھی سر آگے کر کر کے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا چیز ہے؟"

"کہاں سے ملی؟"

"ہمیں بھی تو دکھائیں۔"

"گھر جا کر دکھاؤں گی۔" نسیمی نے جیب میں پڑے چھوٹے سے بٹوے میں اسے ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے دوسرا ناپس بھی میرے زیور کے ڈبے میں پڑا ہو۔"

وہ صائمہ کی شادی کے لیے کچھ زیور چھوٹے سے مخملی ڈبے میں لے کر آئی ہوئی تھی۔

خیر

اس کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اب ہم چبوترے کی اس گولائی تک پہنچ گئے جس کے سامنے والے حصے میں اندر جانے کے لیے دروازہ تھا۔

سٹیچو آف لبرٹی اب ہماری آنکھوں کے بالکل سامنے تھا۔

چبوترے کے اندر جانے کے لیے دروازہ تھا۔ لوگ باری باری اس کے اندر ایک ایک کر کے داخل ہو رہے تھے۔ وہاں انہیں سکیورٹی ڈور سے گزر کر ہال میں جانا ہوتا تھا۔

ہم چاروں بھی باری باری دروازے میں داخل ہوئیں۔ عاطف سعدیہ ہم سے پیچھے تھے۔ ہم تینوں تو آرام سے گزر گئیں۔ آخر میں رقیہ بھابی سکیورٹی ڈور سے گزریں تو ایک دم ہی الارم بج اٹھے۔

ہم سب گھبرا گئیں۔ رقیہ کا رنگ فق ہو گیا۔

سکیورٹی کے عملے کی دو تین باوردی خواتین اور مرد اکٹھے ہو گئے۔ رقیہ کو روک لیا گیا۔

انہوں نے اپنے آلات کی مدد سے رقیہ کی تلاشی لی۔ کچھ ہوتا تو نکلتا...... اب ہم لوگ آگے بڑھے جتنی انگریزی بول سکتے تھے ان سے بولی اور بتایا کہ اس کے پاس کوئی مشکوک چیز نہیں ہے۔

"کم۔" ایک گارڈ عورت ملائمت سے بولی۔ "ہم نے بھی چیک کیا ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ پھر الارم کیوں بج جاتا ہے......"

بہرحال کافی دیر بات ہوتی رہی۔ پھر اس خاتون نے رقیہ کے ہاتھوں میں پڑی چوڑیوں کو سیفٹی وپین سے چھوا ٹوں ٹوں کی آواز آنے لگی۔

اُف

تب ہم سب کی جان میں جان آئی۔ چوڑیوں میں غالباً کھوٹ کی ملاوٹ تھی۔

بہرحال جو کچھ بھی تھا وہ لوگ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے رقیہ کو چوڑیاں اتروا کر سکیورٹی گیٹ سے گزارا۔ اب الارم نہیں بجا۔

ہم نے رقیہ کے اس طرح "بری" ہو کر اندر آ جانے سے اسے پیار کیا۔ عاطف اور سعدیہ بھی آ گئے...... کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ چوڑیوں میں کھوٹ ہو بھی تو کیا یہ الارم گیٹ اتنا زیادہ حساس ہے۔

اب ہم پیڈسٹل کے ہال میں تھے۔ جس میں اور بھی کافی لوگ جمع ہو کر ایلی ویٹر میں باری آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

اس ہال کے بیچوں بیچ ایک تین چار فٹ اونچا تھڑا تھا۔ اس پر ایک بہت بڑا چراغ روشن تھا جس کی چمنی شیشے کی تھی۔ اس روشن چراغ کی غرض و غایت کیا تھی۔ ہم معلوم نہ کر سکے۔

اس ہال کے اوپر یعنی پیڈسٹل پر سٹیچو آف لبرٹی بڑی تمکنت اور شان سے کھڑا تھا۔ ہال کے ایک کونے سے ایلی ویٹر لوگوں کو اوپر لے جا رہا تھا اور نیچے لا رہا تھا دوسری طرف تنگ سی سیڑھیاں تھیں جو مجسمے کی اندرونی سطح کے ساتھ ساتھ اوپر جا رہی تھیں۔ شوقین اور مہم جو لوگ ان سیڑھیوں کے ذریعے مجسمے کے سر تک پہنچتے تھے۔ برقی زینہ بھی لوگوں کو وہاں تک لے جاتا تھا۔ وہاں تک جانے کا مقصد یہ تھا کہ مجسمے کی آنکھوں سے باہر کا نظارہ کیا جائے۔

یہ مجسمہ ایک عورت کا ہے۔ اسے شروع میں دنیا کی آزادی کی روشنی کا مجسمہ پکارا جاتا تھا۔ 1924ء میں جزیرہ ایلس بیڈلوئس اور مجسمہ آزادی کو قومی یادگار بنا دیا گیا تھا۔ آزادی کا سمبل یہ مجسمہ بڑی تمکنت اور وقار سے سوا صدی سے پیڈسٹل پر کھڑا ہے۔ اس کا

لباس لہراتے چغے اور چادروں سے مشابہ ہے۔ اس کے سر پر تاج ہے۔ دائیں ہاتھ میں
مشعل ہے اور بائیں ہاتھ میں کتاب جس پر 4 جولائی 1776 لکھا ہے۔ ٹوٹی ہوئی زنجیریں
اس بات کی علامت ہیں کہ ظلم اور جھوٹ کو روند ڈالا گیا ہے۔ یہ زنجیریں مجسمے کے پاؤں میں
پڑی ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا مجسمہ ہے۔ یہ لوہے کے فریم ورک پر تانبے کی شیٹس سے
بنا تھا لیکن سو اصدی سے سمندری ہواؤں اور برفانی پھواروں سے تانبے کی رنگت مٹ چکی
ہے اور یہ اب پورے کا پورا زنگالی رنگ کا ہو چکا ہے۔

اس مجسمے کی اونچائی نچلے پیڈسٹل سے لے کر اوپر تارچ تک تقریباً 306 فٹ
ہے لیکن مجسمے کی بذات خود پاؤں سے لے کر سر کی چوٹی تک اونچائی 152 فٹ 2 انچ
ہے۔

دایاں بازو 42 فٹ لمبا ہے۔

ہاتھ کی لمبائی 16 فٹ 5 انچ ہے۔

گردن سے لے کر سر تک یہ 28 فٹ ہے۔

چہرہ ایک کان سے دوسرے کان تک 10 فٹ چوڑا ہے۔

اور

اس کا کل وزن 254 ٹن ہے۔

یہ مجسمہ فرانسیسی مجسمہ ساز فریڈرک بارتھولڈی نے بنایا تھا۔

یہ مجسمہ اس نے اپنے سٹوڈیو میں اپنی ماں کا بنایا تھا جس کی عظمت کا وہ قائل تھا۔

پھر

اس نے دوبارہ یہی مجسمہ بڑا بنایا جو اس کے سٹوڈیو میں بمشکل کھڑا ہو سکا۔

اس کے بعد اس نے یہ مجسمہ اپنے سٹوڈیو سے باہر بنایا۔ اتنا بڑا مجسمہ بنانے میں
اس کی لوگوں کے علاوہ حکومت فرانس نے بھی مدد کی۔

اور

پھر

اس مجسمہ ساز کی خوشی اور فخر کی انتہا نہ رہی جب حکومت فرانس نے یہ مجسمہ امریکہ
کی آزادی کی یادگار بنانے کے لیے اسے امریکہ کو گفٹ کرنے کی پیشکش کی۔

چنانچہ مجسمے کو مختلف حصوں میں الگ کیا گیا اور اسے 314 کریٹوں میں پیک
کر کے سمندری جہازوں سے امریکہ پہنچایا گیا۔

اس کو ایستادہ کرنے کے لیے پہلے سے پیڈسٹل بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں
لیکن فنڈز کی کمی کی وجہ سے چبوترہ جلدی مکمل نہ ہو سکا۔ پھر دوبارہ فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع
ہوئی اور بہت اونچا اور بہت بڑا پیڈسٹل مجسمہ آزادی کے لیے جو 28 اکتوبر 1886ء میں
جزیرہ بیڈلوئس پر اتارا گیا تھا بنایا گیا۔

شروع میں تو یہ بین الاقوامی دوستی کا نشان تھا لیکن پھر یہ پوری دنیا کی آزادی کا
سمبل بن گیا۔

کہتے ہیں جب فریڈرک مجسمہ ایستادہ ہو جانے کے بعد اس کے ہاتھ میں فرانس
کا پرچم فٹ کر رہا تھا تو نیچے جو ہزاروں لوگ کھڑے خوشی سے نعرہ بازی کر رہے تھے ایک نو
دس سالہ بچے نے سفید رومال لہرا کر فریڈرک سے استدعا کی کہ جھنڈا اتار دیا جائے اور اس
مجسمے کو آزادی کا مجسمہ قرار دیا جائے۔

چنانچہ

اس نے ایسا ہی کیا۔

اور مجسمے کے ہاتھ میں وہ تارچ پکڑا دی جس کی روشنی اب بھی جگمگا رہی ہے اور
رات کو میلوں دور سے نظر آتی ہے۔

مجسمے کا قطر اندر سے اتنا بڑا ہے کہ اس میں ایک طرف لفٹ اوپر نیچے جاتی
آتی ہے۔

اور

دوسری طرف سیڑھیاں اوپر جا رہی ہیں۔

ہم چاروں لفٹ کے ذریعے اوپر گئیں۔ عاطف اور سعد یہ سیڑھیوں سے......

ہم تو درمیان ہی میں جہاں ایلی ویٹر رکتا تھا' اس سے اتر گئے۔ یہاں ایک دروازہ تھا جس کے ذریعے مجسمے سے باہر آ سکتے تھے۔

اس سے آگے سر تک جانے کے لیے برقی سیڑھیاں تھیں لیکن ہم یہاں ہی اتر گئے اور باہر نکل کر مجسمے کے ارد گرد بنے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتے اس کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔ ہم نے یہیں سے مجسمے کا چہرہ' آنکھیں' تاج' ٹارچ اور کتاب دیکھی۔ ہاں جنگلے کے ساتھ ساتھ پھرتے ہوئے ہم نے سمندر کا نظارہ کیا۔ جزیرہ ایلس دیکھا اور نیویارک کی اونچی اونچی بلڈنگیں جو یہاں سے چھوٹی چھوٹی نظر آ رہی تھیں دیکھیں......

ہم زیادہ دیر وہاں نہ رک سکے کہ سردی شدید ترین تھی' اس لیے اسی دروازے سے واپس آ گئے......

مجسمے کے اندر بھی راستہ بنا ہوا تھا اور ایک طرف خاصا بڑا اسٹور بھی تھا۔ لوگ ادھر جا رہے تھے۔ ہم بھی ادھر چل دیے۔ یہاں سے ہم نے عاطف اور سعدیہ کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ رش کی وجہ سے گھٹن بھی ہو رہی تھی۔ ان کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ ابھی انہوں نے کئی فٹ اوپر جانا تھا۔

ہم اس سٹور میں گھس گئے۔

یہاں مجسمہ آف لبرٹی کے متعلق کافی رسائل اور کتابچے پڑے تھے۔ خریدنے کے لیے بھی اور پمفلٹ قسم کا لٹریچر فری بھی۔ اس کے علاوہ یہاں سیاحوں کے لیے چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزوں کے علاوہ مجسمے کے سووینئر پڑے تھے جنہیں سیاح یادگار کے طور پر خرید رہے تھے۔ بیشمار چھوٹے بڑے رنگا رنگ مجسمے بھی تھے۔ کپ جن پر مجسمے کی تصویریں بنی تھیں...... مگ بھی تصویروں والے تھے۔ اس کے علاوہ کیلنڈر نما تصویریں بھی تھیں جن میں "آ نٹی آزادی" کو دکھایا گیا تھا......

بڑے ربڑ اور پتھر کے مجسمے تو خاصے مہنگے تھے۔ ہم نے چھوٹے چھوٹے مجسمے یادگار کے طور پر خرید لیے۔

ویسے ہم کچھ دیر سٹور کی چیزیں دیکھتے رہے' لٹریچر پڑھتے رہے......

پھر

اسی ایلی ویٹر سے واپس پیڈسٹل کے ہال میں آ گئے۔ وہاں سے باہر نکلے اب بھی لوگوں کی قطار لگی تھی۔ مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ آگے کھسک رہا تھا۔

واپسی کا راستہ سامنے والے میدان سے تھا۔ سو ہم بھی ادھر سے ہو کر اس میدان میں آ گئے جہاں ریسٹورنٹ تھے۔

بھوک سخت لگ رہی تھی۔ سردی نے بھی باہر نکلتے ہی کپکپاہٹیں طاری کر دی تھیں۔ اس لیے ہم گرم ریسٹورنٹ میں گرم ہونے اور جسموں کو توانائی دینے کے لیے جا بیٹھے۔

ویسے بھی عاطف اور سعدیہ کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

ہم بڑے آرام سے بیٹھ گئے اور اپنی اپنی پسند کی چیزیں اور چائے کافی لا کر کھانے پینے اور باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

یہاں بھی کافی لوگ تھے۔

کافی دیر بعد عاطف اور سعدیہ بھی آ گئے۔ آتے ہی بولے: "آپ اوپر تک کیوں نہیں گئیں۔ برقی زینہ اوپر تک جاتا ہے......"

"بس نا...... آنٹی کو دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ لفٹ سے اتر کر باہر جنگلے تک گئے۔ پھر چاروں طرف گھوم پھر کر سب طرف کا نظارہ کر لیا۔ اندر سٹور میں بھی گئے۔ سووینئر بھی خریدے۔"

"ہائے پھپھو۔" سعدیہ بولی۔ "ہم نے تو لیڈی کی آنکھوں میں سے باہر کا نظارہ کیا ہے۔ حبس تو وہاں بہت ہو گیا تھا' لوگ اس کی کھوپڑی میں کافی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ لیکن لطف بہت آیا' بڑے مزے کا تجربہ تھا......"

"چلو خیر...... اب چائے یا کافی پی لو...... کچھ کھانا ہے تو کھا بھی لو...... پھر واپس

چلتے ہیں۔'' چار بج چکے تھے...... سورج تو پہلے ہی کم کم نظر آتا تھا اب دھندی چھانے لگی
تھی۔ سردیوں کی شام اور وہ بھی اٹلانٹک اوشن کے کنارے کی شام دھندلی دھندلی ہونے
لگی تھی۔

''وقت تو کچھ زیادہ نہیں ہوا۔'' عاطف نے گھڑی دیکھی۔

''یہاں سے نکلتے نکلتے کافی سے زیادہ ہو جائے گا۔ ہم لوگوں نے نیویارک نہیں
نیوجرسی واپس پہنچنا ہے......'' نسیمی نے کہا۔

''ٹھیک۔'' وہ دونوں اٹھ کر کیبن کی طرف گئے اور اپنے لیے کھانے پینے کی
چیزیں لے آئے۔

وہاں ایک طرف ٹوائلٹ بھی بنے ہوئے تھے۔ ہم چاروں اٹھ کر ادھر چلی گئیں۔
اتنے رش والے ریسٹورنٹ میں خیال نہیں تھا کہ ٹوائلٹ صاف ملیں گے۔

لیکن

کمال کی بات...... ٹوائلٹ اتنے صاف وشفاف تھے اور یوں چمک رہے تھے
جیسے کبھی استعمال ہی نہ ہوئے ہوں۔ ٹشو پیپر کے سیٹ کورز ایک طرف لٹک رہے تھے۔ رول
دوسری طرف۔ ہاتھ دھونے کے لیے بیسن تھے اور آٹومیٹک ٹیگ جن کو دبانے سے لیکوڈ
سوپ نکل آتا تھا۔ اوپر ہوا سے ہاتھ سکھانے والی مشین۔ کیا انتظام تھا۔

ہم سب ریسٹورنٹ سے جب نکلے تو سردی شدید ترین صورت اختیار کر چکی تھی۔
اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹ کر ہم میدان میں ساتھ ساتھ لگ کر چلنے لگے۔

''یہاں تو رگوں میں خون جم رہا تھا۔'' ہم میں سے کسی نے کہا۔

''واقعی......''

''اب جلدی سے فیری آ جائے تو اچھا ہے۔''

''وہاں تک پہنچو تو سہی۔''

''وہ آنے ہی والی ہے۔ کافی لوگ ادھر جا رہے ہیں۔ آپ سب بھی جلدی
کریں تاکہ اسی میں جگہ مل جائے۔'' عاطف نے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد جو کشتی آئے گی وہ آج کی آخری کشتی ہو گی......''

سب نے تیز تیز قدم اٹھانا شروع کیے۔ ہم جلدی لکڑی کی سیلن زدہ گیلیوں اور
تختوں سے بنے پلیٹ فارم تک پہنچ گئے جہاں فیری نے آ کر رکنا تھا۔

فیری آ گئی۔

اور

ہم اپنی اپنی باری سے اس کے اندر داخل ہوئے۔ اب سعدیہ اور عاطف نے بھی
ڈیک پر جانے کی بجائے ہمارے ساتھ درمیانے حصے میں جگہ لی۔ ہم سب کو سیٹیں مل
گئیں......

فیری مسافر لے چکی تو چل پڑی۔ اب شام گہری ہو چکی تھی...... ہم تساہل سے
سیٹوں کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکے تھے۔ اردگرد سمندر کا پانی سیاہ نظر آ رہا تھا۔ چند لمحے
کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سوائے سیاہ پانیوں کے کچھ نظر نہ آیا......

لیکن

چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ نسیمی نے میرا کندھا ہلاتے ہوئے کہا: ''دیکھیں آپا
باہر دیکھیں کتنا خوبصورت منظر ہے۔''

میں شاید آنکھیں موندے پڑی تھی۔ جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور نسیمی کے
کہنے پر باہر دیکھا......

واہ...... کیا نظارہ تھا۔

فیری شاید رخ بدل چکی تھی۔ اس لیے سامنے مین ہیٹن نظر آ رہا تھا۔ نہ تو
عمارتیں نظر آ رہی تھیں نہ ہی اور چیز...... مجھے تو یوں لگ رہا تھا سطح سمندر سے آسمان
تک ایک چوڑی سی دیوار ہے جس میں طاقچے بنے ہوئے ہیں اور ان چھوٹے
چھوٹے طاقچوں میں اجلی اجلی سنہری سنہری نیلی پیلی روشنیاں اجالے پھیلا رہی
ہیں۔ قمقمے ہی قمقمے روشن تھے۔ سمندر کی سطح سے آسمان کی وسعتوں تک ایسا
خوبصورت منظر میں نے زندگی میں آج پہلی بار دیکھا تھا۔ روشنیاں پانی میں بھی

ڈوبتی ابھرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ذرا سوچئے تین اطراف گھپ اندھیرا اور ٹھاٹھیں مارتا کالا سمندر اور ایک طرف روشنیوں' جھلملاتی سنہری روشنیوں کی دیوار......

گو

یہ دیوار نہیں تھی۔ مین ہیٹن کا خوبصورت علاقہ رات میں روشنیوں کی جگمگاہٹیں بکھیر رہا تھا۔

لیکن

فیری سے اندھیرے میں یہی لگتا تھا کہ حدنگاہ تک جھلمل کرتی روشنیوں کی دیوار ہے...... بہت اونچی...... بہت چوڑی۔

میں

جب تک یہ منظر دکھائی دیتا رہا...... باہر ہی دیکھتی رہی...... یہ منظر میں آج بھی تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی ہوں...... لیکن اسے پوری طرح الفاظ کی گرفت میں نہیں لاسکتی......

شاید

اسی لیے

کہ

کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بیان کرنے میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا......

خیر

ہم لوگ ''دی لیڈی'' یعنی مجسمہ آزادی کو دیکھ کر واپس ہوئے۔ فیری نے اسی جگہ اتارا' جہاں سے ہمیں لیا تھا۔ چمن پار کر کے سب وے سٹیشن پر آئے۔ پھر ٹرین کے ذریعے ہی نیویارک کے اس ایونیو میں آ گئے جہاں سے ٹرین کے ٹکٹ خریدے تھے۔ ہم اس ٹرپ کے تاثرات بیان کرتے' تبصرے کرتے پورٹ اتھارٹی پر آئے۔

اور

بس نے ہمیں وینڈی بس سٹاف پر لا اتارا...... جہاں سے ہم نے فون کیا اور گھر سے خالد ہمیں پندرہ منٹ میں لینے آ گیا۔

شمو نے سٹیچو آف لبرٹی نہیں دیکھا ہوا' اس لیے ہم سب بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفیں کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ کوئی بے حد خوبصورت شے نہ تھی لیکن اتنا قد آور اور اتنا گھیر دار مجسمہ دیکھنا بذات خود بڑا اچھا تجربہ تھا۔

--------O-------

اگلا دن ہم نے گھر پہ ہی گزارا۔ عاطف اور سعدیہ فلوریڈا چلے گئے۔ اب ہم چاروں یہاں تھیں۔ شمیم تو ہمارے اٹھ کر نیچے آنے سے پہلے ہی ہوسپٹل جا چکی ہوتی تھی۔ ہم سب بڑے اطمینان سے اپنے کمروں سے برآمد ہوتیں۔ میں اور گڈی اوپر والے درمیانی کمرے میں سوتی تھیں۔ گلی کے پار والا اتنا ہی کمرہ خالد کے پاس تھا۔ شمو اپنے بڑے سے بیڈروم میں۔ رقیہ اور نسیمی لاؤنج کے ساتھ والے نچلے بیڈروم میں ہوتی تھیں۔ صائمہ کا کمرہ خالی پڑا رہتا......

اس دن

ہم نے خوب گپ شپ لگائی۔ پاکستان اپنے اپنے گھروں میں فون کیے۔ خیر خیریت دریافت کی۔

اور پھر رات گئے اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔ نماز عشاء ادا کرنے کے بعد میں اور گڈی بستر میں لیٹ گئے۔ سونے سے پہلے ہم دونوں باتیں ضرور کیا کرتی تھیں۔ آجکل تو ہمارا موضوع امریکہ ہی ہوتا۔

باتیں کرتے کرتے اونگھ آ جاتی۔ کبھی وہ پہلے خراٹے بھرنے لگتی، کبھی میں۔

ہمارا یہ کمرہ اوپر کی منزل پر فرنٹ سائیڈ پر تھا۔ دو کھڑکیاں باہر کھلتی تھیں۔ سردی کے پیش نظر یہ کھڑکیاں بند ہی رہتیں۔ کسی کسی دن گھٹن سی محسوس ہوتی...... تو میں آہستگی سے ایک کا ایک پٹ تھوڑا سا کھول دیتی۔ اس کے آگے چونکہ پتلی ٹرپ والی بلائنڈ پڑی ہوئی لیے گڈی کو پتہ نہ چلتا۔ گڈی کو رات سردی بہت لگتی تھی۔

اس رات گڈی باتیں کرتے کرتے خراٹے لینے لگی۔ میں ابھی سونے کی تیاری ہی کر رہی تھی کہ ایک دم یوں لگا جیسے کوئی پنگ پانگ کا گیند لکڑی کے فرش پر اچھال رہا ہے۔ گیند ٹپ ٹپ کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ جو خاصی تیز تھی۔ پھر یہ آواز آہستہ ہوتی ہوتی ختم ہو گئی......

میں سخت خوفزدہ ہوئی۔ اس کمرے میں گیند سے کون کھیل رہا ہے......؟ میں چونکہ کھڑکی والی سائیڈ پہ تھی، اس لیے لگ رہا تھا کہ میری طرف ہی جو جگہ بیڈ اور کھڑکی کے درمیان چھٹی ہے، کوئی بال لکڑی کے فرش پر پھینک رہا ہے۔ دوبارہ پھر ایسے ہی ہوا جیسے کسی نے بال پھینکا اور پھر بال ٹپے کھاتا کھاتا دور چلا گیا۔ آواز آہستہ ہوئی پھر بند ہو گئی۔

"گڈی۔" میں نے پیشتر اس کے کہ بال تیسری مرتبہ فرش پر ٹپکا لیتا، اسے ہلایا۔

وہ اوں آں کر کے کروٹ بدل کر سو گئی۔

"گڈی......" میں نے اسے زور سے جھنجھوڑا لیکن بالکل دھیمی آواز میں اس کا نام لیا۔

"آئے ہائے کیا ہے آپا......" وہ نیند سے بیدار ہو کر بولی۔

اب پھر بال نے فرش پر ٹپکا لیا۔

"گڈی......" میں نے ہولے سے چہرہ کمفرٹر میں چھپاتے ہوئے کہا۔

"جی۔" وہ اب پوری طرح بیدار ہو گئی۔

"ذرا آواز سنو......"

"کیسی؟"

"پنگ پانگ کے بال کے ٹپکے لینے کی......"

"ہوں۔"

"سنو ناں...... کان دھرو...... آواز دور اور مدھم ہوتی جا رہی ہے۔"

اس نے کمفرٹر سے چہرہ نکالا۔ شاید آواز ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ بولی۔

"آپا...... کیا ہو گیا ہے آپ کو......"

"گڈی پنگ پانگ کے بال سے کوئی ادھر کھیل رہا ہے۔"

"کون؟"

"پتا نہیں...... لیکن کوئی ہے ضرور......"

"آپ کا مطلب ہے...... جناتی کھیل......"

اس نے ابھی یہی لفظ کہے تھے کہ بال نے پھر ٹپکا لیا اور ٹپ ٹپ کرتی آواز قریب سے ہوتے ہوئے بالکل مدھم اور پھر معدوم ہو گئی۔

"ہائے اللہ......" گڈی نے کمفرٹر چہرے پر بھی تان لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "واقعی آپا......"

بال ایک بار پھر زور سے ٹپکا...... اور ٹپ ٹپ کرتا رہا۔ پھر آواز آہستہ ہوئی اور غائب ہو گئی......

"آپا" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ہوں۔"

"یہاں کچھ ہے۔"

"وہ تو میں بھی جان رہی ہوں۔"

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

"تو کیا کریں۔"

"بتی جلائیں۔"

"تم جلاؤ۔"

"میری طرف والے لیمپ کا شاید بلب فیوز ہے۔"

"میری طرف کا جلا دو۔"

"نہ بابا۔"

ہم سرگوشیاں کرتی رہیں لیکن اس دوران بال کا ٹپا نہیں لگا۔

"شاید چلا گیا۔" گڈی نے کافی دیر بعد کہا۔

"کون؟"

"بال کھیلنے والا۔"

"ہاں کچھ دیر سے آواز نہیں آئی۔"

"لیکن...... یہ تھا...... کون......؟"

"ضرور اس کمرے میں کچھ ہے۔"

ہم دونوں ڈری سہمی یہی باتیں کرتی رہیں۔ اور پتا نہیں کب ہماری آنکھ لگ گئی۔ صبح ہم دونوں نماز کے لیے اٹھیں۔

تو

رات والا بال یاد آ گیا۔ ڈر سے ہمیں کپکپی سی آ گئی۔

"بھئی آپا...... میں نے تو کل اس کمرے میں نہیں سونا......"

"تو کہاں سوؤ گی۔"

"شیمو باجی کا کمرہ اتنا جہازی سائز ہے۔ ایک طرف گدے ڈال لیں گے۔"

"چلو ابھی نماز پڑھ کر تو سوئیں......" دن کی ہلکی ہلکی ابھرتی روشنی سے مجھے کچھ تسلی ہو گئی تھی۔

ہم دونوں نماز پڑھ کر سو جایا کرتی تھیں۔ پھر آٹھ ساڑھے آٹھ اٹھا کرتی تھیں۔ جو پہلے اٹھ جاتی' نیچے چلی جاتی اور اپنا ناشتہ بنا کر ناشتہ کر لیتی۔ نسیمی اور رقیہ جلدی اٹھ جایا کرتی تھیں۔ اس لیے ناشتہ کرتے ہوئے ان سے گپ شپ لگنے لگتی۔

"گڈی......" میں نے بستر میں دوبارہ لیٹتے ہوئے کہا۔

"جی۔" وہ جائے نماز سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"اس واقعے کا ذکر شیمو سے کرنا چاہیے......"

"پنگ پانگ کے بال کا......"

"ہاں......"

گڈی چند لمحے چپ رہی۔ پھر بولی۔ "شیمو باجی بیچاری اتنے بڑے گھر میں

اکیلی رہتی رہی ہے...... کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو انہیں پتا نہ ہوتا......"

"وہ اس کمرے میں تھوڑا سوتی ہے......"

"پھر بھی بات کرنا ٹھیک نہیں...... وہ خواہ مخواہ ڈر جائیں گی......"

"چلو ٹھیک ہے...... ویسے آج رات ہم یہاں ہی سوئیں گے۔ دیکھیں گے آج بھی کچھ ہوتا ہے یا نہیں......"

گڈی چپ ہو گئی۔

ہم نے اس بال ٹپکنے کی بات اس دن کسی سے نہیں کی۔

دوسری رات

ہم دونوں ساتھ جڑ کر سوئیں...... کمفرٹر بھی اچھی طرح لپیٹ لیا۔ کافی دیر جاگتی رہیں۔

لیکن

بال کے ٹپا کھانے کی آواز نہیں آئی۔ ہمارا کچھ حوصلہ بندھا۔ "پتا نہیں کیسی آواز تھی۔ ہو سکتا ہے باہر سے آ رہی ہو......"

"خیر باہر سے تو نہیں آ رہی تھی......" میں نے کہا میں بیڈ کے برابر نیچے لکڑی کے فرش پر بال ٹپا کھاتا تھا...... جو آہستہ آہستہ فٹ بورڈ کی طرف پہنچتے پہنچتے ٹپے کی آواز معدوم ہو جاتی تھی......

ہم اس رات کافی دیر جاگتی رہیں لیکن بال نے آج ٹپا نہیں کھایا۔

اگلی رات

ہم نے بتی بجھائی ہی تھی کہ ٹپ سے بال فرش پر گرا اور پھر ٹپا کھاتے کھاتے آواز آہستہ ہوئی اور فٹ بورڈ تک جاتے ختم ہو گئی۔

"گڈی......" میں نے ہولے سے گڈی کو ٹہوکا دیا۔

"جی۔"

"سنی آواز۔"

"ہاں۔"

"ایک دن غائب رہ کر آج پھر وہ آ گیا......"

"آپا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اٹھیں بھاگ کر شیمو باجی کے کمرے میں چلے جاتے ہیں......"

"وہ سو......" میری بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ بال پھر فرش پر پڑا۔

"ہائے گڈی کیا کریں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے سرگوشی کی۔

"اٹھیں نا شیمو باجی کے کمرے میں چلتے ہیں۔"

اب بال کے ٹپ ٹپ کرنے کی آواز ختم ہو چکی تھی۔

ہم نے کچھ حوصلہ کیا...... میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنی سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ آن کر دیا۔ کتنی ہی دیر ہم نے روشنی کے باوجود چہرے کمفرٹر کے اندر سے نہ نکالے۔

لیکن

جوں ہی گڈی بستر میں اٹھ کر بیٹھی اور میں نے چہرہ کمفرٹر سے باہر نکالا گڈی جھٹ سے بولی: "کوئی بھی نہیں آپا...... کوئی بھی نہیں کمرے میں...... دیکھ لیں نا...... کوئی......" لیکن اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بال کے ٹپکے کی آواز آئی۔

"اوئی اللہ......" گڈی بستر میں گھس گئی۔ میں نے بھی چہرہ اندر چھپا لیا۔ بال اسی طرح ٹپکا اور پھر ٹپے لیتے ہوئے آواز مدھم ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔

"آپا۔" گڈی منمنائی۔

"ہوں۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"مجھے بھی۔"

"چلیں...... باجی کے کمرے میں چلتے ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ میں تو بستر سے نہیں نکلوں گی۔"

"لیکن......"

گڈی کی بات ادھوری رہ گئی۔ بال نے پھر ٹپکا لیا۔ اس دفعہ قدرے زوردار، جس سے ہم دونوں سہم گئیں۔

ڈر تو لگ رہا تھا لیکن مجھے اپنے آپ پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ عمر کے پچھتر برس گزار کر بھی اس بات سے ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی جن بھوت ہمارے کمرے میں پلنگ پائنگ کے بال سے کھیل رہا ہے۔

"اس میں ڈرنے کی کیا بات!" میں نے اپنی ہمت آپ ہی بندھائی۔ لیمپ روشن تھا۔ اندھیرے میں ڈر کا خوف کئی گناہ ہو جاتا ہے لیکن روشنی ہمت بندھاتی ہے۔ میں نے کمفرٹر اپنے اوپر سے آہستہ سے ہٹایا۔

"کیا کر رہی ہیں آپا......" گڈی نے بستر میں دبکے دبکے پوچھا۔

"بستر سے نکلنے لگی ہوں۔"

"کیوں......؟"

"ذرا دیکھوں تو یہ بال آتا کہاں سے ہے۔ ٹپے کون لگاتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے......"

گڈی حیرت زدہ ہوئی۔ بولی: "آپا لیٹ جائیں......"

"نہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اور

بستر میں بیٹھ گئی۔ کتنی ہی دیر بیٹھی رہی۔ بال کے ٹپکنے کا انتظار کرتی رہی۔ کوئی آواز نہ آئی۔ میں نے ہمت کی۔ اٹھ کر بیڈ کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ پھر کمرے کی وارڈروب کا دروازہ کھولا۔ دیوار کے ساتھ لگے بڑے بڑے آئینوں والے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی رہی۔

"کچھ نہیں ہے گڈی۔" میں نے بستر پر آتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ بال۔ ٹپ ٹپ۔ آواز آہستہ آہستہ مدھم اور پھر غائب۔"

"ہو سکتا ہے یہ ہمارا وہم ہو...... چلو اللہ کا نام لو...... آیت الکرسی پڑھ کر چاروں

طرف پھونکو اور سو جاؤ۔ میں بھی دعائیہ آیات پڑھتی ہوں۔"

میں نے لیمپ بند کیا...... اور بستر میں گھس گئی۔ اب میرے دل میں پہلے جیسا خوف نہیں تھا۔ پکا یقین ہو گیا کہ جو آوازیں سنی تھیں وہ وہم کے سوا کچھ نہ تھیں۔

لیکن

ابھی آنکھیں بند نہ ہوئی تھیں کہ پھر وہی......

بال ٹپکا...... ٹپ ٹپ کرتا دور ہو گیا...... آواز مدھم ہوئی اور پھر معمول کی طرح غائب......

دوسری بار پھر وہی ترتیب دہرائی گئی۔

اور

جب تیسری بار بھی وہی کچھ ہوا تو میں اور گڈی ایک دوسرے میں گھسنے لگیں۔

"آپا...... یہ...... کیا ہے...... آپ کو ڈر نہیں لگ رہا......"

"لگ رہا ہے۔"

"پھر۔"

"پھر کیا کر سکتے ہیں...... صبح دیکھیں گے...... سب کو بتائیں گے...... شمو کو بھی......"

"ھوں۔"

"ہم دونوں کافی دیر جاگتی رہیں۔ سوچتی رہیں لیکن مسئلہ حل ہونا تھا نہ ہوا......

صبح ہم نماز کے بعد زیادہ دیر نہ سوئیں...... نیچے سے نیسی، شمو اور رقیہ کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گڈی کا بیٹا بھی جاگ رہا تھا۔

ہم دونوں نے منہ ہاتھ دھو کر بال سیدھے کیے نیچے آ گئیں۔

"آپا...... آج اوپر کے لوگ کیسے جلدی اٹھ گئے۔" احمد نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"تم لوگوں نے نیچے اتنا شور جو مچا رکھا تھا۔" میں نے کچن ہال میں آتے ہوئے

کہا...... ''گڈی بھی آ گئی۔
''شور مچانے والی بات جو ہو گئی۔'' رقیہ نے کہا۔
''وہ کیا؟ ہمیں بھی بتائیں۔'' میں نے کہا۔'' حالانکہ ہم دونوں انہیں اپنا ہی قصہ سنانے نیچے آئی تھیں۔''
''حیرانی کی بات ہے۔'' شمو بولی۔
''بتائیں بھی بات کیا ہے۔'' گڈی نے کہا۔ تو نسیمی بولی۔'' سٹیچو آف لبرٹی کے میدان میں جو کان کا کوکہ مجھے ملا تھا۔''
''ہاں ہاں۔''
''وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا میرا گم ہوا تھا۔ میرے زیور کے ڈبے میں سے نکل آیا۔''
''تو پھر تمہارے ہی کپڑوں میں کہیں اٹکا ہوا گرا ہوگا۔''
''یہی تو بات ہے کہ یہ کوکہ جو مجھے ملا ہے شکل اور سائز میں بالکل اتنا ہی ہے جتنا یہ پہلے والا......''
اس نے ہتھیلی پر دونوں ٹاپس رکھ دیئے۔ واقعی دونوں ایک جیسے تھے۔ سونے کا رنگ بھی وہی تھا......
اس لیے میں بولی۔ ''پھر یہ تمہارا ہی گرا ہوگا۔''
''نہیں آپا۔'' شمو نے کہا۔'' دونوں کی پچھلی ڈنڈی میں فرق ہے۔''
''میری ڈنڈی اور اس کا شاپر سونے کا ہے...... ڈنڈی پر پیچدار شاپر لگا ہوا ہے جبکہ اس کوکے کی ڈنڈی بالکل پلین ہے۔ یقیناً شاپر پلاسٹک کا ہوگا جو گر گیا ہوگا اور کوکہ کان سے......''
واقعی دونوں کوکے دیکھنے میں بالکل ایک جیسے تھے لیکن پیچھے کی ڈنڈیاں دونوں کی مختلف تھیں۔
حیرانی کی بات ہی تھی۔

یہ قصہ ختم ہوا تو میں نے گڈی سے کہا اب ہم اپنی حیرانی میں ان کو شامل کریں۔
''کیسی حیرانی؟'' تقریباً سبھی نے کہا۔
ہم نے بال کے ٹپا کھانے اور ٹپ ٹپ کرتے دور تک جاتے مدھم ہوتے اور پھر آواز غائب ہو جانے کی بات کی۔
''یہ...... تو......'' شمو کے سوا دونوں ڈر گئیں۔ احمد بھی کچھ متعجب ہوا۔ لیکن شمو یہ بات سن کر اور ان لوگوں کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بولی: ''مجھے اس گھر میں رہتے ہوئے سات سال سے زیادہ ہو چکے ہیں' چار سال تو میں بالکل اکیلی رہی مجھے تو کوئی پنگ پانگ کھیلنے والا نہ ملا...... اور...... اس کمرے میں تو آصف اور آمنہ دو سال سوتے رہے ہیں' انہیں تو کبھی کسی جن سے پالا نہ پڑا......''
بات واقعی سوچنے کی تھی۔
لیکن
ہم کیا کرتے۔
ہم جس تجربے سے گزرے تھے انوکھا ہی تھا۔
اسے کیا کہا جا سکتا تھا۔
شمو ہمیں دیکھ دیکھ کر ہنستی رہی۔ پھر اس کی دیکھا دیکھی نسیمی اور رقیہ بھی ہمارا مذاق اڑانے لگیں۔
ہم دونوں ایک دوسری کا منہ تکنے لگیں۔ سب ہمیں جھٹلا رہے تھے۔ احمد بھی ہمارا مذاق اڑانے لگا۔
''شمو خالہ کو اتنے سالوں میں پنگ پانگ کھیلنے والا نظر نہ آیا۔ آپ کے پاس وہ چند دنوں میں ہی آ پہنچا......''
''ان کے ساتھ ہی آیا ہوگا۔'' شمو کی کھنکتی ہنسی گونجی۔
''کچھ بھی ہو میں تو آج رات اس کمرے میں نہیں سوؤں گی......'' گڈی بولی۔
''تو کہاں سوؤ گی۔''

"آپ کے کمرے میں شیمو باجی۔"

"میرے کمرے میں داخلہ بند۔" وہ ہنسی اور پھر ہنسی ہی میں ہماری اتنی سنجیدہ بات اڑا دی گئی۔

اسی دوپہر میں اور گڈی اس کمرے میں باہر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

گڈی بولی۔ "آپا دن کو تو کچھ نہیں ہوتا......"

"شاید ہونے لگے......"

"ہائے خدا نہ کرے۔"

ہم دونوں تیار ہو کر کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ یہ دوسری کھڑکی تھی۔ بیڈ کے قریب دائیں ہاتھ کھڑکی تھی جس کا تھوڑا سا پٹ میں نے کئی دنوں سے کھول رکھا تھا اور اس کے آگے پڑی پتلی پتریوں والی بلائنڈ کی سٹرپ اوپر تلے ہو گئی تھیں......

ہم دونوں کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے کہ اچانک پھر بال ٹپکا اور ٹپ ٹپ کرتا مدھم آواز کو پہنچ گیا اور پھر آواز غائب۔

ہم دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ دن کا وقت تھا اس لیے ڈر نہیں لگا۔

لکڑی کے فرش پر کوئی بال ٹپے نہیں لے رہا تھا۔

دوسری بار

پھر

آواز آئی۔

"اوہ گڈی۔" میں نے جلدی سے ادھر والی کھڑکی کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"کیا آپا؟"

"بال والا مسئلہ حل ہو گیا۔"

"یہ دیکھو۔"

وہ بلائنڈ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا دیکھوں؟"

"گڈی باہر کی کھڑکی کا پٹ تین چار دن ہوئے میں نے ذرا سا کھولا تھا۔

باہر جب ہوا چلتی ہے تو ظاہر ہے اندر بھی آتی ہے جس سے یہ ڈھیلی سی بلائنڈ کے سٹرپ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو لگتا ہے بال ٹپکا...... پھر دوسرے سٹرپ آپس میں رگڑ کھاتے ہیں تو لگتا ہے بال ٹپے کھا رہا ہے اور جب ہوا کا دھچکا ختم ہوتا ہے تو آواز معدوم ہو جاتی ہے......"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا......"

"میں نے ابھی دیکھا......"

گڈی کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ہلکی سی ہوا سے پھر سٹرپ ہلی، دوسری سے رگڑ کھائی اور پھر ڈھیلی سی بلائنڈ کے سٹرپ ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے۔ ہوا کا لرزہ بند ہوا تو آواز بھی بند ہو گئی۔

"ہائے اللہ...... ہم کتنے ڈرے تھے ادھر تو دھیان ہی نہ گیا۔ یہاں سے بلائنڈ کا دھاگہ ٹوٹنے والا ہے۔ ڈھیلا ہو چکا ہے۔"

"ہاں...... رات کی خاموشی میں یہ آواز بالکل پنگ پانگ کے بال کی سی لگتی تھی۔"

شکر۔

کہ ہمارا خوف دور ہو گیا۔

اب ہم پھر دوسری کھڑکی کے سامنے آ گئیں جس کی بلائنڈ ہم نے سمیٹ دی ہوئی تھی اور صاف شفاف شیشوں سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔

سڑک کے پار شمیم کے گھر کے بالکل سامنے اسی گھر کی طرح ایک بہت بڑا گھر تھا۔ یہ بھی شاید کسی ڈاکٹر ہی کا تھا۔

اس گھر کے ایک طرف دیوار کے ساتھ رنگین قنات لگی تھی جو تین طرف سے بند تھی۔ اس سے جو چمن میں احاطہ سا بن گیا تھا' اس میں بچوں کے کھیلنے کے بال' فٹ بال' رنگین جھولا' ایک See Saw...... ایک چھوٹا سا گڑیوں کا گھر ہو جیسے یہ سب بہت کلر فل چیزیں تھیں۔

"دیکھو نا...... بچوں کے لیے کتنی خوبصورت جگہ اور کھیلنے کے لیے کتنے رنگین بال

جھولے See Saw...... سلائیڈیں بنی ہوئی ہیں......''

''لیکن میں نے یہاں کسی بچے کو تو کبھی دیکھا نہیں۔ اکثر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتی ہوں۔'' ہم یہ باتیں کر رہی تھیں کہ شمیم اندر آ گئی۔

ہنس کر بولی۔ ''پینگ پانگ والے کا سراغ ملا۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

اور پھر گڈی نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ''چلو تمہارا وہم تو دور ہوا...... لیکن یہ بلائنڈ! تم لوگوں ہی نے کھینچی ہوگی...... یہاں کوئی ٹھیک نہیں کرتا۔ نئی لگوانی پڑے گی۔''

''بھئی ہم نے اسے کچھ نہیں کیا...... کسی اور نے خراب کی ہوگی۔''

''چلو خیر۔'' وہ بولی۔ ''آج تم لوگ کہاں جا رہی ہو...... کہیں بھی نہیں جانا...... مسز اور مسٹر ڈریزیلہ نے تم سب کو کھانے پر بلایا ہے آج رات۔''

''ہمیں یعنی ہم سب کو۔''

''ہاں ہاں...... پاکستانی لوگوں کے ہاں تو کھانے کھا لیے۔ اب امریکنوں کے ساتھ بھی ڈنر کرنے کا تجربہ کرلو......''

ہم اس سے کئی باتیں پوچھتی رہیں۔ وہ ہمیں جواب دیتی رہی۔ امریکنوں کے کھانے کے آداب اور طور طریقے بھی سرسری طور پر بتائے۔

وہ جانے لگی

تو

میں نے کہا: ''شمو یہ سامنے کس کا گھر ہے۔''

''والٹر فریڈرک کا۔ اس کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے......''

''بچے کتنے ہیں ان کے۔''

''کوئی بھی نہیں۔''

''کوئی بھی نہیں۔'' ہم دونوں نے تعجب سے کہا۔

''ہاں ہاں ان کا کوئی بچہ نہیں۔'' شمیم مڑتے ہوئے بولی۔

''یہ تو قناتیں لگا کر کھیلنے......''

ہماری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کچھ دیر ہنستے ہی گئی......

ہم نے کہا: ''ہنس کیوں رہی ہو...... بچے نہیں تو یہ چیزیں یہ گراؤنڈ...... یہ......''

''بھئی یہ ان کے کتے کے کھیلنے کی جگہ ہے۔ یہ ساری چیزیں بھی کتے کی ہیں۔ قنات اس لیے لگا رکھی ہے کہ کتا باہر نہ نکلے...... کتے کی سڑک پر آنے کی یہاں پابندی ہے...... جرمانہ ہوتا ہے۔ اس کتے کا ایک ملازم بھی ہے جو اس کی دیکھ بھال کرتا اور یہاں کھیلنے کے لیے لاتا ہے۔''

''واہ کیا کہنے...... یہاں کتے کے اتنے ٹھاٹھ باٹ اور اپنے ہاں کے ہزاروں لاکھوں بچوں کو بھی ایسی سہولتیں حاصل نہیں۔''

رات ہم مسٹر و مسز ڈریزیلہ کے ہاں ڈنر پر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ سب ہی اکسائیٹڈ تھے کہ دیکھیں امریکنوں کی مہمانداری کیسی ہوتی ہے۔ ان کے طور طریقے کیسے ہوتے ہیں۔ گھر کس طرح کے ہوتے ہیں۔ رہن سہن کیسا ہوتا ہے۔

مسٹر ڈریزیلہ انجینئر تھے۔ مسز ڈریزیلہ نرس تھی۔ ان کے تین بچے دو بیٹے اور ایک بیٹی اینٹ تھی۔ بڑا بیٹا شادی شدہ تھا۔ وہ لاس اینجلس میں تھا۔ دوسرا بیٹا اور بیٹی ماں باپ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ اینٹ کی عمر تقریباً 28 سال تھی۔ بیٹا بڑا تھا۔ اینٹ غیر شادی شدہ تھی اور امریکی دستور کے خلاف وہ دونوں، بہن بھائی ماں باپ کے ساتھ رہ رہے تھے۔

مسٹر ڈریزیلہ تین سال سعودی عرب (ریاض) بھی رہ چکے تھے۔ اس لیے اسلام کے متعلق ان کی معلومات خاصی تھیں۔

یہ لوگ پولش تھے۔ 1962ء میں امریکہ آ کر سیٹل ہوئے تھے۔ پولش لوگوں کے رجحانات اور احساسات کسی حد تک مشرقی لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم ان کے ہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ امریکہ میں جہاں بچہ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا کمانے لگیں تو

اپنے الگ گھر میں رہتے ہیں اور جس طرح چاہیں رہیں' جس سے چاہیں دوستیاں کریں' جن سے چاہیں نہ ملیں...... اچھی زندگی بسر کریں یا غلط صحبت اختیار کریں' ماں باپ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہوتا۔

یہاں یہ بات بتادوں کہ امریکہ میں بچوں کے حقوق بھی باقاعدہ قانونی طور پر محفوظ ہیں۔ ماں باپ ان پر جبر کر سکتے ہیں نہ سختی۔ وہ برا بھلا کہنے کے بھی مجاز نہیں۔ بہت چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی اپنے تحفظ کے پورے حقوق حاصل ہیں۔ یہاں تک کہ دو اڑھائی سال کا بچہ بھی اس بات سے آگاہ ہے۔ اسے ماں یا باپ مارے پیٹے یا گالیاں دے تو وہ فوراً 911 پر فون ڈائل کر کے پولیس کو بلا لیتا ہے۔ یہ نمبر تقریباً ہر بچے کو ازبر ہے۔ پولیس آجاتی ہے اگر ماں باپ نے واقعی بچے کو مارا ہو یا Abuse کیا ہو تو ماں باپ حراست میں لے لیے جاتے ہیں۔ کیس سیریس ہو تو وہ قید بھی ہو سکتے ہیں۔

ہمارے وہاں ہوتے ہی ایک کیس ٹی وی پر آ رہا تھا۔ ایک ماں نے بچے کو مارا پیٹا۔ اس کا منہ لہولہان کر دیا۔ بچے نے 911 ڈائل کیا۔ پولیس آ گئی۔ ماں کو حراست میں لے لیا گیا۔

بچے کو گورنمنٹ کے متعلقہ ادارے نے کسٹڈی میں لے لیا اور ماں کو بارہ سال کی قید ہو گئی۔

بچوں کا تحفظ اپنی جگہ...... لیکن مجھے یہ قانون اچھا نہیں لگا بلکہ غلط لگا۔ کیونکہ ایک بچے کی تربیت جس طرح ماں کر سکتی ہے۔ یہ فلاحی ادارے نہیں کر سکتے۔ ماں کا پیار' اس کی ممتا ہی تربیت کا اہم جزو ہے۔ بچے کو ماں سے جدا کر کے کسی ادارے کے حوالے کر دینا غلط بات ہے۔ امریکی اسے صحیح سمجھتے ہوں گے۔ ان کا اپنا معاملہ۔

لیکن

ایک بات یہ بھی ہے کہ جب کوئی قانون بنتا ہے تو اس میں اچھائی کے پہلو بھی ہوتے ہیں۔ امریکہ میں دنیا بھر سے زیادہ طلاقوں کے واقعات ہوتے ہیں۔ شادی تو ہو جاتی ہے لیکن جلد ہی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی ٹینشن میں رہتے ہیں

اور بچوں کو بے دردی سے زدوکوب کر کے ایک دوسرے کا غصہ بچوں پر نکالتے ہیں۔

ایسے بے شمار واقعات ہوتے ہیں۔ بچوں کو مار مار کر ان کی ہڈی پسلی توڑ دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بچوں کے ساتھ طلاق شدہ یا آپس میں لڑنے جھگڑنے والے والدین بہیمانہ سلوک کرتے تھے جس کی وجہ سے یہ قانون بنایا گیا۔

لیکن

اس قانون کا فائدہ بعض اوقات بچے ناجائز بھی اٹھاتے ہیں۔ ذرا کسی نے ڈانٹا یا تھپڑ مارا تو وہ فوراً 911 پر کمپلینٹ کر دیتے ہیں۔ ماں یا باپ جو بھی ذمہ دار ہو اسے سزا ملتی ہے۔ ماں باپ کے علاوہ ٹیچر بھی ڈانٹے یا تھپڑ لگائے تو وہ بھی سزا پاتے ہیں۔

آمنہ جب امریکہ گئی تھی تو اس نے بچوں کی نرسری میں چند ماہ کام کیا تھا۔ وہ بتاتی تھی کہ بچے 911 پر شکایت کرنے کے اتنے شائق ہوتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر ٹیچر کو چڑاتے یا تنگ کرتے ہیں تاکہ ٹیچر انہیں ڈانٹے یا مارے تو وہ شکایت کر سکیں۔

آمنہ نے تو خوفزدہ ہو کر یہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ کہتی تھی کیا پتا کسی بات پر بچے پر غصہ آ ہی جائے اور وہ تھپڑ لگا دے۔ اس سے بہتر یہی تھا کہ وہ نوکری ہی چھوڑ دی جائے۔

بچے کو مارنے کا ایک واقعہ پچھلے سال ہمارے دیکھنے میں بھی آیا۔ ہوا یوں کہ ایک پاکستانی فیملی امریکہ میں رہتی تھی۔ ان کا ایک گیارہ بارہ سالہ بچہ اچھا خاصہ Spoil ہو گیا تھا۔ ماں باپ کے کہنے میں نہیں تھا۔ بری صحبت میں پڑ گیا تھا۔ نہ پڑھتا تھا بلکہ رنگ برنگے فیشن کرنے میں مشغول رہتا۔ کانوں میں بالیاں ڈالی ہوتیں' کبھی ہونٹوں پر لٹکا لیتا' کبھی بھنوؤں پر...... یہ فیشن ان دنوں میں تھا جب ہم امریکہ گئے تھے۔ گھٹنوں سے پھٹی جینز بڑھے ہوئے بال' چمکتی سنہری بالیاں کانوں' ہونٹوں اور بھنوؤں میں اٹکائی ہوئیں۔ چھوٹی چھوٹی عمر کے لڑکوں نے بھی اپنے برابر یا اپنے سے بڑی گرل فرینڈز کے بازو میں بازو ڈالے ہوئے۔ سیکس کے معاملے میں بھی فری ہوتے۔ ہم جنس کی جنس پرستی بھی سننے میں آتی۔ یعنی لڑ بین بھی دیکھنے میں آتے تھے۔ سو یہ بچہ بھی اسی ڈھلان پر لڑھکتا جا رہا تھا۔ ماں باپ پریشان تھے۔ بچوں کو کچھ بنانے کے لیے وطن چھوڑ کر یہاں آئے تھے لیکن یہاں

معاملہ الٹ ہو گیا تھا۔

تنگ آ کر باپ نے ایک دن چھڑی پکڑ لی اور امریکی قانون کا لحاظ کیے بغیر بیٹے کی چمڑی ادھیڑ دی۔ کمرے میں بند کر کے اس نے بچے کو خوب پیٹا اور انسان بن کر یہاں رہنے کی تلقین کی۔ ہاتوں اور چھڑی سے جو اس سے ہو سکتا تھا کیا۔

باپ دل کی بھڑاس نکال کر باہر نکلا تو بچے نے فوراً 911 کو فون کر کے پولیس کو بلا لیا۔

چنانچہ باپ کو حراست میں لے لیا گیا۔ بچے کے بدن پر چھڑی سے پٹنے کے نیل موجود تھے۔

باپ نے بہتیرا اپنے ماحول اور معاشرے کا پولیس کو بتایا۔ بچے کے بگڑنے کی بات کی۔ پاکستان میں بچے کو مار پیٹ کر سمجھانا بری بات نہ تھی۔

لیکن

یہ

پاکستان نہیں تھا۔

امریکہ تھا۔

اور

امریکہ میں امریکی قانون ہی چلتا تھا۔

چنانچہ باپ کو ایک سال کی قید ہو گئی......

باپ کے قید ہونے کا اثر تو گھر والوں نے بہت لیا لیکن بچہ اور شیر ہو گیا۔ بلکہ فخر کرنے لگا کہ اس نے باپ کو سزا دلا کر اس کی زیادتی کا بدلہ لے لیا ہے۔ باپ کی ایک سال کی قید سے اس نے برائیوں کو اپنانے میں مزید حصہ لیا۔ اسی عمر میں نشہ بھی کرنے لگا۔ اب ماں اور بہن کو ستانے لگا۔ وہ دو چار چار دن گھر کا رخ نہ کرتا۔ ماں اور بہن جتنی پریشانی میں تھیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خیر

ایک سال گزر گیا۔ باپ کی سزا ختم ہو گئی۔ وہ گھر آ گیا۔

بچہ باپ سے بالکل نہیں ڈرا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مزید کوئی بات ہوئی تو وہ پھر 911 پر فون کر کے پولیس کو بلا لے گا۔

باپ نے بڑے حوصلے اور صبر کا مظاہرہ کیا۔ بچے کو کچھ نہیں کہا۔

لیکن

اس نے قید سے گھر آتے ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی فیملی کو واپس پاکستان لے جائے گا۔

چنانچہ

اس نے خاموشی اور پردہ داری ہی سے سارے انتظامات کیے اور ایک دن چپکے سے ہی اس نے سامان پیک کروایا۔ اس کے اس پلان میں بیوی اور بیٹی شریک ضرور تھے۔

جب لڑکے کو کچھ علم ہوا تو سب نے کہا کہ وہ سٹیٹ چینج کر رہے ہیں۔ قید کی سزا کاٹنے کے بعد باپ لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔

وہ سب پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔

جب جہاز کراچی ایئرپورٹ پر رکا اور یہ فیملی جہاز سے باہر نکلی......

تو

باپ نے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہی چھڑی سنبھالی۔ بچے کو کان سے پکڑا اور ایک دو تین لاتیں رسید کرنے کے بعد چھڑی سے جو پیٹنا شروع کیا تو جہاز سے اترنے والے مسافروں کو اور جہاز یا ایئرپورٹ کے عملے کی پروا کیے بغیر بچے کو پیٹتا گھسیٹتا ایئرپورٹ کی انٹرنس کی طرف جانے لگا۔ وہ ایک چھڑی لگاتا تو کہتا: "بلا اب پولیس کو...... کر فون 911 پر......"

جب اس نے بچے کو ادھ موا کر دیا تو عملے کے دو تین آدمیوں نے باپ سے بچے کی جان چھڑائی۔

"آخر بات کیا ہے قبلہ۔" ایک آفیسر نے باپ سے پوچھا۔

باپ جواب بھی غصے سے بل کھا رہا تھا بولا۔ "یہ امریکہ میں تھا لیکن اب پاکستان میں ہے۔"

"پھر بھی محترم بات کیا ہے۔"

پھر اس کے باپ نے ساری روائیداد کہہ سنائی۔ بچہ زمین پر سر نیہوڑائے بیٹھا تھا اور اس کے ارد گرد ایئر پورٹ کا عملہ اور کچھ مسافر کھڑے ہو گئے تھے۔

"اب میں اسے انسان بناؤں گا۔ بندہ بناؤں گا اور بیٹا بننا سکھاؤں گا......"

آگے

کیا ہوا۔ وہ تو پتہ نہیں۔ وہ لڑکا انسان' بندہ یا بیٹا بنا کہ نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ باپ اپنے فعل میں حق بجانب تھا۔ بری باتوں پر روکنا ٹوکنا' بدتمیزی کرنے پر سختی سے منع کرنا ایک دو تھپڑ لگا دینے سے کچھ نہیں بگڑتا۔

یہ واقعہ میرے داماد ذوالفقار احمد خان جو پی آئی اے کراچی میں آفیشیٹنگ جی ایم تھے ان کا چشم دید ہے۔

سو امریکہ میں جو Child abuse یا بچوں پر زیادتی نہ کرنے کا قانون بنا تھا اس کی افادیت واقعات کے حساب سے ٹھیک سہی لیکن وہاں بچے بات بات پر اس حق کا استعمال 911 پر فون کر کے کرتے ہیں۔ دو ڈھائی سال کے بچے بھی جو نمبر پڑھ سکتے ہیں ٹیچر کے کچھ کہنے یا ماں باپ کے ڈانٹنے پر یہ نمبر ڈائل کر کے پولیس کو بلا لیتے ہیں اور ماں باپ کے لیے مصیبت کھڑی کر دیتے ہیں۔ بچے کی اصلاح کے لیے ماں باپ اگر ڈانٹ بھی لیں یا کبھی کبھار مار بھی لیں تو یہ بری بات نہیں۔ بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ صرف پیار ہی پیار بچے کو بگاڑ بھی دیتا ہے۔

خیر

بات کہاں کی تھی اور کہاں نکل گئی۔

بہر حال آپ کو امریکی معاشرے کی ایسی جزئیات سے آگاہ کرنا بھی ضروری ہے۔

ہاں تو

ہم سب ڈریزیلہ فیملی سے ملنے اور ڈنر کے لیے جا رہے تھے۔ ہمارے ہاں تو رواج ہے کہ کسی کے گھر کھانے پر جائیں تو مٹھائی یا پھل وغیرہ ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ نیک خواہشات کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن

جب یہ بات ہم نے شمو سے کہی تو وہ بولی۔ "امریکی لوگ ان تکلفات میں نہیں پڑتے۔"

"اگر کچھ لے بھی جائیں تو ہرج کیا ہے۔"

"پھول لے لیں۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔"

"خالی پھول!"

"ہاں آپا...... یہاں پھول بہت مہنگے ہیں۔ سستے نہیں۔ ایک گلدستہ منگوا لیں۔ چاروں مل کر۔"

ہمیں چاروں کا مل کر ایک گلدستہ منگوانا عجیب سا لگا...... لیکن جب قیمت سنی تو اتنا ہی کافی سمجھا۔ ویسے میرے پاس ایک پاکستانی چھوٹا سا واز تھا۔ میں نے گفٹ کرنے کے لیے اسے پیک کر لیا۔ میری دیکھا دیکھی سیمی نے بھی ایک افغان جیولری کا گلے کا سیٹ نکالا اور آینٹ کے لیے پیک کیا۔ گڈی نے بھی اور رقیہ نے بھی خوبصورت چھوٹی چھوٹی پاکستانی چیزیں جو وہ گفٹ کرنے ہی کے لیے ساتھ لے گئی تھیں' پیک کر لیں۔

ہم ٹھیک آٹھ بجے دو گاڑیوں میں مسز ڈریزیلہ کے ہاں روانہ ہوئے۔ ایک گاڑی آمنہ ڈرائیو کر رہی تھی دوسری شمیم۔

آمنہ کو راستوں کی بہت پہچان ہے لیکن اس کے مقابلے میں شمیم جو کہ برس ہا برس سے امریکہ میں رہ رہی ہے' اکثر راستہ بھول جاتی ہے اور پھر میلوں کی مسافت بیکار میں طے کر کے واپس آتی اور صحیح سڑک لیتی ہے۔

خیر اس دن آمنہ لیڈ کر رہی تھی۔ اس لیے گم ہونے کا سوال نہیں تھا۔

ہم کوئی پینتیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ڈریزیلہ فیملی کے کار پاتھ پر تھے۔

گاڑیاں رکیں۔

اور

ہم

باری باری باہر نکلے۔

مسز اور مسٹر ڈریزیلہ آینٹ اور ان کا بیٹا دروازے سے باہر ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے بڑے والہانہ انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ خالد اور احمد سے مردوں نے ہاتھ ملائے۔ عورتیں عورتوں سے گلے ملیں۔ گالوں پر بوسے دیے۔

ہم سب کو وہ بڑی عزت و تکریم دیتے ہوئے اندر لے گئے۔

ان کا گھر کونڈومنیم ٹائپ تھا۔ بے حد صاف ستھرا اور خوبصورتی سے آراستہ۔ ڈرائنگ روم بہت زیادہ بڑا نہیں تھا پھر بھی سب لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ آینٹ کی پھوپھی پھوپھا' ان کی بیٹی اور داماد بھی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ہمیں بڑے پرجوش طریقے سے ویلکم کیا۔

ڈرائنگ روم سرخ اور سنہری رنگوں کا امتزاج تھا۔ صوفے سنہری تھے۔ جن پر پوشش سرخ ویلوٹ کی تھی۔ ریڈ کارپٹ بھی درمیان میں پڑا تھا۔ درمیانی شیشے کی میز کے فریم اور پائے سنہری تھے۔ اس کے اوپر ریڈ روز کا بہت بڑا گلدستہ پڑا تھا۔ دو دیواروں پر سنہری فریموں والی سینریاں تھیں۔ شیشے کی کھڑکیوں پر ورٹیکل بلائنڈز پڑی تھیں جن کے اوپر سجاوٹ کے لیے اینٹ نے سرخ پھولوں کی پینٹنگ کی ہوئی تھی۔ یہیں ایک کونے میں ٹی وی پڑا تھا اور دوسرے کونے سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ وہ بھی ریڈ کارپٹ سے ڈھکی تھیں۔

اس گھر کا ایک بیڈروم نیچے تھا۔ دو اوپر۔ نیچے کچن کے ساتھ ڈرائنگ روم تھا۔ جس کے دیوار گیر شوکیس میں کچھ قیمتی برتن اور ڈیکوریشن پیسز سجے تھے۔ گھر سنٹرلی ہیٹڈ تھا۔

ہم لوگوں نے کوٹ وغیرہ اتار دیے تھے۔

درمیانی میز پر کرسٹل کے پیالوں میں چاکلیٹس پڑی تھیں جو بے حد لذیذ تھیں۔ سب بیٹھ گئے۔ گپ شپ ہونے لگی۔ ہم سب کو جتنی انگریزی آتی تھی ہم بھی اپنا مفہوم ادا کر رہے تھے اور وہ بھی سمجھ رہے تھے۔

''آپ کا گھر بڑا خوبصورت ہے۔'' میں نے مسز ڈریزیلہ سے کہا۔ تو وہ ہنس کر بولی۔ ''تھینک یو لیکن آپ کی بہن کے گھر کے مقابلہ میں تو یہ کچھ بھی نہیں......''

''میں چھوٹے بڑے گھر کا مقابلہ نہیں کر رہی۔ آپ نے گھر بہت اچھا سجا رکھا ہے......''

''آپ کب سے یہاں رہ رہی ہیں۔'' گڈی نے رواں لہجے میں پوچھا۔

وہ مسکرائی اور بولی۔ ''ہمیں یہاں رہتے انتیس برس ہو چکے ہیں۔''

''واقعی۔'' ہم سب کو حیرت ہوئی۔ گھر اتنا صاف ستھرا اور میٹین کیا ہوا تھا کہ لگتا تھا یہاں ان لوگوں کی رہائش دو ایک سال ہی سے ہوگی......''

آینٹ ہنس کر بولی۔ ''ہمارا کچن آپ دیکھیں گی تو کہیں گی ہم انتیس سال سے بھوکے ہی رہ رہے ہیں۔ کچن کو کبھی استعمال ہی نہیں کیا......''

آینٹ کی پھوپھی جو ہماری باتیں سن رہی تھی۔ بولی: ''ہم امریکی لوگ گھر کا باتھ روم اور کچن دیکھتے ہیں۔ یہ صاف ستھرے ہوں تو سمجھ جاتے ہیں کہ اہل خانہ صفائی پسند ہیں۔''

''مجھے تو خود کچن اور باتھ روم کی صفائی کا جنون ہے۔'' آینٹ کی پھوپھی زاد مارگریٹ بولی۔ وہ تیس بتیس برس کی خوبصورت عورت تھی۔ سنہری بال' شربتی آنکھیں' سرخ و سپید رنگت' لپ اسٹک کے بغیر پنک ہونٹ' قد و قامت بھی ٹھیک ٹھاک' اس کی باتیں بھی اسی کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔ شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔ اس کا شوہر انجینئرنگ کر رہا تھا اس لیے بچوں کی ابھی ضرورت نہ تھی۔

باتیں ہوتی رہیں۔ آینٹ سب کو مزید اور رنگ برنگی چاکلیٹس پیش کرتی رہی چونکہ

وہ صائمہ کی شادی میں تقریباً روز آتی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ ہم سب خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔

اس لیے نسیمی نے اس سے کہا: ''اینٹ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ تم انتیس سال کی ہو چکی ہو۔ ہمارے ہاں تو اس عمر کی خواتین کئی کئی بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں۔''

''اس کو اپنی پسند کا کوئی آدمی نہیں مل رہا......'' اینٹ کی جگہ قریبی کرسی پر بیٹھا اس کی کزن مارگریٹ کا شوہر فرینک بولا۔

''کیا یہ بات صحیح ہے......؟''

''یہ بہت چوزی ہے۔'' مارگریٹ نے کہا۔

اینٹ ہنسی پھر بولی۔ ''دو دفعہ دوستی کی لیکن دونوں کام کے بندے نہیں تھے۔''

تجسس کی خاطر میں نے چاہا کہ اس سے پوچھوں' جس دوستی کا ذکر کر رہی ہو' اس کی نوعیت کیا تھی۔ کیا ان دوستوں کے ساتھ تم رہتی رہی ہو۔ ڈیٹس پر جاتی رہی ہو۔ دوستی میں جنس بھی شامل تھی۔

لیکن

اتنا ذاتی سوال پوچھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

کچھ دیر تو مرد ایک طرف بیٹھے امریکی سیاست اور ان دنوں چونکہ کلنٹن لیونسکی کی داستان عشق موضوع ہوتی تھی' باتیں کرتے رہے۔ پھر عورتوں مردوں کا دائرہ گڈمڈ ہو گیا۔ اور سب مل جل کر باتیں کرنے لگے۔

اینٹ کی پھوپھی جس طرح بھائی بھابی اور بھتیجے بھتیجی کی باتیں پیار اور مٹھاس بھرے لہجے میں کر رہی تھی۔ دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ رشتوں کا خلوص اور پیار یہاں بھی ہے۔ باتیں کرتے ہوئے اس نے بتایا: ''میرا گھر یہاں سے تین کلومیٹر ہے لیکن میں اور میرا بھائی روز ہی ملتے ہیں۔ کبھی واک کرتے وہ مجھے ملنے آ جاتا ہے' کبھی میں اور میرا ہسبینڈ چلتے پھرتے ان سے ملنے آ جاتے ہیں...... مجھے اپنا بھائی بہت پیارا ہے۔''

''اور آنٹی ہم۔'' اینٹ اور اس کا بھائی بولا۔

''تم چونکہ میرے پیارے بھائی کے پیارے ہو اس لیے مجھے بھی بہت پیارے ہو۔'' ہم سب ہنس پڑیں۔

''اور فرتھ'' مسز ڈریزیلہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے متعلق کیا خیال ہے۔''

''تم تو میری بھابی کم اور پیاری سہیلی زیادہ ہو......''

سب پھر ہنس پڑے۔

''ویسے عجیب لگ رہا ہے۔'' میں بولی۔ ''جہاں تک ہماری معلومات ہیں۔ یہی سن رکھا تھا کہ یہاں بچے ماں باپ سے چھوٹی عمروں ہی میں الگ ہو جاتے ہیں۔ خود ہی کماتے اور خود ہی اپنے آپ کو سپورٹ کرتے ہیں۔ پیار' محبت' خلوص ان کے لیے بیکار جذبے ہیں لیکن آپ کی فیملی تو لگتا ہے ہمارے پاکستان کی فیملی ہو۔ ہم لوگ 100 فیصد نہ سہی 95 فیصد رشتوں کا احترام کرنا جانتے ہیں۔ فیملی اسی احترام کے بندھن میں بندھی ہوتی ہے۔ ماں باپ بچے بوڑھے بھی ہو جائیں تب بھی ان سے پیار کرتے ہیں۔ یہ بچوں کا رویہ ہوتا ہے۔ خون کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے......''

''آپ نے ٹھیک سنا۔ یہاں کے متعلق...... بچے ماں باپ اور والدین بچوں سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی زندگی جیتا ہے۔ آزادی پسند کرتا ہے۔ یہ رشتوں کی ڈور یہاں انہیں کم ہی بھاتی ہے...... لیکن مسز بٹ سب لوگ ایک طرح کے نہیں۔ گو اکثریت ایسے لوگوں کی ہے لیکن اب بھی یہاں کچھ فیصد لوگوں میں فیملی سسٹم موجود ہے...... سب ایک جیسے نہیں......''

''شادی کے معاملے میں تو یہاں ہر کوئی آزاد ہے۔'' خالد بولا۔

''تو کیا آپ لوگ آزاد نہیں'' مسز ڈریزیلہ بولے۔

''ہمارے ہاں عام طور پر ارینجڈ میرجز ہوتی ہیں......''

''کیا مطلب؟'' اینٹ جلدی سے بولی۔

"بھی ماں باپ بچوں کے لیے رشتہ پسند کر لیتے ہیں۔ پھر شادی کر دیتے ہیں۔" نسیمی نے کہا۔

اس بات پر وہ سب لوگ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگے۔ کچھ لمحوں بعد فرتھ بولی۔

"اس زمانے میں کیا یہ بات ممکن ہے......"

"بالکل ہماری شادیوں کی اکثریت ارینجڈ ہوتی ہے۔ اکثر تو لڑکی نے لڑکا اور لڑکے نے لڑکی کو دیکھا تک نہیں ہوتا۔ شادی کی رات ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔"

"او مائے گاڈ۔" اینت نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ہم سب ہنس پڑے۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔" فرتھ بولی...... "بالکل غیر یقینی...... ایسا ہو کیسے سکتا ہے۔"

"ہو سکنے کا سوال نہیں ایسا ہوتا ہے۔" میں بولی۔

"پھر تو طلاقوں کا ریٹ وہاں بہت زیادہ ہوتا ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ ایسی شادیاں دیر تک چل سکیں۔" فرینک بولا۔

"ہم سب مسکرائے۔ پھر خالد نے کہا: "ہمارے ہاں بھی طلاقیں ہوتی ہیں لیکن بہت ہی کم۔ نہ ہونے کے برابر...... اس کی وجہ بھی ارینجڈ میرج نہیں ہوتی بلکہ کئی اور وجوہ ہوتی ہیں۔"

"وہ کیا؟" ڈریزیلہ بولے۔

"معاشی بدحالی۔ شوہر یا بیوی کا آوارہ ہونا' بانجھ پن وغیرہ۔"

"اوں ہوں۔" اینت اور فرتھ نے سرنفی میں ہلایا۔ انہیں یہ یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ ارینجڈ میرج لڑکے لڑکیاں بخوشی کرتے ہیں۔ پھر انہیں نباہتے بھی ہیں۔ طلاقیں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔

کافی دیر یہ گفتگو چلی۔ ہم سب نے اپنی اپنی مثالیں دیں۔ سب کی ارینجڈ میرجز تھیں اور طویل عمریں میاں بیوی کی باہمی رفاقت میں ہنسی خوشی کٹی تھیں۔ اس کے باوجود وہ سب یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔ اینت تو بار بار اپنا سر ہاتھوں میں لے کر نفی

میں سر ہلا رہی تھی۔

پھر فرینک نے کہا: "کیا آپ کا ملک بہت بیک ورڈ ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" خالد بولا۔ "ہمیں حدود کے اندر ہر قسم کی آزادی میسر ہے...... لیکن بے راہ روی کے ہم قائل نہیں۔ ہمارا فیملی سسٹم بہت مضبوط اور مربوط ہے۔ ہمارے بچے اگر ماں باپ کے پاس ہیں تو ان کا ادب لحاظ کرتے ہیں۔ کمائی کرنے یا نوکری کرنے کہیں چلے بھی جائیں' پھر بھی یہ احترام باقی رہتا ہے اور بچے ماں باپ کی مالی خدمت کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں...... بوڑھے ماں باپ کی خدمت تو عبادت ہے ہمارے نزدیک۔"

ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... پھر مارگریٹ بولی: "آپ کے ہاں بوڑھوں کے لیے اولڈ ہومز نہیں بنے ہوئے۔"

"نہیں۔"

"تو پھر وہ اولڈ ایج میں کیا کرتے ہیں۔"

"اپنے بچوں کے پاس رہتے ہیں۔ بچے انہیں سنبھالتے ہیں۔ ان کی خدمت فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ بزرگ بھی بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ پوتوں' نواسوں کو کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔ بچے بھی ان سے بہت مانوس ہو جاتے ہیں۔"

"گھر میں امن و سکون رہتا ہے۔" مسز ڈریزیلہ نے پوچھا۔

"بالکل...... میں سو فیصد لوگوں کی بات نہیں کر رہا...... لیکن اکثریت ایسی ہی ہے جیسی میں نے بیان کی ہے۔"

"پھر تو آپ کا ملک جنت ہوگا۔" فرتھ نے طنزیہ کہا۔

"ہاں بالکل ہے...... بہت خوبصورت' بہت پیارا' ہر قسم کی نباتات وہاں ہیں' پھل پیدا ہوتے ہیں' گندم' چاول کاشت کرتے ہیں' سبزیوں کا حساب نہیں' ہمارے ملک میں پہاڑ ہیں' میدان ہیں' دریا ہیں' ندی نالے ہیں...... قدرت بہت مہربان ہے ہم پر...... ہماری زمین بہت زرخیز ہے۔"

"تو پھر آپ کے لوگوں کی بڑی تعداد دوسرے ملکوں میں کیوں جارہی ہے......"

فرتھ کا یہ ایسا تو کیلا طنزیہ سوال تھا کہ ہم چند لمحوں کے لیے چپ ہو گئے۔ ندامت سی محسوس ہوئی۔

لیکن

میں نے جلدی معاملہ سنبھالا۔ "ہجرت ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی انسانی فطرت ہے...... ہمارے ملک سے اگر لوگ باہر نکل رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں اپنا اتنا زرخیز اور شاداب ملک پسند نہیں......" میں کچھ دیر رکی۔

تو

خالد نے بات آگے چلائی۔ "ہمارا ملک نعمتوں سے مالا مال ہے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہوئے ضرور ندامت محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے ملک کا نظام ٹھیک نہیں۔ روز بروز بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان کی باون ترپن سالہ زندگی میں ہمیں ایک بھی ایسا لیڈر نہیں ملا جو بگڑے سسٹم کو ٹھیک کرے۔ لالچ اور خود غرضی نے ان لوگوں کو اندھا دھند پیسہ سمیٹنے کے سوا اور کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ دیکھا دیکھی اوپر سے کرپشن و بدنظمی نیچے تک آ گئی...... عوام جو اپنے ملک سے پیار کرتے ہیں اس کی فلاح کی امیدیں لگائے ہیں' مایوس ہوتے چلے جا رہے ہیں...... وہاں تنگ پڑتے ہیں...... یا اپنی حق تلفی دیکھتے ہیں' تو پھر بہتر مستقبل کے لیے دوسرے ملکوں کا رخ کر لیتے ہیں......"

یہ بحث یا تقریر بہت لمبی ہو جاتی کہ مسز ڈریزیلہ نے خالد سے قطع کلامی کے لیے معذرت کرتے ہوئے سب کو کھانے کے لیے بلایا۔

اس نے ایک بار نہیں کئی بار خالد سے سوری کہا۔

خالد نے ہنس کر کہا۔ "کوئی بات نہیں ہم کھانا کھاتے ہوئے بھی باتیں کر سکتے ہیں۔"

مسز ڈریزیلہ نے مسلمان یعنی بٹ صاحب سے کیٹرنگ کروائی تھی۔ دو ایک ڈشیں خود بنائی تھیں...... اور فرتھ بھی ایک اٹالین ڈش لزانیہ بنا کر لائی ہوئی تھی۔

امریکن کھانے سے پہلے شراب کا دور چلاتے ہیں لیکن ڈریزیلہ فیملی نے مسلمان پاکستانیوں کو مدعو کیا ہوا تھا' اس لیے شراب کا نام بھی وہاں نہیں تھا۔

عام طور پر ان لوگوں کے گھروں میں بار بنے ہوتے ہیں۔ کسی کے گھر بہت بڑے اور خوبصورت کسی کے ہاں درمیانے اور کسی کے ہاں فریج میں شراب کی بوتلیں رکھنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

مسز ڈریزیلہ کے ہاں بھی چھوٹی سی بار تھی۔ ایک طرف چھوٹا سا فریج جس میں شراب اور سوڈے کی بوتلیں وغیرہ پڑی تھیں' ساتھ ایک خوبصورت سی چھوٹی الماری تھی جس کے اندر تو پتہ نہیں کیا تھا' اوپر کرسٹل کے سٹینڈ والے گلاس پڑے تھے۔ ان چیزوں پر بھی انہوں نے مہین سا کپڑا ڈال دیا ہوا تھا یعنی بار بند تھی۔ اس لیے گھر والوں اور ان کے رشتہ داروں نے بھی شراب نہیں پی۔

لمبی سی میز پر کھانے کی ڈشیں چنی ہوئی تھیں۔ ڈائننگ روم کی میز پر بڑے سے گول المونیم چڑھے گتے کے تھال میں پھل اتنی خوبصورتی سے کٹا ہوا سجا تھا کہ دل چاہتا تھا دیکھتے ہی جائیں۔ تربوز اور خربوزے اس طرح کاٹ کر ملا کر رکھے ہوئے تھے کہ تصویری چیز لگتے تھے...... اور پھل بھی اسی طرح سجائے ہوئے تھے۔

تربوز اور خربوزہ ہمارے ہاں گرمیوں کا پھل ہے لیکن امریکہ میں اس سرد ترین موسم میں بھی دستیاب ہے۔ جانے کس ملک سے منگوایا جاتا ہے۔

میز کے ایک طرف ڈسپوزیبل پلیٹیں اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ چمچ' کانٹے اور چھریاں بھی ڈسپوزیبل تھیں۔ پھلوں کی میز پر بھی ایسے ہی برتن رکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ پھل چمکتے دمکتے کرسٹل کے پیالوں اور بیضوی ڈونگوں میں سجا ہوا تھا۔

یہاں بوفے کا انتظام تھا۔ کیونکہ لوگ کافی تھے اور ان کا کھانے کا کمرہ چھوٹا تھا۔

مسز ڈریزیلہ ہم سب کو کھانے کے کمرے میں لے گئے۔ سب نے اپنی اپنی پلیٹیں اٹھائیں۔ مسز ڈریزیلہ نے سب سے پہلے اپنی پلیٹ میں کھانا ڈالا...... پھر دائیں

ہاتھ کھڑے خالد سے کھانا لینے کی درخواست کی۔

ان کا پہلے خود کھانا لینا اور بعد میں مہمانوں کو کھانا لینے کے لیے کہنا ہمیں عجیب سا لگا...... ہم سمجھے پیٹو آدمی ہے بھوک لگ گئی ہوگی اس لیے کھانے کے آداب سے بے نیاز ہو گیا ہوگا۔

لیکن

بعد میں پتا چلا...... کہ یہ بات نہیں تھی۔

امریکن اگر مہمان کو مدعو کریں تو ہیڈ آف دی فیملی سرے والی کرسی پر بیٹھتا ہے۔

مہمان دائیں طرف سے شروع ہوتے ہیں۔

اور

کھانا سرو ہوتے ہی سب سے پہلے میزبان کھانا اپنی پلیٹ میں نکالتا ہے اور ڈش مہمان کی طرف بڑھاتا ہے۔ یوں ڈش کھسکتے کھسکتے میز کا چکر کاٹ کر پھر اپنی جگہ پر آ جاتی ہے۔ دو ڈشیں ہوں یا چار اسی طرح سرو کی جاتی ہیں۔

ڈریزیلہ فیملی میں چونکہ بوفے تھا' بڑی بڑی ڈشوں میں کھانا لگا تھا۔ لزانیہ تو نان سٹک دیگچی ہی میں رکھ دیا گیا تھا اس لیے ڈشیں میز کا چکر تو نہ لگا سکتی تھیں۔

اس لیے

مسٹر ڈریزیلہ نے ہر ڈش سے پہلے کھانا خود لیا تھا۔

یہ ہمارے ہاں کے دستور سے بالکل الٹ بات تھی۔ ہمارے ہاں مہمان کی عزت افزائی کے لیے ہر چیز پہلے اسے پیش کی جاتی ہے۔ پھر اہل خانہ لیتے ہیں۔ مہمان میز پر تشریف فرما ہوں اور کوئی بچہ بھی نادانی سے پہلے کھانا ڈال لے تو یہ بات ہمارے لیے ندامت کا باعث ہوتی ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ ہم مہمان کی عزت و احترام میں کمی کے موجب بنے ہیں۔

خیر

اپنا اپنا ملک اپنے اپنے طور طریق۔

جہاں تک مہمانوں کے احترام کا تعلق تھا' اس امریکن فیملی کا ہر فرد کوشش کر رہا تھا کہ مہمان صحیح طور پر کھانے سے لطف اندوز ہوں۔ مسز ڈریزیلہ تو ہر مہمان کے پاس جا کر پوچھ رہی تھیں: ''کچھ اور چاہیے...... کھانا کیسا لگا...... پیٹ بھر کر کھایئے گا......''

فرحھ چونکہ اٹالین ڈش لزانیہ بنا کر لائی ہوئی تھی اس لیے وہ بھی سب سے پوچھ رہی تھی۔ ''آپ کو یہ ڈش کیسی لگی...... میں نے خود بنائی ہے۔''

بہرحال

کھانا ہنسی خوشی اور باتوں کے درمیان کھایا گیا...... ہم سب نے کھانے اور پھل کھانے کی بہت تعریف کی۔ ان کی پُرخلوص میزبانی کا شکریہ ادا کیا۔ کھانے کے بعد آئنٹ نے ہمیں اپنا گھر دکھایا۔ گھر تو وہی تین بیڈروم کا کونڈو تھا لیکن انتیس سال گزرنے کے بعد بھی یوں لگتا تھا جیسے حال ہی میں تعمیر ہوا ہو۔ کچن تو واقعی یوں لگتا تھا جیسے یہاں کسی نے کوکنگ نہ کی ہو...... کوکنگ رینج سفید تھی لیکن نہ تو کہیں کوئی داغ دھبہ تھا نہ ہی کہیں سے روغن اکھڑا ہوا تھا۔ آئنٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا...... ''کہ کچن دیکھ کر آپ کو لگے گا کہ ہم انتیس برس سے یہاں بغیر کھائے پیئے رہ رہے ہیں۔''

ہم سب پھر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے جس کے کونے میں ٹی وی پڑا تھا' پتہ نہیں ٹی وی کی یہی جگہ تھی یا آج کھانا کھانے کے لیے جو کمرہ خالی کیا گیا تھا' وہاں رکھا ہوتا تھا۔

خیر

مسٹر ڈریزیلہ نے سب سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹی وی آن کر لوں۔''

''ضرور۔''

''میں کوئی پروگرام دیکھنے کے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ آپ سب کو اپنی فیملی مووی دکھانا چاہتا ہوں...... یہ ہماری شادی سے پہلے بننا شروع ہوئی تھی اور آج تک اس میں ایڈیشن ہو رہی ہے۔ آپ نے اجازت دی تو آپ کی اپنے گھر میں آمد کی بھی

تھوڑی سی مووی بناؤں گا۔"

"ضرور۔"

اس نے کیسٹ پہلے سے فٹ کر رکھی تھی...... ٹی وی آن کیا تو ڈریزیلہ فیملی کا تعارفی نوٹ سامنے آیا۔

پھر مسز ڈریزیلہ کی شادی سے پہلے کی تصویریں۔ مسز ڈریزیلہ جواب گول مول سے ہو چکے تھے' ان کی جوانی کی سمارٹ تصویریں دیکھیں...... پھر منگنی کا پروپوزل' ویڈنگ شاور۔ خاندان کے لوگ' تحفے تحائف' مسز ڈریزیلہ جوانی میں بے حد خوبصورت اور سمارٹ تھیں۔ اب وہ بھی فربہ ہو گئی تھیں۔ شادی کے وقت سفید لباس میں تو بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔ اس کے بعد پہلا بیٹا...... گول مٹول پیارا سا نیلی آنکھوں والا سرخ و سپید بچہ جو اب شادی شدہ تھا اور ڈاکٹر بن چکا تھا۔

اس کے بعد کئی گھریلو تقریبات جن میں خاندان کے لوگ شامل تھے۔ فرتھ کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی لیکن اس کا دوست جو بعد میں شوہر بنا' تصویروں میں موجود تھا۔

دوسرے بچے کی پیدائش پر بھی فوٹو کھینچی گئیں۔ رشتے دار جمع ہوئے۔ کھانے کی تقریب تھی۔

پھر آینٹ کی پیدائش...... سب بے حد خوش...... اس کے علاوہ کئی پکنک کی تصویریں...... گھر میں تینوں بچوں کے کھیلنے کودنے کی مووی...... فرتھ کی شادی کا بھی تھوڑا سا احوال......

مسز ڈریزیلہ مووی کے درمیان اپنے ان رشتہ داروں کے نام اور رشتے بھی بتاتی جاتی تھیں...... جو فنکشنز میں موجود تھے۔

مووی دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ ان کا فیملی سسٹم بھی کسی حد تک ہم سے ملتا جلتا ہے۔ تحفے تحائف کا تبادلہ' ایک دوسرے سے گلے ملنا اور بوسہ لینا یا دینا' کھانا کھاتے ہوئے ہنسی مذاق...... چہلیں......

مووی میں بیٹے کی شادی اور اپنی بہو کی تصویریں بھی انہوں نے بڑے پیار سے دکھائیں......

مووی ختم ہوئی تو سب نے تالیاں بجائیں۔

خالد تو یہاں کے بیشمار لوگوں سے مل چکے تھے۔ کئی بار امریکہ آئے تھے اور شمو کے ساتھ امریکنوں کے ہاں دعوتیں کھائی تھیں۔ بولے: "بھئی لطف آ گیا۔ سب سے اچھی بات یہ لگی کہ آپ اپنی فیملی سے منسلک ہیں......"

"ہمارے اکثر رشتہ دار ابھی پولینڈ میں ہیں' لیکن کبھی کبھار ملنا ہو ہی جاتا ہے۔"

"یہی بات تو مجھے اچھی لگی۔" خالد بولا۔ "ورنہ یہاں شمیم نے مجھے کئی ایسی فیملیز سے ملوایا ہے جن کے اپنے بچے بھی ان سے الگ ہو چکے ہیں اور اجنبیوں کا سا سلوک کرتے ہیں ماں باپ سے......"

"اور سب سے تکلیف دہ بات مجھے یہ لگتی ہے کہ ماں باپ جب بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں تو امریکی لوگ انہیں اولڈ ہومز میں داخل کروا دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی ایسا سوچتا بھی نہیں بلکہ والدین جتنے زیادہ بوڑھے اور کمزور ہوتے جائیں بچے ان کی زیادہ کیئر کرتے ہیں۔"

"ان کے پاس اتنا ٹائم ہوتا ہے۔" مارگریٹ بولی۔

"کیوں نہیں...... ہمارے ہاں عام طور پر عورتیں نوکریاں نہیں کرتیں۔ گھروں میں ہی رہتی ہیں۔ اس لیے بوڑھوں کی دیکھ بھال کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ جیسے بچے گھر کا فرد ہوتے ہیں ویسے وہ بھی...... ہمارے مذہب میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ تمہارے ماں باپ اگر اس عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف تک نہ کہو......"

فرتھ نے حیرانگی کے تاثر سے خالد کو دیکھا۔

اور

آینٹ اپنی ہی رو میں بولی۔ "آپ کی عورتوں کو اپنا کچھ احساس نہیں...... وہ

ارینجڈ شادی کر لیتی ہیں...... گھروں ہی میں رہتی ہیں...... بچے پالتی ہیں، بوڑھوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں...... ہائے...... وہ مرجاتی ہوں گی......کوئی ان حالات میں کیسے جی سکتا ہے۔"

ہم اس کی بات پر ہنس پڑے۔

خالد نے ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا یہ سب مرگئی ہیں......سب اسی دور سے گزری ہیں......عیش سے زندگی گزاری ہے سب نے......"

"اوں ہوں......ایسا ہو نہیں سکتا......اول تو ارینجڈ میرج کا تصور ہی میرے لیے ناقہم ہے۔اس پر گھروں میں بند رہنا اور......"

"نہیں اینٹ۔" نسیمی بولی۔ "تمہارا تصور غلط ہے۔ہم لوگ گھروں میں بند نہیں رہتے۔ باہر نکلتے ہیں۔ رشتہ داروں سے ملتے جلتے ہیں۔ بیاہ شادیوں اور مرگ کی تقریبوں میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ پھر آج کل کی عورت نے تو گھر، بچوں اور بزرگوں کی ذمہ داریوں کے ساتھ اور بھی تفریح کے کئی پہلو نکالے ہوئے ہیں۔ سوشل ورک کرتی ہیں۔ غریب بچیوں کی شادیاں کرواتی ہیں اور......"

"ایکسکیوزمی نسیمی باجی۔" گڈی نے کہا......"میں انہیں یہ بتانا چاہوں گی کہ ہمارے ہاں بھی عورتیں نوکریاں کرتی ہیں چونکہ غربت بہت ہے اس لیے نچلے طبقے کی تو ہر عورت گھروں میں جا کر صفائی، برتن مانجھنے، کپڑے دھونے، کوکنگ کرنے کے کام بھی کرتی ہے......بچوں کے ساتھ شوہروں کو بھی پالتی ہیں......"

"اوہ ڈونٹ ٹیل می......" اینٹ نے پھر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے......"آپ کی عورت کیا شے ہے۔ یہ عورتیں بھی شادی کرتی ہیں۔"

"جی ہاں۔" گڈی بولی۔ "ہمارے ہاں شادی کے بغیر عورت مرد کے اکٹھے رہنے کا کوئی تصور نہیں......"

"واقعی۔" وہ سب چونک کر بولیں۔

"یہ ہمارے مذہب میں بہت بڑا گناہ ہے......"

"کیا ایسا بالکل نہیں ہوتا......"

"دیکھیں...... ایسا ہو بھی تو اسے معاشرہ بری نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ انتہائی ناپسندیدہ اور گھناؤنا فعل ہے......"

"اور شادی بھی صرف ارینجڈ ہی ہوتی ہے۔"

"نہیں۔" خالد بولا۔ "اب لوگ پسند کی شادیاں کر لیتے ہیں لیکن ماں باپ کو اس میں ضرور شامل کرتے ہیں لیکن ایسا بہت زیادہ نہیں ہوتا...... اسی طرح بوڑھوں کی خدمت بھی چند لوگ ایسے ملیں گے جو ناگوار سمجھتے ہوں لیکن ہماری بڑی اکثریت اس کام کو ثواب سمجھ کر کرتی ہے۔"

☆

باتیں ہوتی رہیں کہ مسز ڈریزیلہ نے قہوے کے لیے پوچھا۔

"ضرور سب پئیں گے۔"

"لیکن۔" رقیہ بھابی نے کہا۔ "آج میں آپ سب کو قہوہ بنا کر پلاؤں گی۔ اگر اہل خانہ مائنڈ نہ کریں تو......"

شمو بولی۔ "بھابی پشاوری قہوہ بناتی ہیں بے حد لذیذ...... اگر آپ پینا پسند کریں تو۔"

"ضرور ضرور......"

"اوہ یس......" مسز ڈریزیلہ نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر کہا۔ "میرے پاس پشاوری قہوہ ہے۔ مجھے شمیم کی دوست نے ایک دفعہ دیا تھا۔ اس میں الائچی بھی ہے۔"

"ہاں۔" اینٹ بولی۔

"پھر تو میں آپ کو بالکل صحیح پشاوری قہوہ پلا سکتی ہوں۔"

رقیہ بھی۔ اینٹ اور مارگریٹ اس کے ساتھ ہیلپ کرنے کے لیے کچن میں گئیں۔

اور

پھر

جب قہوہ بن کر آیا تو الائچیوں کی مہک ہر سُو پھیل گئی......

ان لوگوں نے قہوہ اتنا پسند کیا کہ تین تین پیالیاں پی گئے۔

کچھ دیر بھابی کے قہوے کی تعریفیں ہوئیں۔

بھابی ہنس کر بولی۔ ''آپ بھی پاکستان آئیں اور میرے پاس ٹھہریں تو میں آپ کو ایسے ایسے کھانے کھلاؤں کہ آپ عش عش کر اٹھیں۔''

''واقعی رقیہ بھابی زبردست کک ہے۔'' شمو نے کہا۔

اینٹ ہنس کر بولی۔ ''پھر تو میں ایسا آدمی شادی کے لیے ڈھونڈوں گی جو مجھے آپ کا پاکستان دکھانے کی شرط پوری کرے۔''

سب اس کی بات پر ہنس پڑے۔

رات کے ایک بجے ہم نے ان لوگوں سے اجازت چاہی...... ہم نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ خلوص اور محبت کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ پھر بھی شکریہ ادا کیا۔

وہ سب ہم سے گلے ملیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے مرد بھی الوداع کہنے کے لیے گلے ملنے کو آگے بڑھے۔

لیکن

ہم نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں...... غیر محرم سے مسلم عورتیں یوں نہیں ملتیں......''

''وہ سب پھر حیران ہوئے لیکن حیرانی کو مسکراہٹ میں چھپایا۔ ہم سب نے انہیں ہاتھ اونچا کر کے الوداعی الفاظ کہے۔

اور

ہنسی خوشی واپس آنے کے لیے گاڑیوں کی طرف آئے۔ وہ سب برف کی پڑتی پھوار میں ہمیں رخصت کرنے گاڑیوں تک آئے۔

سارا راستہ ہم لوگ ان لوگوں کے خلوص، محبت اور امریکیوں کی اکثریت سے ہٹ کر رویے اپنانے کے تذکرے کرتے رہے۔

شمو ہماری باتیں سن کر بولی: ''بھئی یہاں بھی شریف لوگ ہیں۔ فیملی والے

ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے دستور ہم مسلمانوں سے کچھ مختلف ہیں۔ ورنہ شریف لوگوں کی یہاں بھی کمی نہیں......''

میں اپنی معلومات کی بنا پر جلدی سے بولی۔ ''صرف 37% ایسے لوگ ہیں۔ باقی 63% وہ ہیں جو اخلاق و کردار کی روایات کو توڑ چکے ہیں۔ مادر پدر آزاد ہیں۔ جس کے ساتھ جی چاہتا ہے رہتے ہیں، جس سے چاہیں شادی کے بغیر بچے پیدا کرتے ہیں، طلاق دینا یا لینا عام بات ہے......''

''آپا۔'' شمیم بولی۔ ''یہ سب باتیں بجا لیکن ان کے معاشرے کا حصہ ہیں۔ ان باتوں کا کوئی برا نہیں مانتا۔''

''شاید اسی لیے کہ جب کوئی پریگنٹ عورت معائنہ کے لیے ہوسپٹل جاتی ہے تو ڈاکٹر پہلا سوال یہ کرتی ہے "Are you married?" (آپ شادی شدہ ہیں؟) تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے......''

''کچھ بھی ہو۔ یہاں کے لوگ اتنے برے نہیں جتنا آپ لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ اخلاقی برائی بھی ان کے نزدیک برائی نہیں۔ انہیں غیر قانونی بچے پیدا کرنے پر شرمسار نہیں ہونا پڑتا۔ ایسے امریکن بچے بھی کسی سہولت سے محروم نہیں رہتے۔ سب کے حقوق یکساں ہیں۔ قانون کی نظر میں بچے لیگل ہوں یا ال لیگل، بچے ہی ہیں......''

''اسی لیے تو یہ برائی پھیل رہی ہے۔ قانونی گرفت ہو تو شاید بچے پیدا کرنے سے پہلے ایسے لوگ شادی کرنا ضروری سمجھیں......''

ہم

سب امریکی معاشرے پر اچھے برے تبصرے کرتے واپس گھر آ رہے تھے۔ اس معاشرے کی اچھائیاں بہت بلکہ بہت ہی زیادہ ہیں لیکن برائیاں بھی کم نہیں۔ شمیم اس بات پر مصر تھی کہ ''جب ایسی برائیاں اس معاشرے میں برائیاں گنی ہی نہیں جاتیں تو پھر آپ کو کیا تکلیف ہے؟ یہ ہمارا پاکستانی یا مسلم معاشرہ نہیں۔ ہر معاشرے کے اصول اپنے قواعد و ضوابط ہوتے ہیں...... ان کو توڑنا برائی ہے۔''

گھر قریب آ گیا تھا' اس لیے ہم چپ ہو گئے۔ میں تو ایک طرح سے معترف ہو گئی تھی کہ یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں' معاشرے میں رہ کر کرتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ ہر برائی کی جاتی ہے مگر چھپ کر...... اور سب بگاڑ کی بات یہی ہے۔

گھر پہنچتے ہی سب نے ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا۔

اور

اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔ مجھے تو خاصی تکان ہو رہی تھی۔ اس لیے آتے ہی خاصے گرم پانی سے غسل کیا۔ نماز عشاء بھی پڑھنا تھی۔ وضو کر کے باہر نکلی......

نماز پڑھی۔

گڈی پہلے ہی مصلے پر تھی۔

اس رات ہم جلدی سو گئیں۔ باتیں نہیں کیں صرف ایک دوسری کو اللہ حافظ کہا۔

-------O-------

اگلے چند دن

دعوتوں کی مصروفیت میں گزرے۔ پہلی دعوت آسیہ کے ہاں تھی۔

گڈی کے جیٹھ کی بیٹی آسیہ نیویارک کے علاقے بروک لین میں رہتی تھی' جو شمو کے گھر مونٹ ول سے کوئی گھنٹے کی ڈرائیو پہ تھا۔ شمو تو دعوت پہ جا نہ سکتی تھی کیونکہ اس کی ڈیوٹی تھی۔ خالد کہیں اور مدعو تھا۔ یعنی ہم چاروں۔ میں' رقیہ بھابی' نسیمی اور گڈی نے ہی جانا تھا۔ ہم چونکہ ہر جگہ اکٹھی ہی جاتی آتی تھیں۔

اس لیے

خالد نے مذاق میں ہمیں Four Golden Girls (فور گولڈن گرلز) کہنا شروع کر دیا تھا۔ جب بھی ہم جانے کے لیے تیار ہو کر اکٹھی ہوتیں۔ "آج فور گولڈن گرلز کی چڑھائی کدھر ہو رہی ہے۔" وہ ہنس کر ضرور کہتا۔

آسیہ کے شوہر نے ہمیں اپنے گھر لانے کے لیے اپنے ایک دوست جو ٹیکسی ڈرائیور تھا سے کہہ دیا تھا' اسے راستہ بھی سمجھا دیا تھا اور ہمیں کہہ دیا تھا کہ ٹھیک ساڑھے سات ٹیکسی ہمیں لینے آ جائے گی۔

چنانچہ ہم چاروں سات بجے ہی تیار ہو کر بیٹھ گئیں۔

لیکن

ٹیکسی ساڑھے سات چھوڑ آٹھ بجے بھی نہ آئی۔

پھر ساڑھے آٹھ ہو گئے تو گڈی نے آسیہ کے ہاں فون کیا "آسیہ تمہاری ٹیکسی تو

یہاں ابھی تک نہیں پہنچی۔"

آسیہ نے جواب دیا: "چچی جان ویری سوری' دراصل سجاد کو راستہ بھول گیا اور وہ بالکل الٹی سمت چلا گیا۔ اس طرف اتفاق ہی کی بات ہے کہ وہ پہلے کبھی نہیں گیا۔ اس نے موبائل پر ہمیں گھر نہ ملنے کی اطلاع دی ہے۔ اسے صحیح راستہ بتا تو دیا ہے لیکن جہاں وہ پہنچ چکا ہے' وہاں سے آتے آتے بھی پون گھنٹہ لگ جائے گا......"

"لو جی۔" ہم نے گڈی کی بات سن کر کہا۔

آصف جو تھوڑی دیر پہلے آیا تھا بولا۔ "یہاں راستہ بھول جائے تو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ لگتا ہے اسی کی طرح وہ بھی نقشہ گاڑی میں نہیں رکھتا ہوگا۔" ہم سب ہنس پڑے۔

شیمو اکثر غلط سڑک پر چڑھ جاتی تھی اور میلوں راستہ طے کر کے واپس لوٹا کرتی تھی۔ آصف نے کئی بار سڑکوں کے نقشے لا کر اس کی گاڑی میں رکھے لیکن اس نے کبھی نقشے دیکھے ہی نہیں......

ایک دفعہ کسی مہمان کو ایئرپورٹ چھوڑنے گئی تو بالکل الٹی سمت چلی گئی۔ بہت دور جا کر پتہ چلا کہ غلط راستے پر جا رہی ہے۔

امریکہ میں واپس مڑنا بھی کوئی آسان نہیں۔ پاکستان کی طرح نہیں ہوتا کہ جہاں جی چاہا گاڑی موڑ لی۔ یا ون وے ٹریفک ہے تو جہاں دوسری سڑک پر جانے کے لیے تھوڑا سا کٹ بھی ملا۔ گاڑی سڑک پر لے آئے۔

وہاں اگر آپ نے غلط لائن لے لی ہے تو پھر آپ کو چلتے جانا پڑے گا حتیٰ کہ کہیں ایگزٹ کا بورڈ نظر آ جائے اور آپ سائیڈ لین میں اتر جائیں۔ پھر اس سائیڈ لین پر چلتے یا تو کسی پل کے اوپر یا سڑک کے نیچے سے کراس کر کے مخالف سڑک پر آ جائیں۔

ایگزٹ کا بورڈ ایک جگہ نہیں دو جگہ نہیں تین جگہ تھوڑے تھوڑے وقفے پر لگا ہوا ہے یعنی آپ نے سائیڈ لین پر اترنا ہے اور پہلا ایگزٹ نہیں دیکھ پائے تو دوسرا ایگزٹ جو چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا' وہ دیکھ لیں اور سائیڈ لین پر آ جائیں۔

وہ بھی مس ہو جائے تو پھر تیسرے ایگزٹ سے شاہراہ سے سائیڈ لین پر اتر آئیں۔

اس سے زیادہ سہولت اور کیا ہو سکتی ہے۔

امریکہ میں سڑکوں کا نظام قابل رشک ہے۔ ہائی ویز ہوں' چھوٹی سڑکیں یا سائیڈ لینز' سب پختہ ہموار اور بغیر کسی کھڈے اور ٹوبے کے ملیں گی' ہم جس طرح فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارا نہری نظام (گو انگریزوں کا بنایا ہوا) دنیا بھر میں نمبر ون ہے۔

اسی طرح امریکہ میں شاہراہوں اور چھوٹی بڑی سڑکوں جیسا نظام شاید دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ امریکی ریاستیں ہائی ویز سے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ بعض بڑے شہروں کے اندر سے بھی گزرتی ہیں۔ شہروں اور قصبوں کے اندر چھوٹی سڑکیں بھی جو ہماری بڑی سڑکوں سے بھی زیادہ کشادہ ہیں' ہموار اور پختہ ہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی سڑک کہیں سے اکھڑی ہو یا اس میں گڑھا پڑ گیا ہو۔ ایسا ہو تو فوراً سے پیشتر مرمت کر دی جاتی ہے۔ سڑکوں پر جو پل ہیں وہ بھی مضبوط اور قابل تعریف ہیں۔ بعض جگہ تو دوہرے تہرے پل ہیں یعنی ٹریفک ہر طرف سے آسانی سے آتی جاتی رہتی ہے۔ کہیں رک کر میلوں لمبی لائنیں نہیں بن جاتیں۔

کبھی کبھار ایکسیڈنٹ ہو جائے یا گاڑی خراب ہونے کی صورت میں رک جائے تو ٹریفک کا رخ موڑ دیا جاتا ہے۔ اس لیے لمحوں کی تاخیر بھی نہیں ہوتی اور ٹریفک چلتی رہتی ہے۔ اس کے لیے سائیڈ لینز ہر بڑی سڑک کے ساتھ ضرور ہوتی ہیں......

ٹریفک کا نظام دیکھا جائے تو وہاں بڑا ہی پیچیدہ ہے لیکن اس پیچیدگی کو امریکنوں نے اتنی سہولت سے حل بنایا ہوا ہے کہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔

جگہ جگہ بورڈ پوری معلومات کے ساتھ آویزاں ہیں۔ تیروں کے نشان راستہ بتاتے ہیں...... جس شہر یا قصبے کی طرف مڑنا ہو وہاں ایگزٹ بنے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں چونکہ الٹے ہاتھ ڈرائیونگ ہوتی ہے اس لیے ایگزٹ یا سڑک سے نکلنے کے راستے بھی بائیں ہاتھ ہوتے ہیں۔ دائیں طرف مڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دائیں ہاتھ منزل

مقصود ہے تو بائیں ہاتھ کی سائیڈ لین میں اتریں۔ پھر اس پر چلتے جائیں۔ جہاں اوپر سے گزرنے یا نیچے سے اس سمت جانے والا پل ملے اس سے صحیح راستے پر جائیں۔

وہاں ٹریفک کے اتنے جامع اصول ہیں اور ان اصولوں پر لوگ اتنی پابندی سے چلتے ہیں کہ کہیں ٹریفک کے گڈمڈ ہونے یا لمبی قطار بن کر گھنٹوں رکے رہنے کی نوبت نہیں آتی۔ ہر شاہراہ یا ہائی وے کی رفتار مخصوص ہے۔ کسی جگہ پچپن میل فی گھنٹہ کہیں چالیس اور کہیں تیس پینتیس میل فی گھنٹہ ہے۔ شہروں میں جانے والی سڑکوں کی حد رفتار بھی متعین ہے۔ آپ اس میں کمی بیشی کریں گے تو ٹریفک پولیس راڈار سے رفتار نوٹ کر لے گی۔ آپ کا پیچھا کرے گی اور قانون کی خلاف ورزی پر آپ کو ٹکٹ مل جائے گا۔

سڑکوں پر بتیوں کے اشارے بھی ہیں جن پر آپ کو اگر اشارہ بند ہے تو رکنا پڑے گا چاہے دوسری طرف سے سڑک خالی ہو...... چوراہوں پر بھی اشاروں پر رکنے کے واضح نشان ہوتے ہیں۔ بتیاں راستہ کھولنے اور بند کرنے کا اشارہ دیتی ہیں۔ چوراہے پر چاہے صرف آپ ہوں اور تینوں سڑکیں خالی ہوں تو جب تک آپ کو بتی اشارہ نہ دے آپ کو رکنا پڑے گا۔

امتاز بردست ٹریفک کا نظم و نسق دیکھ کر اپنے ہاں کی ٹریفک یاد کر کے بہت دکھ ہوتا تھا۔ اشاروں کی پروا کرنا تو اکثر لوگ اپنی شان کے منافی سمجھتے ہیں۔ زن سے گزر جاتے ہیں۔ حد رفتار متعین ہی نہیں۔ رش میں سے یوں گاڑیاں نکال کر لے جاتے ہیں جیسے سرکس کے تماشا کرنے والے ہوں۔ بھلے کسی سے ٹکر ہو جائے۔ کسی کی گاڑی لگ جائے۔ کوئی سائیکل سوار مجروح ہو جائے۔ کوئی پیدل جانے والا کچلا جائے۔ گاڑی اڑانے والا بغیر پروا کیے گزر جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر معاملے میں اتنی بے اصولیاں ہوتی ہیں کہ ہمارا مزاج ہی بے اصولا ہو گیا ہے۔ وہ بات ہے کہ

اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی......

اپنے ملک میں رہتے ہوئے ان چیزوں ان خلاف ورزیوں ان بے ترتیبیوں اور دھکم پیل کا احساس تو ہوتا ہے لیکن دوسرے ملک میں جا کر قومی سطح پر جتنی ندامت ہوتی

ہے بیان نہیں کی جا سکتی۔ افسوس ہوتا ہے کہ ہم اتنے گر چکے ہیں کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال نہیں رکھ سکتے۔ اصول اپنانے میں تو کوئی پیسہ نہیں لگتا...... بے شک ہم غریب لوگ ہیں لیکن اصول و ضوابط تو اپنا سکتے ہیں۔ یہاں تو دیکھا ہے کہ زیادہ پیسے والے اور پڑھے لکھے لوگ ہی اصول توڑنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ خاص کر وہ نوجوان جنہیں نودولتیے کہا جا سکتا ہے۔ وہ تو ایسا کرنے میں اپنی شان کا اظہار سمجھتے ہیں۔

امریکہ میں بھی من چلے کھلنڈرے اور بگڑے ہوئے نوجوان حد رفتار کو توڑنے میں بڑائی محسوس کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے کیونکہ ٹریفک پولیس کے راڈار رفتار نوٹ کرنے میں چوکتے نہیں۔

ایسے نوجوانوں نے اپنی گاڑیوں میں راڈار ڈیٹکٹر لگا رکھا ہوتا ہے جو پولیس کے راڈار کے قرب و جوار میں پہنچنے سے پہلے ہی سائرن بجا کر گاڑی چلانے والے کو مطلع کر دیتا ہے کہ پولیس راڈار قریب آ رہا ہے۔ سو وہ اپنی رفتار فوراً مقرر کردہ حد تک لے آتے ہیں اور پولیس سے بچ کر نکل جاتے ہیں لیکن ایسے منچلے دو چار فیصد سے زیادہ نہیں۔ لاکھوں امریکی عوام اصول کو توڑنے والے نہیں ہوتے۔ ایسے بے اصول لونڈوں کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے......

امریکہ میں بے انتہا کاریں ہیں...... ہر بالغ بندے کے پاس کار ہے۔ زیادہ کاریں رکھنے کے شوقین بھی ہیں۔ وہاں کمپنیاں ان کاروں کو بالکل تھوڑے معاوضے پر انشور کرتی ہیں اور کبھی کبھار انہیں حادثہ پیش آ جائے یا کوئی ہائی وے پر خراب ہو کر رک جائے تو کمپنیاں انہیں اس کے لیے بہت معقول معاوضہ دیتی ہیں۔

امریکہ میں اوورٹیکنگ بھی ممنوع ہے۔ اگر کسی نے تیز جانا ہے تو اسے سائیڈ لین پر اترنا پڑتا ہے۔ یہاں وہ تیز رفتاری دکھا سکتا ہے اور پھر جہاں شاہراہ خالی نظر آتی ہے گاڑی سڑک پر لے آتا ہے۔ اس طرح وہ اوورٹیکنگ کیے بغیر دوسری گاڑیوں سے آگے نکل جاتا ہے۔

امریکہ میں ہارن دینے والے کو بھی آگے والا برا سمجھتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے

ٹریفک رک جائے اور گاڑیوں کی لائنیں لگ جائیں تو بھی لوگ ہارن دینے سے گریز کرتے ہیں۔ نہ ہی اِدھر اُدھر سے نکل کر آگے آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلکہ

بڑے سکون اور صبر سے ٹریفک کے چالو ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اپنے ہاں کی ٹریفک کا خیال آتا ہے۔ بدنظمی' افراتفری' آگے نکلنے کی کوشش اور پھر سڑکوں کی زبوں حالی...... فٹ پاتھوں تک آئی ہوئی دکانیں' ریڑھیاں...... سڑکوں کا زیادہ حصہ ان چیزوں نے روکا ہوتا ہے۔ لوگ سڑکوں کے درمیان میں پیدل چلنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سائیکل ہمارے ہاں کی عوامی سواری ہے جو رش میں سے گزرے تو حادثے کا احتمال ہوتا ہے۔ ویگنیں سواریاں اٹھانے کے لیے جگہ جگہ رک جاتی ہیں۔ کنڈیکٹر دروازے سے باہر لٹکا ہوتا ہے۔ بسیں شہر کی اندرونی سڑکوں پر بھی تیز رفتاری سے چلتی ہیں۔ خدا ہی کا آسرا ہوتا ہے جو بندہ ٹریفک کی اس بدنظمی سے بچ کر شام کو صحیح سلامت گھر پہنچ جاتا ہے۔

حادثے بھی تو کچھ کم نہیں ہوتے۔ لمحوں میں خاندانوں کے خاندان اجڑ جاتے ہیں۔

لیکن

اس بات کا کوئی اثر نہیں لیتا۔ نہ ہی اس سلسلے میں کوئی احتیاطی تدابیر کی جاتی ہیں۔ کرے کون...... جبکہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ ہم جیسے لوگ جو کچھ کر سکنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے' اس بے حسی پر دل جلاتے رہتے ہیں۔ امریکہ میں ایسا نظم وضبط ہے' اتنا عمدہ سسٹم ہے' لوگ اتنے قانون اور اصولوں کے پابند ہیں' سڑکیں اتنی عمدہ ہیں' کوئی پیدل انسان ہائی وے پر نظر نہیں آتا۔ کوئی جانور تیز رفتار ٹریفک کے راستے میں اچانک نہیں آٹپکتا بلکہ کسی بھی سڑک پر چاہے وہ ہائی وے ہے چاہے چھوٹی کسی جانور حتیٰ کہ کتے تک کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امریکی کتے' بلیاں پالنے کے شوقین ضرور ہیں لیکن قواعد وضوابط کے ساتھ...... وہ انہیں مادر پدر آزاد نہیں چھوڑ دیتے۔

ہائی ویز یہاں شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی ہیں۔ سب سے بڑی اور خوبصورت ترین ہائی وے کیلیفورنیا میں ہے۔ انتہائی کشادہ صاف شفاف اور ہموار سمندر

کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے عمدہ ہائی وے ہے۔

لمبی شاہراہوں پر جگہ جگہ ریسٹورنٹ' موٹل' پارک بنے ہوئے ہیں۔ باتھ روم بھی مع سازوسامان اور صفائی کے موجود ہوتے ہیں۔ غرضیکہ امریکی ہائی ویز کسی عجوبے سے کم نہیں۔

ہاں

تو

میں ذکر کر رہی تھی آسیہ کے ہاں دعوت پہ جانے کا۔ سات بجے سے تیار بیٹھے ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈرائیور راستہ بھول گیا تھا اور جب آسیہ کے خاوند نے اسے صحیح سمت بتائی اس وقت رات کے نو بج چکے تھے۔

بہرحال

وہ رات سوا نو بجے شمیم کے گھر پہنچا اور ہم چاروں اس وقت آسیہ کے ہاں بروک لین جانے کے لیے نکل آئے۔ سردی آج بھی بلا کی تھی لیکن ٹیکسی میں ہیٹر چل رہا تھا۔ اس لیے ٹھنڈ کا کچھ زیادہ احساس نہ ہوا۔

ڈرائیور پاکستانی تھا۔ آسیہ کے شوہر کا دوست بھی۔ خاصا معقول اور شریف انسان تھا۔ اس نے بڑی معذرت کی۔ اس طرف وہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور اتفاق سے گاڑی میں سڑکوں کا نقشہ بھی نہیں تھا کیونکہ یہ ٹیکسی اس کی نہیں کسی اور سے مانگ کر لایا تھا۔

اس بے چارے کا کیا قصور۔ ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں تاکہ وہ شرمندگی کے احساس سے چھٹکارا پا سکے۔

میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ نسیم گُڈی اور رقیہ بھابی پچھلی پر۔ میں ڈرائیور سے باتیں کرنے لگی۔

''آپ کا نام؟'' میں نے پوچھا۔

''اعظم بھٹی۔''

''کہاں کے رہنے والے ہیں؟''

"لاہور کے۔"

"امریکہ میں کب آئے؟"

"آٹھ سال پہلے۔" اس نے کہا۔ پھر خود ہی بولا۔ "آیا تو کاروبار کرنے تھا لیکن تجربہ بالکل نہ تھا اس لیے پیسہ ضائع کر دیا اور کام کچھ بھی نہ بنا۔ آخر میں یہی کیا کہ ٹیکسی لے لی۔ وہی چلا رہا ہوں۔ اچھی انکم ہو جاتی ہے۔ نیویارک میں سینکڑوں پاکستانی مختلف تجربے کرنے کے بعد یہی کام کر رہے ہیں......"

"ہوں۔"

"ہم لوگ امریکہ آنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہاں شاید ڈالر درختوں سے لگتے ہیں۔ محنت کے بغیر پیسہ کمانے کی عادت کے رسیا ہوتے ہیں اپنے ملک میں۔ لیکن یہاں آ کر سہانے خواب جس طرح بکھرتے ہیں کچھ نہ پوچھیں۔ بغیر مقصد کے جو منہ اٹھائے یہاں آ جاتے ہیں اپنا وطن اپنے لوگ اپنے عزیز رشتہ دار سب قربان کر دیتے ہیں۔"

"اپنے وطن اپنے لوگوں اور اپنے عزیزوں کو یہاں پر کوئی مس کرتا ہے۔ لاکھوں سہولتوں کے باوجود یہاں آ کر لوگ تنہائی کے کرب سے ضرور گزرتے ہیں......"

"بس جی کچھ نہ پوچھئے...... پیسہ تو یہاں ہر کوئی کسی نہ کسی طرح کما لیتا ہے۔ محنت کا بھی عادی ہو جاتا ہے۔ لیکن وطن اور عزیزوں سے دوری انسان کو بڑا حساس بنا دیتی ہے۔"

"آپ ان آٹھ سالوں میں پاکستان گئے بھی......"

"ایک دفعہ بھی نہیں...... پھر جاؤں کیسے...... میرے پاس تو گرین کارڈ بھی نہیں۔"

میں چونکی۔

نسیمی پیچھے سے بولی۔ "آپ آٹھ سال سے گرین کارڈ کے بغیر یہاں کیسے رہ رہے ہیں۔"

"او جی...... رہ لیتے ہیں۔ مجھ جیسے کئی ہیں۔"

"حکومت کو پتہ نہیں چلتا......"

"چل جائے تو جہاز پر چڑھا دیتے ہیں۔ نہ چلے تو یوں ہماری طرح پیسہ کماتے رہتے ہیں۔"

"بری بات ہے۔"

"باجی جی...... بڑے لوگ ہیں ہماری طرح کے۔ کئی تو گرین کارڈ حاصل کرنے کے لیے یہاں کی سٹیزن عورتوں سے شادیاں بھی کر لیتے ہیں۔ کئی پیپر میرج کر کے گرین کارڈ حاصل کر لیتے ہیں...... لیکن یہ دونوں طریقے ہی ٹھیک نہیں......"

"اور چوری چھپے یہاں رہنا بھی تو ٹھیک نہیں......"

"کیا کریں؟ وہاں واپس جا کر بھی حال مندہ ہی ہوتا ہے۔ جو جمع پونجی ہوتی ہے لے کر یہاں آ جاتے ہیں۔ وہ ضائع کر کے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ یہی ٹیکسیاں چلائیں مزدوریاں کریں چھپ چھپ کر...... اب اگر میں واپس اپنے ملک جانا بھی چاہوں تو وہاں کیا کروں گا...... نہ محنت کا پھل ملتا ہے نہ نوکری...... میرے دو بھائی بی اے پاس ہیں۔ ایک تو کلرک ہے دوسرا بیکار......"

وہ کافی دیر اپنی ہی باتیں کرتا رہا۔

ہم نیویارک جا رہے تھے۔ رات تھی۔ روشنیوں کی بھرمار تھی۔ ٹریفک بھی بہت تھی اس لیے پتہ نہ چل رہا تھا کہ یہ آدمی ہمیں کس کس راستے سے کہاں لے جا رہا ہے۔

ہمیں کچھ کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا۔ چار اکیلی عورتیں ایک انجان آدمی کے ساتھ رات گئے انجانی جگہ جا رہے تھے۔

لیکن

حوصلہ بھی ہو گیا۔ جب آسیہ کے خاوند نے اس شخص سے موبائل پر بات کی۔ وہ سب ہمارا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔

خیر

ہم کئی کشادہ سڑکوں سے گزرے۔ پلوں کے کبھی نیچے سے کبھی اوپر سے ٹیکسی

گزری۔ بروک لین ہی کا شاید ایک علاقہ تھا جہاں ہم نے ایک جہاز کو پل کے اوپر لینڈ کرتے دیکھا۔

نیچے سے بڑی بڑی سڑکیں دو طرفہ ٹریفک کے لیے تھیں۔ اوپر پل سا بنا تھا جو پل نہیں رن وے تھا۔ ہمیں دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ انوکھا رن وے جو نظر آیا تھا۔

ہم اس رن وے کے نیچے سے بھی گزرے۔ پھر سڑک دائیں ہاتھ مڑ گئی۔ کئی دائیں بائیں موڑوں کے بعد آخر ہم اس انتہائی اونچی بلڈنگ کے سامنے رکے جس میں آسیہ کا فلیٹ تھا۔ گاڑی سے نکل کر اس بلڈنگ کی اونچائی کو دیکھا تو خوف آ گیا۔ اتنی بلند بلڈنگ۔ خدا جانے اس میں کتنے سو فلیٹ تھے۔

ڈرائیور کے پیچھے ہم فٹ پاتھ پر آئے۔

اس نے بلڈنگ کے بند دروازے کا ایک بٹن دبایا۔ دروازہ کھلا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک چوکور سا کمرہ تھا۔ اس کے ایک کونہ میں ایک بنچ پر ایک موٹا تازہ کالا نیلی وردی میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے اس کا نام پوچھا۔ پھر اندر والے کوریڈور کی طرف اشارہ کیا۔

ہم ڈرائیور کے پیچھے کوریڈور میں آئے۔ یہ ایک خاصا لمبا کوریڈور تھا۔ کوئی دس فٹ چوڑا بھی تھا۔ دونوں طرف بڑے بڑے گملوں میں سرسبز پودے لہرا رہے تھے۔

ہم چند قدم چلے۔

ڈرائیور ایک دروازے کے سامنے رکا اور بٹن دبایا۔ یہ لفٹ تھی۔ اس کے کھلتے ہی ہم سب اندر داخل ہوئے۔ وہاں ایک دبلا پتلا امریکن سٹول پر بیٹھا تھا۔ اس نے ہم پر سرسری نظر ڈالی اور پوچھا: "کس منزل پر؟"

ڈرائیور نے کہا: "بارہویں......"

اس نے بٹن دبایا اور چند سیکنڈ بعد لفٹ بارہویں منزل پر رک چکی تھی۔ دروازہ کھل گیا۔ گورے نے ہمیں باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

ہم باہر نکل کر اسی طرح کے کوریڈور میں آ گئے۔ چند گز دائیں ہاتھ چلے۔ چند بند

دروازے گزرے۔ پھر اس نے ایک دروازے کی بیل بجائی۔

دروازہ کھلا اور آسیہ اپنے شوہر کے ساتھ لپک کر باہر آئی۔ وہ وہیں ہم سب سے گلے ملی۔ گڈی اس کی بچی تھی۔ اس کو تو اس نے لپٹ لپٹ کر پیار کیا۔

اس کے میاں نے بھی سب کو سلام کیا اور ڈرائیور کے راستہ بھولنے پر معذرت کی۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔

آسیہ کا فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک طرف کچن تھا۔ سامنے چھوٹا سا کمرہ نما ریسپشن تھا۔ شاید ادھر ہی باتھ روم بھی تھا۔ اس فلیٹ کی کل یہی مکانیت تھی۔ ایک کمرہ وہ بطور لیونگ روم اور دوسرا بیڈ روم کے استعمال کرتے تھے۔ یہ بھی ایک پڑھے لکھے ٹیکسی ڈرائیور کا گھر تھا جو چند سال پہلے کافی پیسہ لے کر یہاں بزنس کرنے آیا تھا لیکن ناتجربہ کاری سے مار کھائی۔ وہ گریجوایٹ تھا' بہت ملنسار اور ہنس مکھ جوان۔ لاہور میں اس کے ماں باپ کی ایک کنال کی کوٹھی ڈیفنس میں تھی لیکن وہ یہاں کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ دو تین سال پہلے آسیہ سے شادی ہوئی تھی۔ اس کے پاس امریکن نیشنلٹی تھی۔ اس لیے یہاں رہنے یا پاکستان آنے جانے میں کوئی دقت نہ تھی۔ اسے ایک امریکن سٹیزن کی طرح کی ہر سہولت حاصل تھی۔ ٹیکسی سے کمائی اب خاصی تھی۔ یہ اس کے گھر کی چیزوں سے صاف عیاں تھا۔

فلیٹ چھوٹا سا تھا' لیکن بڑا آرام دہ۔ سنٹرلی ہیٹڈ تھا۔ اس لیے ہم لوگوں نے آتے ہی گرم کپڑے یعنی کوٹ' سویٹر اور شالیں اتار دیں......

آسیہ نے چند اور پاکستانی دوستوں کو بھی مدعو کیا ہوا تھا...... اس کی ایک دوست خاصی تیز اور باتونی تھی۔ پراپرٹی ڈیلنگ کا کام کرتی تھی۔ وہاں اس کام کے لیے لائسنس حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے جو اس کے پاس تھا۔ خاصی کامیابی سے پراپرٹی کی خرید و فروخت کرتی تھی۔ فالتو وقت میں پاکستانی بچوں کو اسلامی تعلیم کا درس بھی دیتی تھی۔

آسیہ نے جو کھانا بنایا تھا اس میں غالباً کوئی چیز نہ چھوڑی تھی۔ لیونگ روم ہی میں چادر بچھا کر کھانا چنا گیا۔ سب قالین پر بیٹھ گئے۔

کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ امریکہ میں بس جانے والے یہ لوگ ہم پاکستانیوں سے مل کر اس طرح خوش ہو رہے تھے جیسے اپنے عزیز و اقارب سے مل رہے ہیں۔ جتنی دیر ہم وہاں بیٹھے پاکستان ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔

گڈی کو آسیہ نے ایک دن اور اپنے ہاں روک لیا۔ ہم تینوں سب سے مل کر خدا حافظ کہتے ہوئے اسی ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ واپس ہوئے۔

راستہ میں باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے بار بار آسیہ کے فلیٹ تک پہنچانے والی لفٹ کا خیال آ رہا تھا۔ صرف بیل دینے پر لفٹ مین نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا' کہ ہم کون ہیں کہاں سے آئے ہیں' کس سے ملنا ہے۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور جس کا نام اعظم تھا' پوچھا: ''ان فلیٹوں میں جو لفٹ سسٹم ہے اس میں جو بندہ چاہے اندر داخل ہو سکتا ہے۔ کیا اس طرح چوری' ڈکیتی کے واقعات ہونا ممکن نہیں۔ لفٹ مین تو بے نیاز سا بیٹھا تھا۔ بارہویں منزل کا کہا تو اس نے سب کو بارہویں منزل تک پہنچا دیا۔ کوئی سوال کیا نہ بات...... اس طرح چور ڈاکو بھی آسانی سے کسی بھی فلیٹ تک پہنچ سکتے ہیں......''

اعظم بولا۔ ''باجی ایسا اکثر تو نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی ہو بھی جاتا ہے۔ چوری' ڈکیتی' ریپ اور قتل کی وارداتیں ہو جاتی ہیں......''

''پھر تو یہاں رہنا خطرے کی بات ہے۔''

''نہیں ایسی بات نہیں۔ ہر فلیٹ والا اندر سے دروازہ بند رکھتا ہے۔''

''بعض اوقات سب گھر والے باہر گئے ہوتے ہیں۔ دروازہ مقفل ہی ہوتا ہوگا۔''

''پھر لاک توڑا بھی جا سکتا ہے۔ یوں چوری ہو جاتی ہے۔''

''لیکن میں نے کہا نا اکثر نہیں کبھی کبھار ایسی بات سننے میں آتی ہے...... ویسے نیویارک میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ خوبیاں خامیاں برابر چل رہی ہیں یہاں......''

''کیوں؟'' نسیمی نے سوال کیا۔

''اس لیے بہن جی کہ نیویارک میں دنیا کے ہر خطے کے ہر نسل کے لوگ موجود

ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ کام صرف امریکن ہی کریں۔ بدنام زمانہ کالے ایسے کاموں میں ملوث ہیں اور بھی کئی ملکوں کے لوگوں کے نام آتے ہیں۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔''

ہم لوگ رات دو بجے کے قریب گھر پہنچے۔ آسیہ اور اس کے شوہر کے علاوہ چند اور پاکستانیوں سے مل کر خوشی ہوئی تھی۔ ساتھ اعظم کی باتوں سے اس معاشرے کی کئی برائیوں کا ہم پر انکشاف بھی ہوا تھا۔ جس سے ہم لوگ اب تک بے خبر تھے۔ راستہ بھر اس نے بہت سی باتوں کا انکشاف کیا تھا۔ ایسی ایسی باتیں سنائیں جن کا ہم تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔



دو دن بعد حمیرا آ گئی۔ وہ ہمیں اپنے ہاں لے جانے کے لیے آئی تھی۔ وہ نسیمی سے بھی ناراض تھی۔ ''امی آپ خود بھی یہاں بیٹھ گئی ہیں اور رقیہ خالہ' گڈی خالہ اور مامی کو بھی روک رکھا ہے۔''

''آئے ہائے۔'' نسیمی نے کہا۔ ''میں نے انہیں کب روکا ہے۔ شیمو ہی جانے نہیں دیتی۔ آسیہ کے گھر بھی چند گھنٹوں کے لیے گئے۔ بشرہ روز فون کرتی ہے۔ ایک دفعہ لینے بھی آئی......''

''آپ کچھ کہیں' میں آج آپ کو لے کر جاؤں گی۔'' حمیرا نے کہا۔ پھر ہم سب سے بولی۔ ''چلیں اپنے اپنے بیگ لیں۔ کم از کم ایک ہفتہ آپ لوگوں نے میرے پاس رہنا ہے۔ اسی حساب سے کپڑے رکھ لیں۔''

''اتنے دن نہیں حمیرا......'' گڈی بولی۔

''کیوں نہیں...... آپ چلیں تو سہی۔''

خیر

تھوڑی بہت بحث و تکرار کے بعد ہم نے اپنے اپنے بیگ لیے اور ضرورت کے کپڑے ان میں رکھ لیے۔ میں نے اپنی دوائیوں والا چھوٹا سا چرمی بیگ کھول کر دیکھا۔ ساری دوائیاں چیک کیں۔ پھر بیگ میں یہ بٹوہ نما چھوٹا بیگ بھی رکھ لیا۔

اب ہم چاروں حمیرا کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھے۔ گڈی کا بیٹا احمد گھر پہ ہی تھا۔ اسے ہم نے بتا دیا کہ شمیم کو بتا دے ہم تین چار دن کے لیے حمیرا کے ہاں جا رہے ہیں۔

حمیرا بہت خوش تھی۔ ہمارا سامان اپنی کار کی ڈگی میں رکھا۔ مجھے اگلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ گڈی' رقیہ اور نسیمی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

''ایک بات بتا دوں؟'' حمیرا نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سٹیئرنگ پکڑا۔

''کیا؟''

''میں نے پہلے نیویارک سٹی جانا ہے۔ آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''اعتراض کیسا۔ ہم تمہارے ساتھ جا رہے ہیں۔ جہاں چاہے لے چلو۔'' رقیہ نے کہا۔

''مفت کی سیر میں اعتراض کی گنجائش نہیں ہوتی۔'' گڈی ہنس کر بولی۔

''ٹھیک۔'' حمیرا نے گاڑی چلا دی۔ وہ اپنی چھوٹی سی بیٹی انوش کو گھر پہ اپنے میاں نوفل کے پاس چھوڑ آئی تھی۔

نسیمی نے اس سے کہا: ''زیادہ دیر نیویارک سٹی کی سیر نہ کرانا' کہیں انوش روتی نہ رہے۔''

''نہیں روتی امی۔ آج اتفاق ہی سے نوفل گھر پہ تھے۔ اس لیے اسے چھوڑ آئی۔ بابا کے ساتھ وہ بہت خوش رہتی ہے......''

باتیں کرتے ہوئے ہم چھوٹی سڑکوں سے ہوتے ہوئے بڑی سڑک پر آ گئے۔ یہاں سے حمیرا نے دوسرے ایگزٹ سے مین روڈ پر آنا تھا۔ امریکہ میں لیفٹ ہینڈ ڈرائیو ہے اس لیے سارے ایگزٹ لیفٹ ہینڈ ہی پہ ہوتے ہیں۔

حمیرا نے دوسرے ایگزٹ پر اس سڑک کو چھوڑا۔ تھوڑی دیر سائیڈ لین میں چلتی گئی۔ پھر ہائی وے پر آ گئی۔

حمیرا کے ہاں ہم دریائے ہڈسن پر بنے تین میل لمبے پتھری برج پر سے گزر کر گئے تھے لیکن آج دوسرا روٹ تھا کیونکہ اس نے نیویارک شہر میں جانا تھا۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے ہمیں سڑکوں کے نام بتا رہی تھی۔ جو پل آتا اس کے متعلق بھی بتاتی۔ راستے میں سڑک کے عین درمیان میں بڑی ٹیکس چوکیوں پر رکتے ہوئے ٹول ٹیکس دیتے ہوئے بھی

بتاتی کہ ہر چوکی پر چار پانچ ڈالر ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے۔

ہم گوتھل برج کے بعد جارج واشنگٹن برج سے بھی گزرے۔ لنکن ٹنل بھی آئی۔ پھر ہم نیویارک میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی حمیرا نے چار ڈالر فی کس کے حساب سے ٹیکس دیا۔

''اتنا ٹیکس؟'' میں نے کہا۔

وہ مسکرائی اور بولی۔ ''ہاں رضیہ خالہ یہ ٹیکس دینا ضروری ہوتے ہیں۔ نیویارک میں داخل ہونے پر ہر شخص کو چار ڈالر ٹیکس دینا ہوتا ہے۔ سب لوگ دیتے ہیں۔ ایک بات ہے لوگ ٹیکس دیتے ہیں تو پھر یہ دیکھتے بھی ہیں کہ ان کا دیا ہوا ٹیکس کس کس جگہ اور کیسے کیسے استعمال ہوا ہے...... '' وہ ہنس کر بولی۔ ''یہاں نہ کوئی ٹیکس سے بچتا ہے نہ یہ ٹیکس کوئی ہضم کر جاتا ہے۔''

حمیرا نے دو ایک کام کرنا تھے۔ اس لیے ہمیں ففتھ ایونیو پہ اتار کر بولی۔ ''آپ یہاں گھومیں پھریں۔ ونڈو شاپنگ کریں یا کچھ خریدنا ہو تو خریدیں' میں ایک گھنٹے بعد آپ کو یہیں سے لے لوں گی......''

عورتیں شاپنگ کی دیوانی تو ہوتی ہی ہیں۔ اس لیے سب خوشی خوشی گاڑی سے اتر گئیں اور حمیرا گاڑی لے کر اپنے کام کے لیے چلی گئی۔

نیویارک اتنا بڑا شہر ہے کہ اسے چند دنوں میں دیکھ لینا ممکن ہی نہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر اتنا طویل و عریض ہے کہ اسے کسی ملک کے برابر کہا جا سکتا ہے۔ نیویارک سٹی ہی تقریباً تین سو مربع میل پر محیط ہے۔ اضافی آبادیاں اس کے علاوہ ہیں۔ یہ شہر جیسا کہ میں شروع میں بیان کر چکی ہوں' پانچ علاقوں مین ہیٹن' بروک لین' کوئنز' دی برونکس اور سٹیٹن آئی لینڈ پر مشتمل ہے۔ کسی زمانے میں یہ الگ الگ شہر تھے لیکن پلوں اور سڑکوں کے ذریعے ایک ہی شہر بنا دیا گیا ہے۔ نیویارک اپنی طرز کا انوکھا اور منفرد شہر ہے۔ یہاں دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ بھی بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ اس کی آبادی اگر اضافی بستیوں کو بھی ملا لیا جائے تو دو کروڑ سے بھی زیادہ ہوگی۔ یہ شہر عمودی بھی ہے' عروضی بھی......

بیشمار عمارتیں سیدھی کھڑی آسمان سے باتیں کرتی نظر آئیں گی...... سیدھی پھیلی ہوئی بھی ان گنت عمارتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ نیویارک سٹی کے تقریباً بارہ ایونیو ہیں جنہیں متوازی سٹریٹ کاٹتی چلی جاتی ہے۔ ایونیو بھی متوازی ہیں...... سٹریٹ سینکڑوں ہیں۔ یہاں کسی جگہ بھی پتہ معلوم کرنا ہو تو کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں نمبر ایونیو کی فلاں نمبر سٹریٹ میں چلے جائیے۔ ایونیوز اور سٹریٹس کے متوازی ہونے سے یعنی ایونیو شمالاً جنوباً ہیں تو سٹریٹس شرقاً غرباً...... یوں یہاں بہت بڑے بڑے بل ایوارڈز (چوراہے) بن جاتے ہیں۔ سڑکوں اور ایونیوز میں ٹریفک بے حساب ہوتی ہے۔ ٹیکسیاں' کاریں' ایمبولینسیں رواں دواں رہتی ہیں۔ ٹریفک اتنی زیادہ ہے کہ پیدل گزرنے کے لیے ٹریک بنے ہونے کے باوجود سڑک پار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نیویارک میں ٹریفک کے حادثات بھی بیشمار ہوتے ہیں۔ ایمبولینسیں زخمیوں اور مرنے والوں کو اٹھائے ہسپتالوں کی طرف دوڑتی نظر آتی ہیں۔ ان کے سائرن ہر وقت دور نزدیک سے سنائی دیتے رہتے ہیں۔ صرف حادثات ہی میں مرنے یا زخمی ہونے والے نہیں' یہ ایمبولینسیں قتل ہونے والے افراد یا جھگڑوں میں زخمی ہونے والے افراد کو بھی ہسپتالوں میں پہنچانے کا کام کرتی ہیں......

نیویارک خوبیوں اور خامیوں کا مظہر شہر ہے۔ یہ اپنی طرز کا انوکھا اور نرالا علاقہ ہے۔ یہاں بیشمار دولت بھی ہے اور بے انتہا غربت بھی۔ اکثر فٹ پاتھوں پر مرد' عورتیں بیٹھے نظر آئیں گے جنہوں نے چھوٹی چھوٹی سٹکس پر بینر لگا رکھے ہوتے ہیں۔ یہ بھی مانگنے کا طریقہ ہے۔ اپنی ضرورت کو وہ بینر کے ذریعے اجاگر کرتے ہیں۔

نیویارک کی سڑکیں میل ہا میل لمبی ہیں۔ اس کا ساحل سمندر تقریباً اٹھارہ میل پر محیط ہے۔ اس انتہائی گنجان آباد شہر میں پارکوں کی بھی کمی نہیں۔ کوئی گیارہ سو کے قریب پارک ہیں۔ سینکڑوں کھیلوں کے میدان ہیں۔ ہزاروں سکول کالجز اور یونیورسٹیاں ہیں۔ میوزیم اور آرٹ گیلریاں بھی بے حساب ہیں۔ بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹورز جن کی سینکڑوں شاخیں پورے شہر کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہیں۔ چار سو کے قریب تھیٹرز' اسی طرح سینما ہاؤسز ہیں۔ شہر میں نئے پرانے تقریباً تین چار ہزار گرجا گھر بھی ہیں۔

ریسٹورنٹس اور بڑے بڑے ہوٹل بھی لاتعداد ہیں۔ نیویارک جتنا بڑا شہر ہے اس میں اتنی ہی بڑی بڑی چیزوں کی بہتات ہے۔ سو سے زیادہ سکائی سکریپرز ہیں جو آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ انڈر گراؤنڈ ریلوے کا جال بچھا ہے۔ سب وے ریلوے شروع تو لندن سے ہوئی تھی' وہاں یہ 1863ء میں بنائی گئی تھی اور ٹرینیں سٹیم سے چلتی تھیں۔ 1896ء میں یہ ٹرینیں بجلی سے چلائی گئیں۔ اسی سال یورپ میں بھی ایسی سب ویز بنائی گئیں۔ نیویارک میں پہلی سب وے 1904ء میں چلائی گئی۔ اس کا ٹریک نو میل لمبا تھا۔ اب نیویارک کا سب وے سسٹم دنیا میں سب سے بڑا ہے۔ یہ انڈر گراؤنڈ ریلوے ٹریک اب میلوں پر محیط ہے اور بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے بڑا سب ریلوے کا نظام ہے۔ اس میں ہر روز چالیس سے پچاس لاکھ لوگ سفر کرتے ہیں۔ ٹیکسیوں بسوں اور کاروں سے آنے جانے والوں کا شمار بھی لاکھوں میں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیویارک کتنا بڑا اور کتنا مصروف شہر ہے۔

دنیا بھر کے ملکوں میں لوگ سیاحت کے لیے جاتے ہیں' لیکن نیویارک میں آنے والے سیاحوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ غیر ممالک سے طلبہ بھی حصول تعلیم کے لیے لاکھوں کی تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ ویسے بھی دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ ہوگا جس کے باشندے یہاں آ کر آباد نہ ہوگئے ہوں۔ کوئی حصول تعلیم کے لیے آیا تو یہیں بس گیا۔ کوئی تلاش روزگار میں نکلا تو یہیں کا ہو گیا...... کسی نے نقل مکانی ضروری سمجھی تو یہیں ٹھکانہ بنایا۔ بزنس کرنے کے لیے اسی جگہ سرمایہ لگانے والوں کا بھی شمار نہیں۔ غرضیکہ دنیا کے ہر ملک ہر نسل اور ہر قومیت کے لوگ یہاں آباد ہیں...... چین تو آج کل امریکی معاشرت پر چھا رہا ہے...... یہاں ان کا چائنا ٹاؤن لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ بہت بڑا بازار جہاں چائنا کی ہر چیز دستیاب ہے۔ دکاندار چینی ہیں...... چائنا ٹاؤن میں بیشمار چینیوں کے گھر ہیں۔ گو امریکہ کے دوسرے علاقوں میں بھی چینی آباد ہیں' لیکن یہ جگہ ان کے لیے چین ہے۔ ضرورت کی جو چیز لینی ہو وہ اکثر یہاں ہی آ کر خریدتے ہیں۔

مین ہیٹن کا درمیان کا علاقہ قابل دید مقامات کا مرکز ہے۔ یہاں بڑے بڑے

ہوٹل ہیں۔ اونچی اونچی بلڈنگیں ہیں۔ اقوام متحدہ کے صدر دفاتر' گراؤنڈ سنٹرل ریلوے اسٹیشن' نیویارک پبلک لائبریری' راک فیلر سنٹر' چینل گارڈن' واشنگٹن سکوائر' ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ' ورلڈ ٹریڈ سنٹر' میڈیسن سکوائر گارڈن وغیرہ۔ دیکھنے والوں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز ہیں۔

ٹائم سکوائر اور براڈ وے کے نام ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ یہ علاقے 42 اور 47 سٹریٹ کے درمیان ہیں۔ ٹائم اسکوائر میں تھیٹرز' سینما' شو بزنس کے لیے مشہور ہے۔ یہاں شراب خانے بھی بیشمار ہیں۔ یہاں رات اتنی جگمگاتی ہے کہ دن سے بھی نمبر لے جاتی ہے۔ ساتھ ہی براڈ وے کا علاقہ ہے۔ یہ ٹائم سکوائر ہی کی طرح ہے لیکن یہاں ہر ہوٹل ریسٹورنٹ' تھیٹرز' سینما وغیرہ اعلیٰ ترین ہیں۔ یہ علاقہ بے انتہا دولتمندوں کا علاقہ ہونے کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔

بڑے بڑے بینک' انشورنس کمپنیاں' پُر شکوہ عمارتیں اور سکائی سکریپرز براڈوے کی وال سٹریٹ میں ہیں۔ یہ امریکہ کی مالیاتی شہ رگ ہے۔ یہاں صنعت و تجارت اور کاروبار کا عالمی مرکز ہے۔ یہاں واقعی دولت کی بارش ہوتی ہے۔ دولت...... جس کا اندازہ ہم لوگ لگا ہی نہیں سکتے۔

یہ نیویارک کا انتہائی مختصر بلکہ مختصر ترین تعارف ہے۔ صحیح طور سے اس شہر کو متعارف کرانے کے لیے سینکڑوں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

خیر

حمیرا ہمیں ففتھ ایونیو میں اتار کر اپنے کام سے گئی تھی۔ ہمارا کام تو کچھ تھا نہیں۔ ایونیو کے کنارے فٹ پاتھوں پر ہی چلنا پھرنا اور رواں دواں ٹریفک کو دیکھنا تھا۔ اس کے علاوہ سٹور دیکھنے کا بھی چارم تھا' اس لیے تھوڑی دیر تو ہم فٹ پاتھ پر پھرتے رنگ برنگے لوگوں اور تیز رفتار ٹریفک کو ہی دیکھتے رہے۔ پھر ایک بہت بڑے سٹور میں جا گھسے۔ اس سٹور کی کئی منزلیں تھیں۔ گھنٹہ بھر میں ہم صرف نچلی منزل کا ہی چکر لگا سکے...... جاگرز پہنے ہوئے تھے' اس لیے چلنا پھرنا قدرے آسان تھا لیکن گھنٹہ بھر ڈیپارٹمنٹل سٹور کے مختلف حصے دیکھ کر کم از کم میں تو تھکاوٹ محسوس کرنے لگی تھی' اس لیے

میں باہر سٹور کے برآمدے میں آ گئی۔ ویسے بھی حمیرا ہمیں اسی صورت تلاش کر سکتی تھی کہ کوئی نہ کوئی برآمدے میں کھڑا ہوتا۔

سو

جب حمیرا آئی تو مجھے دیکھتے ہی سیدھی ادھر آ گئی۔

"باقی کہاں ہیں۔"

"اندر......"

"تو ابھی آپ لوگوں کا جی نہیں بھرا اسٹور دیکھ دیکھ کر۔"

"یہ بات اپنی اماں سے کہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ کیونکہ ہم سب سے زیادہ نسیمی کو سٹوروں میں گھومنے پھرنے اور خریداری کرنے کا شوق تھا۔

حمیرا اندر گئی۔

مجھے دس منٹ اس کا انتظار کرنا پڑا۔

یہ بھی غنیمت تھا۔ وہ دس منٹ میں انہیں سٹور سے نکال لائی تھی۔ اگر وہ لوگ دوسری یا تیسری منزل پر چلی گئی ہوتیں۔

تو

پھر انہیں اتنی جلدی باہر نہیں لایا جا سکتا تھا۔

وہ باہر آئیں تو ان کے ہاتھوں میں ایک ایک دو دو لفافے تھے۔ کچھ نہ کچھ شاپنگ کر ہی لی تھی انہوں نے......

حمیرا ہمیں ساتھ لیے فٹ پاتھ پر چلتے کار پارکنگ کی طرف جانے لگی۔

"جلدی قدم اٹھائیں۔ میں نے میٹر میں ایک گھنٹے کے سکے ڈالے ہوئے ہیں۔ دیر ہو گئی تو ٹکٹ مل جائے گا......"

ہم اس کی بات سمجھے نہیں کہ اس نے گاڑی کے میٹر میں سکے کیوں ڈالے ہیں اور اس سے ٹکٹ کیونکر مل جائے گا۔

اس نے ہمیں پوری وضاحت سے بتایا کہ یہاں ایونیوز یا سٹریٹس میں جہاں

کار پارکنگ کی جگہ بنی ہوتی ہے وہاں زمین پر ہر گاڑی کے لیے لائنیں لگی ہوتی ہیں جیسے عام سٹوروں کے سامنے باہر پارکنگ ایریا میں لیکن وہاں پارکنگ فری ہوتی ہے جبکہ ان جگہوں میں ہر گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ پر سامنے ہی میٹر لگا ہوتا ہے۔ آپ نے جتنی دیر کے لیے گاڑی کھڑی کرنا ہے اسی حساب سے اس میں سکے ڈال دیں۔ ریٹ مقرر ہوتے ہیں۔ اگر تو آپ وقت ختم ہونے سے پہلے آ گئے تو چلنا ہوگا اور اس سے کوئی دوسرا آنے والا کچھ فائدہ اٹھائے گا لیکن میٹر رک گیا اور آپ نہیں پہنچے تو پھر پولیس والا آپ کی گاڑی پر ٹکٹ لگا جائے گا۔ یہ جرمانہ آپ کو ادا کرنا ہی ہوگا۔"

"اور جو کوئی نہ ادا کرے تو۔" نسیمی نے پوچھا۔

"جرمانہ ہر کوئی ادا کرتا ہے۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ جرمانے کے پیسے خود ہی بذریعہ متعلقہ جگہ پہنچا دیں۔ اگر سمجھتے ہیں کہ جرمانہ غلط کیا گیا ہے تو آپ کو حق ہے کہ اپنا کیس عدالت میں لے جائیں اور ثابت کریں کہ جرمانہ غلط ہے۔ آپ کو چھوٹ مل جائے گی۔ اگر آپ کا موقف صحیح ہوا تو......" حمیرا بولی پھر اس نے بتایا کہ ہر ٹکٹ کے پیچھے یہ بات درج ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اکثر لوگ جرمانہ بذریعہ ڈاک بھیجنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ عدالت میں جانے کے لیے وہ وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کچھ آدمی ایسا کر بھی لیتے ہیں۔ جرمانہ غلط کیا گیا ہو تو عدالت صرف ان کے استدلال سن کر ہی انہیں جرمانے سے بری کر دیتی ہے۔ اگر جرمانہ صحیح کیا گیا ہو تو وہ انہیں عدالت میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ دس بیس ڈالر کے لیے اکثر عدالت سے رجوع نہیں کرتے۔ وقت کی اہمیت اور افادیت کو لوگ جانتے ہیں۔

"عدالتوں کے چکر لگانا آسان کام بھی تو نہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں رضیہ خالہ۔" حمیرا بولی۔ "یہاں پاکستان کی طرح معاملہ نہیں...... عدالت میں وقت ضائع نہیں ہوتا۔ باری آنے پر کام منٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ عدالتوں میں آنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اپنا کام چھوڑ کر ہی وہاں جا سکتے ہیں۔ اس لیے لوگ جرمانہ بذریعہ ڈاک بھیجنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم حمیرا کے گھر آ گئے...... اس کا گھر ایک خوبصورت ہم پہاڑی علاقے میں تھا۔ یوشیپ میں ڈبل سٹوری اپارٹمنٹس بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے یوشیپ ہی چمن تھا۔ بہت بڑا اور سرسبز۔ گھاس کے کنارے کنارے کالے کالے موٹے موٹے تنوں والے بیشمار درخت تھے۔ جن پر گہرے پیلے رنگ کے پتے تھے جو اتنے خوبصورت لگ رہے تھے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ قدرت نے رنگوں کا حسین امتزاج کیا ہوا تھا۔ درخت پتوں سے بھرے تھے۔ سب ہی گہرے پیلے رنگ کے ان درختوں کے بیچھے یوشیپ ہی راستہ تھا جو اپارٹمنٹس میں جانے کے لیے بنا تھا۔ حمیرا کا گھر دوسری منزل پر تھا۔ یہ دو بیڈروم ڈائننگ اور ڈرائنگ پر مشتمل اپارٹمنٹ تھا جس میں سہولت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس نے فلیٹ خوبصورتی سے سجا رکھا تھا۔

حمیرا کے شوہر نوفل کا وہاں بزنس تھا۔ پیسے کی فراوانی کے ساتھ اللہ نے دل بھی فراخ دیا تھا۔ ہم چار دن حمیرا کے ہاں رہے۔ خاطر مدارات کے علاوہ دونوں میاں بیوی نے ہمیں سیر سپاٹے بھی خوب کروائے۔ سنٹرل پارک دکھایا' لنکن سنٹر' ٹائم سکوائر' براڈوے ہم نے انہی کے ساتھ دیکھے۔

سنٹرل پارک نیویارک جیسے انتہائی گنجان آباد شہر' کسی عجوبے سے کم نہیں۔ یہ خوبصورت پارک کوئی دو اڑھائی میل بلکہ اس سے بھی زیادہ طویل اور دو میل چوڑا ہے۔ لوگ یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ خوبصورت روشیں' رنگارنگ پھول' گھنے پیڑ۔ ایک طرف تو باغ جنگل کا سماں پیش کرتا ہے۔ اتنے گھنے درخت ہیں کہ ان کے ساتھ ساتھ اندر جانا مشکل ہے۔ ایک جھیل بھی بنائی گئی ہے جہاں سیر و تفریح کو آنے والے بوٹنگ سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جاگنگ کرنے کے لیے ٹریک بنے ہوئے ہیں۔ گھڑسواری کے لیے بھی راستے مخصوص ہیں۔ کاروں اور بسوں کی دنیا میں سواری کے گھوڑے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ لوگ ان پر پیسے دے کر سواری کا لطف لیتے ہیں۔ یہ پارک سنا ہے کوئی اٹھارہ بیس سال کے عرصے میں بنا تھا۔ لوگوں کے لیے یہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ اتنی گھنی آبادی والے شہر میں یہ پارک بالکل ہی منفرد اور انوکھا لگتا ہے۔

لنکن سنٹر ایک ثقافتی مرکز ہے۔ بہت خوبصورت جگہ۔ خوبصورت اور دیدہ زیب عمارتیں' ثقافتی مرکز کا پلازہ دیدنی ہے۔ اس علاقے میں رقص و موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ کے مرکز قائم ہیں۔

ٹائم سکوائر کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔ براڈوے اور ٹائم سکوائر پوش علاقے ہیں۔ یہاں تھیٹرز' سینما' کلب' شراب خانے' ہر شے موجود ہے۔ رات کے وقت یہ رنگارنگ روشنیوں سے عجب سماں پیش کرتا ہے۔ سارا نیویارک ہی رات کے وقت جگمگا اٹھتا ہے۔ The City Which Never Sleeps نیویارک کے متعلق ہی کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں کی سرگرمیاں دن سے بھی زیادہ رات کو عروج پر ہوتی ہیں۔

نیویارک اتنا بڑا شہر ہے کہ اسے چند دنوں میں دیکھ لینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ مہینوں میں بھی پورے نیویارک کو دیکھنا ممکن نہیں۔ سیاحت کے شوقین بھی خاص خاص جگہیں بمشکل دیکھ پاتے ہیں۔

نوفل اور حمیرا نے ہمیں خوب سیر کرائی۔ کئی لوگوں سے ملوایا۔ نوفل شام کو کام سے فارغ ہو کر آتا تو ہمیں مختلف جگہیں دکھانے لے جاتا۔ حمیرا دن کو ہمیں شاپنگ پلازے اور بڑے بڑے سٹورز دکھانے لے جاتی۔ اسی کے ساتھ ہم جیکسن ہائٹس دیکھنے گئے۔ اس علاقے میں اتنے پاکستانی اور ہندوستانی ہیں کہ یہ علاقہ پاکستان یا ہندوستان ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ رنگ برنگی چیزوں کی بیشمار دکانیں' کھانے پینے کی شاپس' ریسٹورنٹس' ہر طرح کی ہندوستانی اور پاکستانی چیز وہاں موجود تھی۔ کئی مردوں کو دیکھا جو شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر تو ہم نے اردو میں لکھا اشتہار بھی دیکھا۔ یہ علاقہ دوسرے علاقوں کی طرح بہت زیادہ صاف ستھرا بھی نہ تھا' ہمیں لگا کہ ہم پاکستان ہی کے کسی علاقے میں گھوم رہے ہیں۔ ہندو تو اسے جیکسن ہائٹس کی جگہ جے کشن ہائٹس کہنے لگے ہیں۔ یہ علاقہ امریکہ کا ایک نیا رخ تھا۔

''یہ علاقہ تو امریکہ کا علاقہ لگتا ہی نہیں۔'' میں نے نوفل سے کہا تو وہ ہنس کر بولا:

''آنٹی امریکہ کے کئی ''چہرے'' ہیں۔ میں آپ کو اس کا ایک بدرنگ چہرہ بھی دکھاؤں گا۔''

دوسرے دن وہ ہمیں ایک ایسا علاقہ دکھانے لے گیا جو کسی طور پر امریکہ کا حصہ

نہیں لگتا تھا۔ سڑکیں جگہ جگہ سے شکستہ' کئی جگہ عین درمیان میں گڑھے' کئی جگہ کوڑا ڈرموں سے باہر پڑا تھا۔ مکان پرانے اور شکستہ۔ کئی بالکنیوں میں جینز، سویٹر، فراک وغیرہ لٹک رہے تھے۔ لوگ بھی میلے میلے اور نامکمل لباسوں میں نظر آئے۔

اتنا تضاد!

دیکھ کر حیرانی ہوئی۔

نوفل ہمیں گھما پھرا کر لایا۔ ہم علاقوں کے تضادات پر باتیں کر رہے تھے کہ وہ بولا: ''آنٹی ابھی اس سے بھی بدتر علاقے یہاں ہیں۔ کالوں کا علاقہ آپ کو دکھانے لے جاؤں گا۔ پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ نیو یارک صرف خوبصورتیوں ہی کا مرکز نہیں...... اس کے علاوہ ایک اور امریکہ بھی دکھاؤں گا آپ کو......''

''ایک اور امریکہ......؟''

''جی ہاں۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''زیرِ زمین۔''

''کیا۔''

گڈی جھٹ سے بولی۔ ''سب وے ریلوے۔ وہ ہم نے دیکھ لی ہے۔ اس میں سفر بھی کیا ہے۔''

''نہیں آنٹی......'' نوفل بولا۔ ''وہ تو دنیا کا عجوبہ ہے۔ میں اور بات کر رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''یہاں زیرِ زمین بھی لوگ رہتے ہیں۔''

''کہاں۔''

''انہیں رہنے کو گھر نہیں۔ کرایہ کے ایریاز میں...... غریب لوگ...... کالے لوگ...... جن کے پاس رہنے کو گھر نہیں...... کرایہ پر بھی نہیں لے سکتے...... وہ لوگ انہی زمینی غاروں میں رہتے ہیں...... دن بھر کام کرتے ہیں...... رات کو کسی کونے کھدرے میں

جا کر جسے انہوں نے گھر بنا رکھا ہوتا ہے سو جاتے ہیں...... نہ یہاں پوری صفائی ہوتی ہے چوہوں کی بھرمار...... کوڑا کرکٹ بھی کچھ ہوتا ہے...... کسی دن آپ کو دکھلاؤں گا۔''

لیکن

ہم دیکھنے نہ جا سکے۔ نوفل کو اپنے کاروبار سے وقت نکالنا مشکل تھا۔ پھر بھی اس نے وعدہ کیا کہ جب ہم دوبارہ اس کے ہاں رہنے آئیں گے تو وہ ہمیں یہ جگہیں دکھانے لے جائے گا۔

نوفل کھانے پینے کا شوقین ہے۔ خاص کر پاکستانی ہندوستانی کھانوں کا۔ اس نے ہمیں بھی امریکہ میں نہاری' بریانی' چکن تکہ' کباب' سری پائے اور افغانی تکے کھلائے۔ حمیرا کہتی اور کہتی نوفل نے یہاں بھی ان چیزوں کی دکانیں اور چھوٹے چھوٹے ہوٹل ڈھونڈ لیے ہیں۔

چار پانچ دن حمیرا کے گھر گزار کر ہم واپس آئے...... تو دوسرے دن بشرہ ہمیں لینے آ گئی۔

میں دو چار دن کے لیے اس کے ساتھ چلی گئی...... باقی سب کو اس نے دوسرے دن کھانے پہ مدعو کیا۔

اس نے دعوت کا اتنا پُرتکلف اہتمام کیا کہ میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ساری چیزیں گھر پہ بنائیں...... جو بہت لذیذ تھیں۔ پاکستان سے آئے ہوئے سب لوگ اس کے ہاں آئے۔ شمو نے بھی شرکت کی۔ حمیرا اور نوفل بھی آئے۔ سب نے پورا دن اس کے ہاں گزارا۔ خوب گپ شپ رہی۔ شام ڈھلے سب واپس ہوئے۔ نسیمی کو حمیرا اپنے ساتھ لے گئی۔ گڈی اور رقیہ نے بہت چاہا کہ میں بھی ان کے ساتھ واپس چلوں لیکن بشرہ نے جانے نہ دیا۔

''دو دن بعد آمنہ کے ہاں کھانا ہے۔ میں نانی کو ساتھ لے آؤں گی۔ یہ دو دن تو انہیں میرے پاس رہنے دیں......''

آمنہ کے ہاں دو دن بعد کھانا تھا اس لیے جانا ہی تھا۔ بشرہ کے اصرار پر میں رک گئی۔

دو دن بعد ہم لوگ آمنہ کے گھر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ میرا کچھ سامان ابھی بشرہ کے ہاں ہی تھا' وہ میں نے ایک بیگ میں بھر لیا۔

''رہنے دیں یہ کپڑے اور چیزیں یہیں۔'' بشرہ نے کہا: ''آپ یوں بوریا بستر باندھ رہی ہیں جیسے پھر آنے کا ارادہ نہیں۔''

''کیوں نہیں بشرہ۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کپڑے ایک ایک دو دو بار پہنے ہوئے ہیں۔ شمو کے گھر دھولوں گی۔''

''میں لانڈری سے دھلوا دوں گی۔''

''نہ بھئی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لانڈری میں پتہ نہیں کس کس کے کپڑے دھلتے ہیں۔ شمو کی کافی بڑی واشنگ مشین ہے...... وہاں دھل جائیں گے۔''

بشرہ ہنس پڑی۔ ''نانی بھی میرے ساتھ چل کر دیکھیں۔ مشینیں کتنی صاف ہوتی ہیں۔ بیٹھنے کی جگہ کتنی اچھی......''

''سب ٹھیک لیکن میں کپڑے شمو ہی کی مشین میں دھوؤں گی......'' کپڑے بیگ میں ڈال کر میں نے اپنی دوائیاں بھی بیگ میں رکھ لیں۔ پورے چار ماہ کا کوٹہ لے کر گئی ہوئی تھی......''

لیکن

وہ بیگ شمو کے گھر جا ہی نہ سکا۔

ہوا یوں کہ جب فاران اور بشرہ چھوٹی بچی سارا کی سیٹ باندھ رہے تھے میں نے بیگ ڈگی کے قریب زمین پر رکھ دیا۔ سوچا بچی کو ڈال کر فارغ ہوں تو بیگ ڈگی میں رکھ لیں گے۔

لیکن

ہم باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے بشرہ اور فاران گاڑی میں بیٹھ گئے اور میں بھی سارا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی...... بیگ ڈگی میں رکھنا یاد ہی نہ رہا۔

یاد تو اس وقت آیا۔

جب فاران اور بشرہ آمنہ کے ہاں کی دعوت کے بعد رات گھر واپس جانے لگے۔

''بھئی میرا بیگ نکال دینا۔'' میں نے بشرہ سے کہا۔

لیکن

بیگ ہوتا تو نکلتا۔ ڈگی میں تھا نہیں۔ گاڑی کے اندر بھی نہیں تھا۔ وہ تو وہیں رہ گیا تھا۔ کار پارکنگ کی جگہ پر...... پریشانی تو ہوئی...... لیکن خیال تھا...... یہ امریکہ ہے یہاں چوری نہیں ہوگی...... بیگ وہیں پڑا ہوگا۔

لیکن

بیگ وہاں نہیں تھا۔ کوئی اٹھا لے گیا تھا۔ فاران نے بہتیری پوچھ گچھ کی۔ بڑے سے کاغذ پر لکھ کر وہاں لگا بھی دیا...... کہ کسی نے بیگ دیکھا ہو یا لیا ہو تو اس نمبر اپارٹمنٹ میں دے جائیں لیکن بیگ نہیں ملا۔ میرے چھ نئے جوڑے' شال' سویٹر وغیرہ تو گئے تو گئے دوائیاں بھی ساتھ گئیں۔ شلوار قمیضیں تو کسی کے کام کی تھیں نہیں...... نہ ہی دوائیں۔ ہاں بیگ قیمتی اور بالکل نیا تھا۔ وہ کسی کے کام آ گیا ہوگا۔

خیر کپڑوں کے گم ہونے کی تو تشویش ہوئی ضرور۔ نئے قیمتی جوڑے تھے۔ شال کا تو بہت ہی افسوس ہوا لیکن سب سے زیادہ فکر دوائیوں کی تھی۔ امریکہ میں ڈاکٹر کو دکھائے بغیر کوئی دوائی خریدی نہیں جا سکتی ماسوا ڈسپرین...... دانتوں کی تکلیف کم کرنے کے لیے لگانے والی ٹیوب، مینٹل ریسٹ کے لیے چھوٹی موٹی پلز وغیرہ کاؤنٹر پر بغیر ڈاکٹر کی کنسلٹیشن کے مل جاتی ہیں۔

میری دوائیاں شوگر اور بلڈ پریشر کی تھیں۔ میں نے بھی ساری کی ساری دوائیوں والا لفافہ بیگ میں ڈال لیا تھا۔ سو اس کی بہت پریشانی تھی۔

اب اگر دوائیاں لینے کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کیا جاتا تو کئی قسم کے ٹیسٹ پہلے کروانے پڑتے۔ کنسلٹیشن فیس الگ...... یعنی خاصا بڑا خرچہ تھا۔ اب شمیم سے پوچھا تو وہ انستھیزیا کی سپیشلسٹ تھی۔ اسی دوائیوں کا نسخہ لکھ کر دے نہیں سکتی تھی۔ دوسرے یہاں دوائیوں کے نام بھی مختلف تھے۔

بڑی ہی مصیبت پڑی۔ دوائیاں روزانہ کے استعمال کی تھیں۔ شمیم بھی پریشان ہوگئی۔

پھر اس نے ایک موٹی سی کتاب میں سے ان دوائیوں کے متبادل کے نام ڈھونڈے

پھر

ڈاکٹر منظور جن کے ہاں ہم دعوت پر گئے تھے، ان کو کنسلٹ کیا...... ان کی مہربانی کہ پتہ نہیں کیسے اور کہاں سے یہ دوائیاں منگوا کر دیں۔ چند دنوں کے لیے تو مسئلہ حل ہوگیا لیکن میں نے تو ابھی کیلیفورنیا بھی جانا تھا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ ابھی امریکہ ہی میں قیام تھا۔ اتفاق ہی کی بات کہ بشرہ کی ایک دوست نیو جرسی آ رہی تھی۔ اسے فون کیا کہ وہ یہ دوائیاں اپنے ساتھ لا سکتی ہے؟ اس نے حامی بھری تو میں نے اپنی بیٹی نینو کو فون پر دوائیوں کے نام اور جتنی منگوانی تھیں، بتا دیا کہ یہ دوائیاں لے کر وہ اس لڑکی کو پہنچا دے جو نیو جرسی آ رہی تھی۔

بہرحال

یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ جب تک پاکستان سے دوائیاں نہ آئیں، میں ڈاکٹر منظور کی منگوا کر دی ہوئی دوائیاں استعمال کرتی رہی جن کے نام مختلف تھے لیکن شاید مواد وہی تھا۔

آمنہ کے گھر ہم لوگ دو دن رہے۔ یہاں بھی وہی کام۔ وہ پھر آمنہ آ جاتی۔ ہم سب کھانا کھاتے۔ رات کا کھانا بنا جاتے اور پھر وہی سڑکیں' مختلف سٹورز' ریسٹورنٹ، میکڈونلڈ کے برگر، آئس کریم، چائے...... بچوں کی طرح جو میلے پر جائیں تو جو جی چاہے کھاتے پھرتے ہیں۔ ہمارا بھی وہی حال تھا۔ کبھی کبھی شاپنگ بھی کر لیتے۔ آمنہ نے بھی حمیرا اور بشرہ کی طرح ہماری خوب خاطر مدارات کی۔

وہاں سے ہم پھر اپنے اصلی ٹھکانے یعنی شمو کے گھر آ گئے۔ باہر گھومنے پھرنے جانا اب بھی معمول تھا اور یہ صرف آمنہ کی وجہ سے۔

اب ہم شمو کے پیچھے پڑ گئے۔

"بھئی شمو ہمیں ہر جگہ گھمانے پھرانے بچیاں ہی لے جاتی ہیں۔ تم بھی امریکہ کا

کوئی حصہ دکھا دو۔ کیا یاد کریں گے کہ امریکہ گئے اور شمو نے کوئی سیر نہیں کرائی......"

شمو ہنس کر بولی۔ "میں تم لوگوں کو فلیمنگٹن لے کر گئی تھی......"

"وہ کیا؟ صرف آؤٹ لٹ...... کوئی تفریح کی جگہ دکھاؤ۔"

"ٹھیک ہے تم لوگوں کو اٹلانٹک سٹی لے جاؤں گی۔"

"کب؟"

"ظاہر ہے چھٹی کے دن ہی جا سکتی ہوں۔ تین گھنٹے کی تو ڈرائیو ہی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

ہم سب خوش ہو گئے اور شمو کی چھٹی کا انتظار کرنے لگے۔

-------O-------

اٹلانٹک سٹی نیوجرسی کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ ایک پتلے لمبے جزیرے Absecon پر واقع ہے جو بحر اوقیانوس کے اوپر ہے۔ یہ ایک تفریح گاہ ہے۔ اجلاسوں کا مرکز اور سب سے بڑی بات کہ بے تحاشا کیسینوز کو دامن میں لیے ہوئے ہے جہاں جوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کینڈی بنانے کی بہت بڑی انڈسٹری ہے۔ نمکین پانی سے بنائی جانے والی ٹافی بھی یہاں ہی سے شروع ہوئی تھی۔ یہ کام 1883ء میں شروع ہوا تھا۔ یہاں گھونگھا مچھلی بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ اسکے علاوہ یہ بہت بڑے کونشن ہال کی وجہ سے مشہور ہے جہاں مس امریکہ کے چناؤ کی وجہ سے بہت لہر بہر ہوئی تھی۔ نیشنل کونشن، ڈیموکریٹک پارٹی کا چناؤ بھی یہیں ہوا تھا۔ یہ 1964ء کی بات ہے۔

یہاں سمندر کے کنارے قریباً دس کلو میٹر لمبا لکڑی کے تختوں سے چلنے پھرنے کے لیے راستہ بنایا گیا ہے۔ اسے Board Walk کہتے ہیں۔ اس بورڈ واک سے سمندر کے اندر تک تفریح کے لیے جانے والوں کے لیے راستے بنے ہوئے ہیں۔ Absecon Slate کا مشہور لائٹ ہاؤس اٹھارویں صدی کے آخر میں تعمیر کیا گیا تھا جس کی تاریخی نوعیت ہے۔ اٹلانٹک سٹی Canden اور اٹلانٹک ریلوے روڈ کا آخری سٹیشن ہے جو سمندر کے کنارے تک جانے کی وجہ سے بہت بڑی تفریح گاہ بنا ہوا ہے۔ یہاں کی آبادی 1990ء میں 38063 سے کچھ زیادہ تھی۔

اٹلانٹک سٹی کی معیشت 1960ء اور 70ء کے درمیان تنزل پذیر ہوئی تو جوئے کو یہاں سرکاری اور قانونی طور پر تحفظ دے دیا گیا جس سے 1978ء سے یہاں کی معیشت

ترقی سے ہمکنار ہوتی گئی۔ اب اٹلانٹک سٹی کا نام ہی گیمبلنگ کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔

چھٹی کے دن شمو نے ہمیں اٹلانٹک سٹی جانے کے لیے تیار ہونے کو کہا۔ ہم سب خوشی خوشی تیار ہونے لگے۔ سردی کے پیش نظر کوٹ، مفلر، شالیں، سویٹر پہنے۔ دو دو جوڑے گرم جرابیں پہن کر جاگرز پہنے...... اور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

شمو نے بھی تیاری کی۔ اب ہم سب اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ساتھ کچھ پھل اور خشک میوہ احتیاطاً رکھ لیا۔ یہ راستے کے لیے تھا کیونکہ تین گھنٹے سے بھی کچھ زیادہ کی ڈرائیو تھی اور ہم سب ہی شوگر کے پیشنٹ تھے۔ کھانا تو وہیں کھانا تھا۔ راستے میں بھوک لگنے کی صورت میں یہ چیزیں رکھی تھیں۔

نیوجرسی سے اٹلانٹک سٹی سیدھی لمبی سڑک جاتی تھی۔ کوئی زیادہ موڑ نہ تھے لیکن شمو حسب معمول راستہ بھول گئی اور بالکل مخالف سمت پندرہ بیس منٹ تک چلتی گئی۔ اسے امریکہ میں رہتے چھبیس ستائیس سال ہو چکے تھے۔ ہزاروں بار ان راستوں پر گئی ہوگی لیکن پھر بھی کبھی کبھی راستہ بھول جانا اس کی شاید عادت تھی۔

شاید وہ آگے ہی بڑھتی چلی جاتی...... کہ ایک بہت ہی خوبصورت عمارت کو دیکھ کر وہ چونکی۔

''ہائے یہ تو اٹلانٹک سٹی کے الٹ راستے پر ہم جا رہے ہیں......''

ہم سب نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

''خدایا......'' اس نے گاڑی روکی۔ پھر خفت مٹانے کو بولی۔ ''تم سب نے مجھے باتوں میں اس طرح الجھایا ہوا تھا کہ میں راستہ ہی بھول گئی۔ اب واپس جانا پڑے گا۔''

''کہاں؟'' جلدی سے گڈی بولی۔

''جدھر سے آئے ہیں......'' وہ بولی۔

''کہیں واپس گھر تو نہیں لے جاؤ گی؟'' یمی نے کہا۔

وہ ہنس پڑی......

''میں کب گھر جا رہی ہوں؟'' شمو بولی۔

اس نے گاڑی موڑی اور واپس اسی طرف جانے لگی جدھر سے آئی تھی۔ اپنے گھر کے قریب والی سڑک سے اس نے صحیح سمت کی طرف گاڑی موڑ لی۔

اور

رواں دواں جانے لگی۔

اب ہم ایک چوڑی صاف ستھری سرمئی سڑک پر جا رہے تھے جس کے کناروں پر گھاس تھی۔ درخت تھے، پھولدار جھاڑیاں تھیں۔

کافی دور جانے پر ہم جس راستے سے گزر رہے تھے، اس کے ایک طرف تو سبزہ زار تھا لیکن دوسری طرف چودہ پندرہ فٹ اونچی موٹے لکڑی کے تختوں کی دیوار تھی۔ یہ دیوار کافی دور تک ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ کس لیے ہے یا اس کے دوسری طرف کیا ہے؟

میں نے شمو سے پوچھ ہی لیا۔ ''شمو یہ لکڑی کی اتنی اونچی دیوار کس لیے بنائی گئی ہے......؟''

''آپا اسے فنسیڈو کہتے ہیں۔ اس کے پچھلی طرف لوگوں کے گھر ہیں...... چونکہ سڑک کے عین کنارے پر ہیں، اس لیے ان کے مکینوں کو ٹریفک کے شور سے بچانے کے لیے یہ دیوار بنائی گئی ہے۔ لوگ تیز ٹریفک کے شور سے کم ڈسٹرب ہوتے ہیں بلکہ ہوتے ہی نہیں کیونکہ سڑک اتنی ہموار ہے اور ہارن یہاں لوگ بجاتے نہیں۔ ہاں گاڑیوں کی آوازوں سے ان گھروں کے مکینوں کو بچانے کے لیے یہ کئی میل لمبی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔''

''واہ کیا کہنے۔'' تقریباً سبھی کے منہ سے نکلا۔

کافی دیر ہم لوگ اسی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ حکومت کو اپنے عوام کے آرام اور سہولت کا کتنا خیال ہے۔ ہمارے لیے یہ بات شاید اچنبھے کی تھی۔ اپنے ملک میں ایسا تجربہ تو کبھی ہوا نہیں تھا۔

دیوار ختم ہونے کے بعد آبادی بھی ختم ہو گئی۔ اب سڑک کے دونوں طرف سبزہ

اور درخت تھے۔ کچی زمین کہیں نظر نہ آئی۔ ہر جگہ گھاس لگی ہوئی تھی۔ رات چونکہ کچھ برفباری ہوئی تھی، اس لیے کہیں کہیں ان پچھلی برف کی ہلکی ہلکی سفید تہ نظر آتی تھی۔

ان ہریالے میدانوں کے پار کہیں کہیں فیکٹری نما عمارتیں نظر آتی تھیں۔ عام طور پر آبادی کا نام ونشان نہیں تھا۔

ہم سب ہنستے مسکراتے باتیں کرتے راستے کو انجوائے کرتے پھل اور ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ کوئی تین گھنٹے بعد آبادی کے آثار نظر آئے اور

پھر

جوں جوں آگے بڑھے

کیسینوز کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ دوطرفہ تکونی چھتوں والے بنگلے بھی نظر آئے۔ پھر جوں جوں قریب پہنچے یوں لگا جیسے یہ صرف کیسینوز ہی کا شہر ہے۔ ٹرمپ پلازہ کئی منزلہ کیسینو تھا۔ اسی طرح ہیلیز، سیراز، شیرٹن، کلاریج، سنوبوٹ، سیڈز اور

تاج محل

اور بھی بہت سے کیسینوز تھے۔ یہ سب کے سب جوا خانے تھے۔ اردگرد شراب کی دکانیں، ریسٹورنٹ، ہوٹل سبھی کچھ تھا اور بھی کئی چیزوں کی شاپس تھیں۔ لوگ سوونیئرز کے طور پر یہاں سے چیزیں خریدتے تھے۔

کیسینوز کے کار پارکنگ کئی کئی منزلہ تھے۔ بے شمار لوگ یہاں روزانہ آتے ہیں۔ کروڑوں ڈالر کا جوا کھیلا جاتا ہے۔ لاس ویگاس امریکہ کا گیمبلنگ کا بہت ہی بڑا شہر ہے۔ اٹلانٹک سٹی دوسرے نمبر پر ہے لیکن ہمارے لیے تو یہ جگہ بھی باعث حیرت ودلچسپی تھی۔

ایک طرف لہریں لیتا ہوا اٹلانٹک اوشن...... دوسری طرف یہ بڑے بڑے کیسینوز...... درمیان میں اینٹوں کی بنی چوڑی سڑک جس پر جگہ جگہ دکانیں اور کھانے پینے کی جگہیں تھیں۔ سمندر کے بیچ پر بنچ جا بجا پڑے تھے۔ وہاں بیٹھ کر لوگ سمندر کی جھاگ اڑاتی لہروں کا لطف لیتے تھے۔

شمو ہمیں تاج محل کیسینو دکھانے لے جا رہی تھی۔ یہ بہت خوبصورت اور نیا بنا ہوا

تھا۔ اس لیے کار پارک کرنے کے لیے وہ اسی کیسینو کے پارک ایریا میں گاڑی لے گئی۔
کار پارکنگ کی عمارت بہت ہی بڑی اور کئی منزلہ تھی۔ ہر منزل کا نمبر تھا۔ جہاں گاڑی پارک کرتے وہاں بھی ایلفا بیٹک آرڈر میں گاڑی کھڑی کرنا ہوتی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ رش بہت تھا۔ اس لیے گھوم گھام کر تیسرے فلور پر کار پارکنگ کی جگہ ملی۔ شمیم چونکہ راستے اکثر بھول جاتی تھی، اس لیے اس بات کے پیش نظر گُڈی نے فلور اور جہاں گاڑی کھڑی کی تھی، اس کا لفظ لکھ لیا یعنی اے۔ بی۔ سی کے حساب سے جو لفظ اس گاڑی کی پارکنگ پر لکھا تھا، نوٹ کرلیا۔

چونکہ پارکنگ ایریا قریب قریب تھے، فلورز گولائی میں اوپر ہی اوپر جاتے تھے، اس لیے بعض اوقات فلور نمبر یاد رکھنے کے باوجود جگہ یاد نہ رہتی تھی۔ خیر احتیاطاً گُڈی نے لکھ لیا تھا اور کچھ اور نشانیاں بھی ہم نے یاد کرلی تھیں۔

کار پارک کر کے شمیم لفٹ کی طرف بڑھی۔ ہم بھی اس کے ساتھ لفٹ میں آئے۔ چند سیکنڈ میں ہم تاج محل کے بیرونی ہال میں تھے۔ یہاں سے چلتے ہوئے ہم دوسرے ہال میں پہنچے۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ خوش گپیوں میں مصروف کچھ گرلز فرینڈز اور کچھ بوائے فرینڈز کے ساتھ شادی شدہ جوڑے بھی تھے۔ ادھیڑ عمر کے لوگ کچھ زیادہ ہی تھے۔ جس ہال سے ہم گزر رہے تھے، اس کے در و بام چمک رہے تھے۔ دیواروں پر بڑے ہی نادر فریموں میں تصویریں لگی تھیں۔ زیادہ تر گھوڑوں اور بگھیوں کی مشرقی طرز کی تصاویر تھیں۔

آگے ایک طرف ریسٹورنٹ تھا جس میں میزوں کے گرد لوگ بیٹھے تھے۔ ہمارے اور ان کے درمیان شیشے کی لمبی چوڑی دیوار تھی۔ یہاں ریسٹورنٹ میں صرف کیسینو کے ممبر یا ان کے ساتھ ان کے دوست احباب ہی کھانا کھا سکتے تھے۔ ریسٹورنٹ کا ہال شیشے کی دیوار کی وجہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ کچھ لوگ کھا پی رہے تھے۔ کچھ گپ شپ لگا رہے تھے۔ ہال کے ایک طرف سٹینڈز پر کھانے کی رنگا رنگ ڈشیں سجی تھیں۔ کئی قسم کے سلاد تھے۔ بوفے تھا، لوگ خود ہی اٹھ اٹھ کر اپنی پسند کا کھانا لے رہے تھے۔

اس ہال کے ایک سرے سے متحرک زینے کے ذریعے ہم نیچے آ گئے۔ یہ ایک بے حد خوبصورت ہال تھا۔ سرخ و سنہرے کا امتزاج نظروں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ اس کے ارد گرد اور بھی کئی ہال تھے۔ اسی طرح سرخ دبیز قالینوں سے ڈھکے۔ روشنیوں سے جگمگاتے۔ سنہری ریلنگز اور چمکتی جالیوں سے خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ ان ہالوں میں قطار در قطار سلاٹ مشینیں نصب تھیں جن کے سامنے کرسیوں پر لوگ بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی سلاٹ مشین اور اپنی کوئنز میں مگن تھا۔

سلاٹ مشین ایک ڈبہ نما مشین ہوتی ہے جس میں دائیں طرف ایک ہینڈل لگا ہوتا ہے۔ مشین پر چھوٹی سی سکرین ہوتی ہے۔ ایک طرف کائن ڈالنے کے لیے لمبوترا سوراخ اور دوسری طرف اندر ہی بلب ہوتا ہے۔ سوراخ میں کائن ڈال کر ہینڈل کھینچتے ہیں۔ سکرین پر کچھ نشان جو پھولوں وغیرہ کی تصویر سے مشابہ ہوتے ہیں، نظر آتے ہیں۔ یہ سب تین لکیروں میں ایک سیدھ پر آ جائیں تو بائیں ہاتھ کا بلب روشن ہوتا ہے اور چھن چھن کرتے سکے مشین کے نیچے لگی ٹرے میں گرتے ہیں یعنی کھیلنے والے نے گرنے والے سکے جیت لیے ہیں۔ جو کئی ڈالر کے بھی ہو سکتے ہیں، دو ایک ڈالر کے بھی...... اسی طرح کائن ڈالنے پر سیدھ میں پھول پتوں کی شکلیں نہ آئیں تو سکے نہیں گرتے...... یعنی کھیلنے والا کچھ نہیں جیتا 'ہارا' ہے۔

مختلف ہالوں میں بے شمار مشینوں کے سامنے لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ کھیلنے والوں کے پیچھے کھڑے ان کی ہار جیت دیکھ رہے تھے۔ جب کائنز چھناکے سے گرتے اور زیادہ گرتے تو سب شور مچا دیتے۔ ہرا کے فلک شگاف نعرے لگاتے۔ لوگ دوڑ دوڑ کر اس طرف جاتے کہ کھیلنے والا کتنے ڈالر جیتا ہے۔ بس ایک میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔ زیادہ تر معمر لوگ وقت گزاری کے لیے یہاں آتے ہیں اور سارا سارا دن سلاٹ مشینوں پر بیٹھے رہتے ہیں۔ اٹھارہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کو گیمبلنگ کی اجازت نہیں۔ ان کا ان کیسینوز میں آنا منع ہے۔

تاج محل بے حد خوبصورت، خوشنما، رنگین و حسین کیسینو ہے۔ جگمگ جگمگ کرتے

ہال، رنگدار سلاٹ مشین، صاف ستھرے لوگ۔ اس کے علاوہ عریاں لباسوں میں نوجوان حسین وجمیل عورتیں لوگوں کی فرمائش پر چائے کافی یا دیگر مشروب لیے ادھر سے اُدھر پھرتی توجہ کا مرکز بنی ہوتی ہیں۔

سلاٹ مشینوں پر تو کوارٹ اور ففٹی سینٹ کے کائنز سے جوا کھیلا جاتا ہے لیکن ہال کے درمیان میں ٹیبلز لگی ہوتی ہیں جن پر ڈالرز سے جوا کھیلنے والے امیر کھلاڑی بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہاں ہزاروں لاکھوں کا جوا کھیلا جاتا ہے۔ کھلانے والے اردگرد کھڑے ہوتے ہیں۔ ویٹریس خاص طور پر ان کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ ڈرنکس چلتی ہیں۔ عام طور پر کھلاڑی سب کچھ ہار کر ہی اٹھتے ہیں۔

تاج محل کی اوپر والی منزل پر ہوٹل ہے جہاں رہائشی کمرے ہیں۔ ہال ہیں۔ یہاں گیمبلنگ کے لیے امراء، روساء آ کر ٹھہرتے ہیں۔ جوئے کے لیے بھی انہیں نیچے نہیں آنا پڑتا۔ ٹیبلز اوپر ہی ہال میں لگی ہوتی ہیں۔ یہاں لاکھوں کروڑوں ڈالر کا جوا کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑی ساری ساری رات گیمبلنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں خاصی بڑی تعداد عرب شیوخ کی ہوتی ہے۔ عورتیں مرد بھی یہاں جوا کھیلتے ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے لیے بھی اوپر ہی بڑا اپوش ریسٹورنٹ ہے۔

نچلے ہال والوں کے لیے بھی ریسٹورنٹ ہے۔ جہاں اکثر ممبران ہی کھانا کھاتے ہیں۔ عام کھلاڑی اور تماشائی بھی وہاں کھانا کھا سکتا ہے۔ یہ ریسٹورنٹ بے حد خوبصورت ہے۔ کھانے کی بے شمار چیزیں سٹینڈوں پر رکھی ہوتی ہیں۔ ہر قسم کے سلاد بڑی خوبصورتی سے سجائے ہوتے ہیں۔ بوفے ہوتا ہے۔ جتنا جی چاہے اور جو جی چاہے کھاؤ۔ چندرہ سولہ ڈالر فی کس خرچ آتا ہے۔ جو لوگ افورڈ نہیں کرتے یا کھانا نہیں چاہتے، وہ باہر جا کر برگر کھا لیتے ہیں۔ برگر کی شاپس باہر عام ہیں۔

تاج محل اردو کا لفظ ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آئی، اس کیسینو کا نام تاج محل کیوں رکھا گیا ہے۔ ہے تو یہ محل کی ہی طرح لیکن پیلس کیوں نہیں کہا جاتا اسے...... تاج محل آگرہ میں ہے لیکن اس کی وضع قطع یا نقشہ بھی تو اس تاج محل سے نہیں ملتا۔ شاید گلیمر کی وجہ سے اسے

تاج محل سے نسبت دی گئی ہے لیکن یہاں تو زندہ گلیمر ہے، تاج محل آگرہ کا اس طرح کا گلیمر تو اک کہانی بن چکی ہے۔ اب شاندار اور خوبصورت عمارت ہی رہ گئی ہے۔ جگمگاہٹیں رونقیں اور ہلچل اب اس طرح کی تو وہاں نہیں۔

خیر

مجھے وہاں موقع نہیں ملا کہ میں اس نام کی وجہ تسمیہ پوچھتی۔ شمو سے پوچھا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا۔

ہم نے گھوم پھر کر تاج محل کی ایک ایک چیز دیکھی۔ باہر اینٹوں کی سڑک کے کنارے کنارے جتنی دکانیں تھیں، ان میں بھی گئے۔ ایک فن ہاؤس بھی دیکھا۔ سمندر کے کنارے Board Walk پر جا کر سمندر کے اندر تک جانے والی سٹرپس پر بھی گھومے پھرے......

شام اترنے سے پہلے واپسی ہوئی۔ شمو نے آج ہمیں خوب سیر کرائی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی ریسٹورنٹ میں کھلایا تھا۔ تاج محل کے قریب ہی دوسرا کیسینو سنو بوٹ بھی دکھایا۔ وہ قدرے پرانا تھا۔ سجا سجایا وہ بھی تاج محل کی طرح تھا لیکن چمک دمک قدرے ماند پڑ چکی تھی۔ یہاں بھی ویسے ہی ہال، سلاٹ مشینیں، ٹیبلز، ویٹریس، نوخیز نیم عریاں لباسوں میں امریکی لڑکیاں مشروبات اور شراب کے جام پیش کرتی پھر رہی تھیں۔ یہاں بھی رش کافی تھا۔

یہ چیزیں ہم نے پہلی بار دیکھی تھیں۔ نیا تجربہ تھا۔ واپسی پر ہم نے ایک دکان سے سووینئرز بھی خریدے۔

رات اتر چکی تھی۔ جب ہم تقریباً تین گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد گھر پہنچے۔

اگلے چند دن ہماری مصروفیات الگ الگ رہیں۔ نسیمی آمنہ کے ہاں چلی گئی۔ میں بشریٰ کے ساتھ آ گئی۔ گڈی اور رقیہ شمو کے ہاں ہی رہیں۔ احمد ان دنوں پارٹ ٹو کی تیاری کر رہا تھا۔ گڈی نے اسے امریکہ ہی میں چھوڑ کر واپس جانا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔

میں نے صائمہ نسیم کے ہاں بھی ملنے جانا تھا۔ وہ کئی دفعہ آنے کا کہہ چکی تھی۔
چنانچہ ایک دن بشرہ، فاران اور میں صائمہ کے ہاں گئے۔ ان دنوں وہ کوینز میں رہتی تھی۔ چار کمروں کا فلیٹ تھا لیکن یہ علاقہ خاصا پرانا تھا۔ فلیٹ بھی پرانے تھے۔ گرد و پیش تو ویسا ہی تھا جیسا امریکہ کی ہر آبادی کا ہوتا ہے۔ صائمہ نے اس گھر کو خوبصورتی سے سجا رکھا تھا۔ اس کے شوہر نسیم اور دونوں بچے خوش باش تھے۔ نسیم بہت اچھے اور خوش خلق آدمی ہیں۔ صائمہ اور وہ آپ بھرپور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ صائمہ میرے دیور کی بیٹی ہے۔ خوبصورت، ٹیلنٹڈ اور خوش مزاج...... ان ساری باتوں کا عکس اس کے گھر سے عیاں تھا۔ اب تو سنا ہے، انہوں نے مین ہٹن میں بہت ہی خوبصورت گھر بنوالیا ہے...... صائمہ، نسیم اور بچوں سے مل کر خوشی ہوئی۔

رات کھانے کے بعد ہم پھر بشرہ کے ہاں رنگر روڈ آ گئے۔

دو دن ہی بشرہ کے ہاں رہ پائی کہ شمو کے فون آنے لگے۔ وہ مجھے خود ہی لینے آ گئی۔ دن بشرہ کے ہاں گزار کر شام مجھے ساتھ لے گئی۔ نسیمی بھی آمنہ کے گھر سے آ گئی۔ اب ہم پھر چاروں شمو کے ہاں تھیں۔

اور

گھومنے پھرنے کے پروگرام بن رہے تھے۔

نیویارک ہم ایک دو بار اکیلے جا چکی تھیں۔ اس لیے کوئی پرابلم نہ تھی۔ ہم چاروں نے سمجھوتہ کر لیا کہ اب نیویارک اکیلے ہی جایا کریں گے۔ یوں تو پورے نیویارک کو دیکھنا ممکن نہ تھا لیکن چیدہ چیدہ چیزیں تو دیکھنی تھیں۔

اس دن ہم نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر (جو کہ اب مرحوم ہو چکا ہے) دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ خالدہ اور آمنہ سے کچھ معلومات لیں اور بقول خالدہ فور گولڈن گرلز جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

آمنہ ہمیں وینڈی بس سٹاپ پر اتار آئی۔

بس پر حسب دستور سوار ہوئے اور پورٹ اتھارٹی میں جا اترے۔ جہاں سے نکل

کر ہم باہر فٹ پاتھ پر آ گئے۔ جہاں رنگا رنگ لوگوں کا ہجوم تھا۔ سٹورز اور دکانیں آنے جانے والوں سے بھری تھیں۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ ہم نے پیدل ہی فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ زندگی بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی تھی جس ایونیو کے فٹ پاتھ پر ہم چل رہے تھے۔ وہاں ہر کوئی مصروف تھا۔ کہیں رنگین چھاتوں والے ٹھیلا قسم کے رنگا رنگ چیزوں سے لدے خرید و فروخت کے چلتے پھرتے مرکز تھے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے بانسوں پر بورڈ لگائے خیرات مانگنے والے بیٹھے تھے۔ کہیں مصور آنے جانے والوں کو گھیر کر قائل کر کے ان کی تصویریں بنانے میں مصروف تھے۔ چند منٹ میں تصویری خاکہ بنا کر ان کے حوالے کرتے۔ پندرہ بیس ڈالر مانگتے لیکن گاہک قیمت کم کراتے کراتے پانچ ڈالر دے کر تصویر تھامے جان چھڑاتا...... کسی جگہ کالے کوئی آرگن بجا کر پیسے بٹور رہے تھے۔ ایک جگہ ہم نے چھابڑی نما سٹینڈ بھی دیکھا۔ ایک مفلوک الحال امریکن نمکین چنوں کے پیکٹ اور میٹھی گولیاں بیچ رہا تھا۔

ہر جگہ ہجوم ہی ہجوم تھا۔

سنا تھا۔ اسی ہجوم کا فائدہ اٹھا کر بعض جیب کترے لوگوں کی جیبیں بڑی صفائی سے کاٹ کر پرس اڑا لے جاتے ہیں۔

دھوکہ دہی کے واقعات بھی اکثر پیش آتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص ہاتھ میں کوئی کھانے پینے کی چیز یا چینی کا کوئی برتن...... ٹوٹ جانے والا کھلونا لیے گزر رہا ہوگا تو جان بوجھ کر سامنے سے آنے والے سے ٹکرا کر چیز ہاتھ سے گرا دے گا اور پھر جس کے ساتھ وہ ٹکرایا ہوگا، اس سے جھگڑنے کیا لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا کہ میرا اتنا نقصان کر دیا۔ اب وہ بے قصور بیچارہ لاکھ سوری سوری کہے لیکن وہ نہیں مانے گا۔ ہرجانے کے طور پر دس بیس ڈالر لے کر ہی ٹلے گا۔

نیویارک جہاں بے انتہا خوبصورتیوں کا شہر ہے، وہاں ایسی بدصورتیوں کی بھی کمی نہیں۔ ایسے ایسے بہت واقعات سننے میں آئے تھے۔ ان فٹ پاتھوں پر اکثر حسین و جمیل عورتیں جذبات انگیز لباسوں میں ملبوس ہیروئن کا کاروبار بھی کرتی پائی جاتی ہیں...... ناروا

داؤ دکھاتے ہوئے مردوں کو سگریٹ کی پیشکش ان کا پہلا حربہ ہوتا ہے...... پھر بے تکلفی پر اتر آتی ہیں۔ قربتوں کو مہکاتی ہیں اور اپنا کام شروع کر دیتی ہیں۔

ڈیس کی منتظر لڑکیاں بھی اپنا شکار تلاش کرنے کو یہاں گھومتی پھرتی رہتی ہیں۔

گوری رنگت، سنہری بال، نیلی آنکھیں اپنا سحر دکھاتی ہیں اور شکار قابو میں آ جاتا ہے۔

ہم چاروں یہ انوکھے نرالے تماشے دیکھتے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں لیکن یہ واقعات عام نہیں ہیں۔ ہر کوئی اپنے آپ میں مگن اپنے کام میں مصروف ہے۔ ہر بات کی دوڑ لگی ہوئی لگتی ہے۔

ہم چلتے چلتے کافی آگے نکل آئیں۔

''ہم نے تو آج ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ دیکھنا تھی۔''

''وہی تو دیکھنے آئے ہیں......''

''لیکن وہ ہے کہاں؟''

''یوں کرتے ہیں۔ ٹیکسی لے لیتے ہیں۔ وہ ہمیں وہاں پہنچا دے گی۔ آمنہ اور خالد نے جو جگہ بتائی تھی، اس کا تو کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا۔ کس سٹریٹ سے نکل کر اس ایونیو میں جانا ہے......''

''ٹیکسی ٹھیک رہے گی۔ کہاں تک پیدل چلیں گے؟''

ٹیکسی لینے پر اتفاق کر کے ہم نے ایک پیلی کیب کو رکنے کا اشارہ کیا۔

یہ ٹیکسی ایک امریکن چلا رہا تھا۔

اس نے ٹیکسی روکی۔ دروازہ کھولا...... انگریزی میں پوچھا ''کہاں جانا ہے؟''

''ورلڈ ٹریڈ سنٹر۔'' گڈی نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ ہم سب بیٹھ گئے تو میٹر گھما کر پیچھے زیرو پر کیا اور گاڑی چلا دی۔

اس کے ایک ہاتھ میں اخبار تھا۔

گاڑی چلاتے ہوئے وہ اخبار پر بھی نظریں ڈال رہا تھا۔ ہمیں ڈر لگا۔ اتنی ٹریفک ہے۔ کہیں گاڑی بے توجہی سے چلاتے ہوئے کسی کو مار ہی نہ دے لیکن وہ اپنے دونوں

کاموں میں منہمک تھا۔ نہ اس نے ہماری طرف دیکھا، نہ ہی کوئی بات کی۔ مختلف سٹریٹس اور ایونیوز سے ہوتا ہوا وہ ہمیں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے سامنے لے آیا۔ بل مانگا، پیسے لیے اور آگے بڑھ گیا۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تصویریں دیکھی تھیں یا سن رکھا تھا کہ بہت ہی اونچی عمارت ہے لیکن اسے دیکھا تو مبہوت رہ گئے۔ اس قدر اونچی عمارت ہے کہ گردن پیچھے کندھوں پر بھی ڈال کر دیکھیں تو اوپر تک نظر نہ آئے۔ یہ انسانی ہاتھوں کا عجوبہ تھا۔ یہاں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ سیاح اسے دیکھنے آئے تھے۔ کام کرنے والے اپنے دفتروں میں آ جا رہے تھے۔

دو سٹریٹس کے کناور پر یہ عمارت ایستادہ ہے۔ نیچے برآمدے ہیں جہاں سے لوگ پیدل یا گاڑیاں پارک کر کے عمارت کے اندر جانے کے لیے آتے ہیں۔ دو ایک جگہ عمارت کے متعلق لٹریچر میزوں پر رکھا تھا اور پمفلٹ بک رہے تھے۔ بہت بڑے گیٹ سے اندر جانے کا راستہ تھا۔

باہر سے بڑا سر اٹھا اٹھا کر عمارت کی اونچائی کا اندازہ کرنے کی کوشش کی لیکن دیکھنا ممکن نہ تھا۔

نسیمی ہنس کر بولی۔ ''سڑک پر لیٹ کر دیکھیں تو اس کی آخری منزل شاید نظر آ جائے۔''

''اب ایسا بھی نہ کرنا...... سیدھی طرح اندر چلتے ہیں اور اوپر جا کر دیکھتے ہیں۔ بجائے نیچے سے اوپر دیکھیں، اوپر سے نیچے دیکھنا آسان ہوگا۔''

''بالکل۔''

ہم سب گیٹ کی طرف بڑھے اور ایک بہت ہی بڑے ہال میں داخل ہو گئے۔

اس ہال میں چاروں طرف بے شمار کمروں کے دروازے نظر آئے تھے۔ یہاں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ ایک کونے میں چند سیڑھیاں چڑھ کر ٹکٹ گھر تھا جہاں سے لفٹ میں اوپر جانے کے ٹکٹ ملتے تھے۔

یہ عمارت کوئی ایک ہزار تین سو فٹ اونچی تھی۔ ایک سو دس منزلہ یہ عمارت بے حد

شاندار تھی۔ اب تو تھی کہنا ہی مناسب رہے گا کیونکہ اس عجوبے کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

اس عمارت کی ہر منزل پہ کمپنیوں کے دفاتر، بینک، شاپنگ سنٹر، ریسٹورنٹ، فلیٹس، ڈے کیئر سنٹر، بزنس مینوں کے دفاتر...... کیا بتائیں کہ کیا کچھ تھا۔ اس کی چاروں طرف کی بیرونی کھڑکیوں کی تعداد چھیالیس ہزار کے قریب تھی۔ تیز رفتار لفٹیں لگی تھیں جو چند سیکنڈوں میں مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیتی تھیں۔ لفٹ کی برق رفتاری جادوئی عمل لگتا تھا۔

ہم نے ٹکٹ خریدے اور لفٹ کی طرف بڑھیں۔ جس لفٹ میں ہم نے جانا تھا، گائیڈ نے ہمیں بتا دیا......

اس عمارت میں تقریباً پچیس تیس لفٹیں ہر آن ہر سیکنڈ لوگوں کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر لے جاتی تھیں۔

یہ عمارت لوہے، کنکریٹ اور اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ امریکن آرکیٹیکٹ Minoru Yamasaki نے اسے ڈیزائن کیا تھا۔ یہ دراصل دو عمارتیں ہیں۔ اس آرکیٹیکٹ کا کارنامہ جوڑا چمکتے ہوئے ٹاور تھے جو عمارت کے اوپر بنے تھے اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی شناخت تھے۔

یہ عمارت تقریباً سولہ ایکڑ پر بنائی گئی تھی اور اس کے تخلیق کار کا دعویٰ تھا کہ یہ عمارت اتنی مضبوط ہے کہ اسے توڑنے یا گرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پروردگارِ عالم کے دعوے سچے اور انسان کے کچے ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے زمین بوس ہونے سے واضح ہو گئی ہے۔

ہم چاروں لفٹ میں سوار ہو گئیں۔ یہ ایک خاصا بڑا کمرہ تھا جس میں پہلے سے کافی لوگ بھرے تھے۔ ایک کونے میں لفٹ چالو کرنے اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے ایک گائیڈ کھڑا تھا۔

ہم چاروں ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ لفٹ میں امریکن بھی تھے۔ چینی بھی، انگریز بھی اور کچھ دوسرے ایشیائی لوگ بھی۔ عورتیں مرد ساتھ ساتھ کھڑے تھے لیکن نہ تو کسی کی نگاہوں میں بدتمیزی تھی، نہ ہی کسی بدنی حرکت سے کوئی نازیبا اشارے کر رہا تھا۔ اوکل

لوگ بھی تھے اور سیاح بھی۔

لفٹ چلی۔

گائیڈ نے چند جملے ٹریڈ سنٹر کے بارے میں کہے۔ پھر بولا۔ ''ہم 58 سیکنڈ میں 107 ویں منزل پر پہنچ گئے ہیں۔''

یا خدا۔

107 ویں منزل پر صرف 58 سیکنڈ میں۔

لفٹ کی برق رفتاری کا اندازہ کیجیے۔

خیر

ہم جیسے تھرڈ ورلڈ کے لوگوں کے لیے امریکہ میں اور بھی بے شمار و بے انتہا حیران کن چیزیں ہیں۔

لیکن یہ لفٹ کا کمال......

اس سنٹر میں تقریباً پچیس تیس ایسی ہی لفٹیں تھیں جو لوگوں کو سیکنڈوں میں مطلوبہ منزلوں تک پہنچاتی اور واپس لاتی تھیں۔ اتنی تیز رفتاری نہ ہوتی تو سوچیے ایک سو دس منزلہ عمارت کے اوپر تک پہنچنے یا نیچے آنے میں کیا حال ہوتا۔

107 ویں منزل پر ہم لفٹ سے باہر آئے۔ عمارت کے چاروں طرف بڑے بڑے شیشوں کی کھڑکیاں تھیں۔ جن کے آگے آرام دہ صوفہ نما سیٹیں تھیں۔ یہاں سے بیٹھ کر نیویارک کا نظارہ بڑا دلفریب تھا۔ ایک طرف سمندر حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف مین ہٹن کی خوبصورت آبادی نظر آ رہی تھی۔ دور سمندر میں سٹیچو آف لبرٹی ایک گڑیا کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

نیچے رواں دواں سڑکیں تھیں جن پر کاریں، بسیں دوڑ رہی تھیں۔ ان کا سائز ماچس کی ڈبیوں جتنا لگ رہا تھا۔ پیدل چلتے لوگ چھوٹے چھوٹے آٹومیٹک کھلونے دکھائی دیتے تھے۔

یہاں ایک ریسٹورنٹ بھی تھا۔ اتنی اونچائی پر لوگ مزے سے برگر، چپس کھا پی

رہے تھے۔ کافی کے سٹال پر گئے کے ڈسپوزیبل گلاسوں میں کافی مل رہی تھی۔ کھانے پینے کی بہت سی چیزیں تھیں۔ لوگ اونچائی کو انجوائے کرتے ہوئے کھا پی رہے تھے۔ 107 ویں منزل تک لفٹ جاتی تھی۔ باقی تین منزلوں کا فاصلہ سیڑھیاں چڑھ کر طے کرنا تھا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے۔

عجب نظارہ تھا۔

اوپر آسمان

اور ٹریڈ سنٹر کے اوپر ہم لوگ...... تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ یہاں چاروں طرف آہنی جنگلے لگے ہوئے تھے۔ نوکدار سلاخیں بھی تھیں۔ اس لیے کہ لوگ عین کنارے تک پہنچ کر کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس آخری منزل پر دنیا کی بلند ترین دوربین بھی نصب ہے جس میں سیاروں کی نقل و حرکت دیکھی جاتی ہے۔ چمکتے ہوئے ٹاورز کا جوڑا شاید یہی دوربین تھی۔

ہم چاروں بڑے تجسس سے چیزیں دیکھتے ہوئے خود ہی اندازے لگا رہی تھیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ وہ کیا ہے؟ اوپر سے ایک بار نیچے سڑکوں کو جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تو چکر سا آ گیا۔ جی متلانے لگا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ کر سب سے بولی۔ "چلو واپس چلیں......"

"کیوں آپا......" نسیمی بولی۔ "تھوڑی دیر اور اردگرد کے نظاروں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ دیکھیں نا، نیویارک کیسا نظر آ رہا ہے۔"

"کتنے فخر کی بات ہے۔ ہم نیویارک اپنے سے نیچا دیکھ رہے ہیں۔" گڈی ہنسی۔

"واقعی۔" رقیہ بولی۔ "جو عمارتیں اتنی اونچی اونچی لگتی تھیں، اب کتنی ٹھگنی ٹھگنی لگ رہی ہیں۔" رقیہ کی بات پر ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

میں ایک لوہے کے شہتیر پر بیٹھ گئی۔ باقی تینوں چھت کے اوپر چاروں طرف گھومتی پھرتی رہیں۔ بہت سے اور لوگ بھی یہاں موجود تھے۔ عورتیں، مرد بھی نیویارک کے مختلف اطراف سے نظارہ لے رہے تھے۔ کچھ کے پاس دوربینیں بھی تھیں۔ ایک ہم تھے

کہ کیمرہ تک ساتھ نہ لائے تھے کہ ان یادگار لمحوں کو مقید کر لیتے۔

سیڑھیاں اتر کر واپس 107 ویں منزل پر آئے۔ شاندار ریسٹورنٹ میں کافی رش تھا۔ شعلہ رو ویٹریسز گاہکوں سے آرڈر لے رہی تھیں۔ مسکراہٹیں لٹاتے کھانے پینے کی چیزیں ان کے سامنے رکھ رہی تھیں۔ خیر مقدمی لفظ "ہائے" ہر آنے والے کو مسکرا کر کہہ رہی تھیں۔ گاہکوں میں جوان لڑکے لڑکیاں بھی تھے۔ پختہ عمر مرد و عورتیں بھی رنگا رنگ لباسوں میں چمکتے دمکتے چہرے ریسٹورنٹ کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔

ہم چاروں بھی ایک ٹیبل پر آن بیٹھیں۔ خوب بھوک لگ رہی تھی۔ کھانے کا آرڈر کیا اور اردگرد پھیلے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر قیافے لگانے لگیں کہ کون بوائے فرینڈ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ہے۔ کون میاں بیوی ہیں۔ کون سیاست کے لیے اکیلا آیا ہوا ہے۔ کون زیادہ انجوائے کر رہا ہے اور کون زیادہ ایکسائٹڈ ہے۔

ہم چاروں نے بھی کھانے کا آرڈر دیا۔ کافی بھی منگوائی۔ کوک' آئس کریم بھی دستیاب تھی۔ دیگر مشروبات بھی تھے۔ لوگ اپنی اپنی پسند کی چیزیں میزوں کے گرد بیٹھے کھا رہے تھے۔ کچھ ہاتھوں میں پکڑے کھڑکیوں کے سامنے پڑے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ گھوم پھر کر چاکلیٹس کے مزے لیتے ہوئے اردگرد پھیلے ہوئے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم لوگوں نے اتنی اونچائی پر بنے واش روم بھی دیکھے۔ اتنے صاف ستھرے، پانی کی فراوانی، انسانی محنت کا کمال تھا۔ واقعی بندہ عش عش کر اٹھتا ہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگوں نے پھر چاروں اطراف کی شیشے کی دیوار نما کھڑکیوں سے سمندر اور نیویارک کا نظارہ کیا۔ واپس جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لوگ آ رہے تھے، جا رہے تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی۔

کوئی چار بجے کے قریب ہم اسی لفٹ سے واپس ہوئے۔ 58 سیکنڈ میں لفٹ ہمیں نیچے لے آئی۔ کچھ دیر ہم یہاں گھومتی پھرتی رہیں۔ لفٹیں آ جا رہی تھیں۔ کوئی کسی منزل پر جا رہا تھا، کوئی کسی پر...... یہاں کتابوں کی دکانیں تھیں، کئی سووینئر کے سٹال تھے۔ ہم نے بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا ایک ایک پوسٹر لیا۔ نیچے آ کر پتہ چلا کہ اس سنٹر میں ایک

بائیس منزلہ ہوٹل بھی ہے۔ وہاں لوگ قیام بھی کرتے ہیں اور تفریحاً بھی جاتے ہیں۔ امریکہ کا یہ فائیو سٹار ہوٹل بھی دیکھنے کی چیز تھا لیکن اب پھر اوپر جانے اور اس ہوٹل کی ہر منزل دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ آج تو ہمیں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ بھی دیکھنا تھی لیکن پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ اس سنٹر سے نکلتے نکلتے ہی چار بج چکے تھے۔ ہم نے واپس نیو جرسی بھی جانا تھا۔ اس لیے ٹیکسی پکڑی اور پورٹ اتھارٹی جا پہنچے۔ وہاں اندر جانے سے پہلے دو ایک سٹوروں میں ونڈو شاپنگ کی اور پھر بس پکڑنے کے لیے پورٹ اتھارٹی چلے آئے جہاں صبح سے بھی زیادہ ہجوم تھا۔

تیسرے دن ہم پھر نیو یارک جا رہے تھے۔ اس دفعہ سب ریلوے سے سفر کا پروگرام بنا۔ آمنہ ہمیں سٹیشن پر ڈراپ کر آئی۔ نیو یارک جانے والی یہ ٹرین کہیں سرنگ کے اندر سے جاتی ہے۔ کہیں باہر نکل آتی ہے۔ یہ کیسا تجربہ ہوتا ہے۔ ہم سب اس کے مشتاق تھے۔

حسب معمول ٹکٹ خریدے۔ جنگلے میں کائن ڈالا۔ وہ گھوما اور ہم باری باری اندر چلے گئے۔ نیچے اترتے چلے گئے۔ پھر پلیٹ فارم پر آ گئے۔ معلومات کے دفتر کا بورڈ سامنے ہی لگا تھا۔ اس لیے ہم پہلے ادھر گئیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہم نے کس سمت جانے والی کونسی ٹرین پر بیٹھنا ہے۔ روز کے آنے جانے والے تو عادی لوگ ہوتے ہیں۔ انھیں سب پتہ ہوتا ہے لیکن سیاحوں اور ایسے لوگوں کی سہولت کے لیے جو پہلی بار سب وے سے سفر کر رہے ہوں، معلومات فراہم کرنے کے لیے دفتر میں عملہ موجود ہوتا ہے جو بڑی خندہ پیشانی سے مسافر کو سمجھاتا اور اس کے ہر سوال کا جواب مسکراتے ہوئے دیتا ہے۔

ہم معلومات حاصل کر کے پھر پلیٹ فارم پر آ گئے اور اس طرف کھڑے ہو گئے جہاں نیو یارک جانے والی ٹرین نے آنا تھا۔ یہاں بیٹھنے کے لیے بنچ بھی پڑے تھے لیکن ہم بیٹھنے کی بجائے گھوم پھر کر پلیٹ فارم دیکھنے لگے۔ زیرِ زمین رہنے والے لوگوں کے رہائشی ٹھکانے دیکھنے کا بھی شوق تھا کہ لوگ کس حال میں کس طرح یہاں رہتے ہیں۔

پلیٹ فارم ایک بہت بڑا سا ہال ہوتا ہے جس میں ٹرین کی پٹڑیاں بچھی ہوتی

ہیں۔ دونوں طرف پختہ فرش جس پر بنچ وغیرہ پڑے ہوتے ہیں، معلومات کا دفتر اور سٹیشن سے باہر جانے یا اندر آنے کا متحرک زینہ بھی ہوتا ہے۔ کہیں لوہے کی سیڑھیاں بھی ہوتی ہیں...... کیونکہ بعض جگہ پلیٹ فارم اوپر بھی ہوتے ہیں یعنی گاڑیاں اوپر بھی آتی جاتی ہیں۔

پلیٹ فارم چھوڑنے کے بعد ٹرین ایک سوراخ نما سرنگ میں داخل ہو جاتی ہے اور برق رفتاری سے چلتی اگلے سٹیشن کے ہال میں سرنگ سے نکل کر آ جاتی ہے۔ نیو یارک تک آتے ہوئے گاڑی کے کئی سٹاپ ہوتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں جانے والے مختلف سٹاپس پر اترتے چڑھتے ہیں۔

آج ہمارا ارادہ زیرِ زمین رہنے والوں کی رہائشی جگہیں دیکھنے کا تھا۔ اس لیے ہم پلیٹ فارم کے آخری سرے تک جانا چاہتی تھیں۔

"ہائے آپا" رقیہ جوں جوں ہم سرنگ کے قریب آ رہے تھے، ڈرتے ہوئے بولی۔ "کدھر جا رہی ہیں۔ واپس چلیں گاڑی آنے والی ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں۔" نسیمی بولی۔ "یہ گاڑی نکل گئی تو ہم دوسری لے لیں گے۔ سارا دن گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔"

"لیکن مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ پلیٹ فارم چند فٹ کا رہ گیا ہے اور اندھیرا بھی......" رقیہ نے کہا۔

گڈی ہنس کر بولی۔ "بھابی ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

گڈی بات پوری بھی نہ کر پائی تھی کہ نسیمی بولی۔ "دیکھیں...... ادھر دیکھیں...... گتے کے خالی کارٹن یوں جوڑے گئے ہیں جیسے دیوار بنائی گئی ہو۔"

"ہاں...... یہ ضرور کسی کا گھر ہوگا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ گتے یا لکڑی کے ڈبوں کو اوپر نیچے رکھ کر ساتھ میٹرس بچھائی جاتی ہیں جہاں رات کو اس پر آ کر یہ زیرِ زمین رہنے والے غریب لوگ سو جاتے ہیں۔"

ہم نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دونوں طرف گتے کے کارٹن اور بیچ میں ایک گندا سا میلا کچیلا گدا پڑا تھا جس کے سرہانے ایک کارٹن پر شاید گھٹیا قسم کی شراب کی بوتل اور ایک

گندا سا گلاس تھا...... ایک طرف میلے کچیلے بڑے بڑے دو اوور کوٹ بکھرے تھے۔

ہم ابھی تانک جھانک کر ہی رہے تھے کہ پیچھے سے ہائے کی آواز آئی۔ ہم نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ ایک لنگڑا امریکی جس کے بوسیدہ کپڑوں سے ہمک آ رہی تھی، ہمارے قریب آ گیا۔ ہم چاروں ڈر گئیں لیکن سنبھلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

پھر ہم نے معذرت کی کہ بغیر اجازت اس کی جگہ دیکھ رہے تھے۔

''اوہ۔ کوئی بات نہیں......'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''یہ میرا گھر ہے۔''

''کون ہے جینیفر؟'' چند فٹ کے فاصلے پر ایک ایسے ہی گھر سے آواز آئی۔ نسوانی آواز ایک بھدی سی کالی عورت کی تھی۔ وہ بھی اس آدمی کی طرح میلا کچیلا لباس پہنے تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ لکڑی کی پارٹیشن نما دیوار ہٹا کر باہر نکل آئی۔ رقیہ اسے دیکھ کر ڈر گئی۔

''چلو بھئی۔ یہاں خواہ مخواہ آن گھسی ہیں یہ۔'' رقیہ نے تقریباً غصیلے لہجے میں کہا۔

''ادھر زیادہ لوگ بھی نہیں، روشنی بھی کم ہے۔''

''چلو واپس چلتے ہیں۔'' میں نے کہا

''ہائے آپا۔ یہاں آ ہی گئے ہیں تو ذرا ان سے کچھ باتیں ہی کریں۔ کون ہیں یہ لوگ اور امریکہ جیسے متمدن ملک میں یہ ایسی زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔'' گڈی بولی۔

''تم اپنی تحقیقات رہنے ہی دو۔'' رقیہ پھر خفا ہوئی۔

''ہاں چھوڑو یہ سب۔ چلیں ٹرین آنے والی ہے۔''

''کیا تم لوگ انڈین ہو؟'' اس امریکی نے سوال کیا۔

''ہم پاکستانی ہیں۔''

اسے پاکستان کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ عورت بھی قریب آ گئی تھی، بولی۔ ''پاکستان کہاں ہے؟''

اب ہم اس سے مغز کھپائی کیا کرتے۔ چلتے چلتے اس سے پوچھا کہ وہ لوگ اس طرح کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں......؟

وہ دونوں مسکرائے۔ عورت بولی۔ ''کیا بری زندگی ہے؟ ہم سارا دن باہر ہی

رہتے ہیں۔ یہاں صرف سونے کے لیے آتے ہیں۔ گھر لینے کو کرایہ نہیں ہوتا۔ یہاں مفت میں رہتے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، کرایہ مانگنے والا نہیں۔ گھر سے نکالنے والا نہیں' کیوں جینیفر؟''

''بالکل ٹھیک۔'' کہتے ہوئے جینیفر نے لائنوں کے پار دوسری طرف اپنے ایک دو ''گھروں'' کی طرف اشارہ کیا۔

ہم اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ جینیفر بولا۔ ''ہم سارا دن نیویارک میں گزارتے ہیں۔ رات کو یہاں آ کر سو جاتے ہیں۔ یہ نیوجرسی ہے۔ یہاں ہم جیسے لوگوں کی بہتات نہیں۔ نیویارک کے نیچے تو ایسی جگہوں پر رہائش بھی مشکل سے ملتی ہے۔ پھر بھی بہت سے لوگوں کی رہائش کا مسئلہ ہر پلیٹ فارم حل کر دیتا ہے۔''

''بہت لوگ اس طرح رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''یہاں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہر پلیٹ فارم کے ان خالی سروں پر اپنا گھر آباد کر لیتے ہیں۔ دن کو چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ خیرات مانگتے ہیں اور رات اس طرح بسر کر لیتے ہیں۔''

ہم نے چند لمحے ان سے باتیں کیں۔ حیرانگی بھی ہوئی، افسوس بھی۔ اتنے متمول اور تہذیب یافتہ معاشرے کا حصہ یہ لوگ بھی تھے۔ امریکہ کی اک نئی شکل سامنے آئی تھی۔

ٹرین کی آواز سننے پر ہم بھاگم بھاگ اس طرف آئیں۔ ٹرین رکی، خودکار دروازے کھلے۔ اندر سے لوگ باہر آئے۔ باہر سے اندر گئے۔ ہم چاروں بھی اندر چلی گئیں۔ خودکار دروازے بند ہوئے اور ٹرین اک زناٹے سے رواں دواں ہو گئی۔

پتہ چلا کہ کچھ ٹرینیں ڈرائیور چلاتے ہیں۔ کچھ ریموٹ کنٹرول سے چلتی ہیں۔ جس ٹرین میں ہم سوار ہوئے، وہ ڈرائیور چلا رہا تھا۔ شکر کیا ورنہ ریموٹ کنٹرول کے ذکر ہی سے ہم سہم گئی تھیں۔ ذرا سا غلط بٹن دب جائے تو ٹرین کا خانہ خراب مع مسافروں کے لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں تھا۔

خیر

ہم یہ سفر انجوائے کرتے ہوئے نیو یارک جا رہے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ٹرین کبھی سرنگ سے گزرتی اور کبھی زمین کے اوپر باہر کھلی فضا میں آ جاتی۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد پھر سرنگ میں گھس جاتی۔ یہ ٹرین لنکن ٹنل کے اندر سے بھی گزری اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے نیچے سے بھی۔ ہم چاروں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ سفر کو پوری طرح انجوائے کر رہی تھیں۔ کمپارٹمنٹ میں سوار رنگا رنگ مخلوق پر رواں تبصرے کرتے ہوئے زیر زمین بسنے والے لوگوں سے ان لوگوں کا مقابلہ بھی کر رہی تھیں۔

''آپا'' رقیہ باتیں سنتے ہوئے بولی۔

''ہوں۔ کیا؟'' میں نے کہا۔

''دیکھیں۔ اب نیو یارک کے پلیٹ فارموں پر ان زیر زمین بسنے والے لوگوں کے انٹرویو کرنا شروع نہ کر دیجئے گا...... سیدھے سیدھے جہاں جانا ہے چلیں۔''

ہم سب اس کی بات پر ہنس پڑیں۔ ''رقیہ تم بیچارے لوگوں سے اتنا ڈر گئیں......''

''یہ بیچارے ڈاکو لٹیرے بھی ہو سکتے ہیں۔''

''انہیں دیکھ کر خوفزدہ تو میں بھی ہوئی تھی لیکن ظاہر نہیں کیا تھا۔'' نسیمی نے ہنس کر کہا۔

''ڈرنے کی کیا بات۔ مجھے تو ان بیچاروں پر ترس آیا تھا۔'' گڈی بولی۔

''مجھے تو حیرت ہوئی تھی۔ اتنا بڑا اور اتنا امیر ملک اور اس کے یہ باشندے...... جو غربت کی نچلی سطح سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ چاند میں گرہن والی بات ہے......''

''وہ تو یہاں کی اور بھی کئی چیزیں ہیں۔ وہ گندے علاقے ٹوٹی پھوٹی سڑکیں یاد نہیں جو نوفل کے دوست نے دکھائی تھیں......''

''ہاں۔''

ہم باتوں میں اس طرح مصروف ہوئیں کہ جس سٹاپ پر اترنا تھا، اتری نہیں۔ گاڑی چل پڑی۔

''ہائے ہم نے تو ادھر اترنا تھا۔''

''ہاں اترنا تو تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ ہم نے ٹکٹ خریدے ہوئے ہیں اور یہاں ان ٹکٹوں پر ہم جتنی بار چاہیں End تک سفر کر کے پھر واپس آ سکتے ہیں۔ جتنی بار چاہیں اندر ہی اندر جا کر واپس آ سکتے ہیں اور واپس آ کر پھر جا سکتے ہیں۔ ہاں ایک بار سٹیشن سے باہر نکلیں تو ٹکٹ کینسل......''

''کیوں نہ اگلے سٹیشن پر اتر کر باہر نکلیں۔ دیکھیں تو سہی وہ کونسی جگہ ہو گی۔''

''نہ بھئی۔''

''کیوں؟''

''بھئی اس سٹاپ کا تو ہمیں پتہ ہے۔ ففتھ ایونیو پر ہم سٹیشن سے نکل کر پہنچ جائیں گے۔ دوبارہ آ چکے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ گھوم پھر کر پھر یہاں آ جائیں گے۔ کچھ پتہ نہ چلا تو ٹیکسی پکڑیں گے اور پورٹ اتھارٹی پہنچ کر بس سے واپس نیو جرسی چلے جائیں گے۔''

''ہاں واقعی۔ اب ہم سب بہادر بن گئی ہیں۔ گم نہیں ہو سکتیں۔''

سب نے اتفاق کیا اور دوسرا سٹاپ بھی گزار دینے کے بعد اگلے سٹاپ پر ٹرین سے اتر گئے۔

سٹیشن سے باہر آئے۔ پتہ نہیں یہ کونسا ایونیو تھا۔ یہاں بھی لوگوں کا ہجوم، ٹریفک کی ریل پیل تھی۔ سٹور تھے، شاپس تھیں۔ فٹ پاتھوں پر رنگ برنگی چھتریوں والی ریڑھیاں تھیں۔ کالے گورے نیلے پیلے ہر طرح کے لوگ تھے۔

ہم سب نے فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ ایک چوراہے تک پہنچے۔ پھر دائیں ہاتھ کی سٹریٹ میں گھوم گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر ہم بے مقصد چلتے گئے۔

''ہم نے تو آج ایمپائر سٹیٹ دیکھنے جانا تھا؟''

''ہاں دیکھ لیں گے۔''

''لیکن پتہ بھی تو چلے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں اور ایمپائر سٹیٹ کہاں؟ بس منہ اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔''

"ہم نیویارک کی سیر کرنے آئے ہیں، سو کر رہے ہیں۔ یہیں سے گھوم گھما کر ایمپائر سٹیٹ بھی پہنچ جائیں گے۔"

"جو ہم ایمپائر سٹیٹ سے میلوں دوسری طرف نکل آئے ہوں تو...... ٹرین گولی کی رفتار سے چلتی ہے اور ہم لوگوں نے دو سٹاپ چھوڑے تھے اور اب کتنا پیدل چل آئے ہیں۔"

"تو کیا ہوا، نئی نئی جگہیں دیکھ رہے ہیں۔ دیکھو نا یہ رہائشی علاقہ لگتا ہے۔ کتنے فلیٹس ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی بلڈنگیں ہیں۔ فٹ پاتھوں کے ساتھ کتنی ترتیب سے کاریں کھڑی ہیں۔"

رقیہ بور ہو گئی۔ بولی۔ "بس بہت دیکھ لیں بلڈنگیں، اب ٹیکسی پکڑیں اور ایمپائر سٹیٹ چلیں۔"

"بہت اچھا...... اگلی سٹریٹ پر مڑتے ہیں تو ٹیکسی لے لیں گے۔"

اگلی سٹریٹ بیالیسویں سٹریٹ تھی۔

ہماری حیرانگی کی بات کہ اس سٹریٹ سے گزر کر سامنے ہی گرینڈ سنٹرل ریلوے سٹیشن تھا۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتیں میڈیسن ایونیو سے ہوتیں اس سٹیشن تک جا پہنچیں۔

واہ

کیا ریلوے سٹیشن تھا۔ دو منزلہ۔ لوگوں کی ریل پیل تھی۔ ٹرینوں کی آمد و رفت، کیا سماں...... کیا ہلا گلا اور کتنی رونق تھی۔

یہ دنیا کا سب سے بڑا ریلوے سٹیشن ہے۔ اس کی اوپر کی منزل پر 66 ریلوے لائنز اور نیچے ستاون ریلوے لائنیں ہیں۔ یہ 1913ء میں مکمل ہوا تھا۔

اس سٹیشن پر لوگوں کا ہجوم تو ہر وقت رہتا ہے۔ ظاہر ہے اوپر نیچے 123 ریلوے لائنوں پر ریل گاڑیاں مصروف کار رہتی ہیں۔ لوگوں کا آنا جانا، بھاگ دوڑ قیامت ہی کا سماں ہوتا ہے لیکن صبح و شام یہ ہجوم بے حد بڑھ جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں، کالجوں میں جانے آنے والے سٹوڈنٹس، دفتروں میں کام کرنے والے لوگ، ذاتی کاروبار کے لیے مختلف جگہوں پر آنے جانے والوں کے علاوہ سیاحوں کا بھی تانتا بندھا ہوتا ہے۔ اس سٹیشن کو سب

ویز ریلوے کے ذریعے مختلف علاقوں سے ملا دیا گیا ہے۔ ٹرین سے اتر کر ان ریلویز کے ذریعے لوگ نیویارک اور دوسرے اردگرد کے علاقوں میں جاتے آتے ہیں۔

ریلوے سٹیشن دیکھ کر ہم ششدر رہ گئیں۔ خوشی بھی ہوئی کہ اتنے بڑے ریلوے سٹیشن کو جس کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا، دیکھ لیا۔ اس ریلوے سٹیشن کے عقب میں ایک 59 منزلہ بلڈنگ ہے۔ اس کا نام "پین امریکن بلڈنگ" ہے۔ متحرک زینوں سے اس بلڈنگ سے سٹیشن پر آیا جا سکتا ہے۔ یہ بلڈنگ اس لیے بھی مشہور ہے کہ اس پر ہیلی کاپٹر کے اترنے کے لیے ہیلی پیڈ بنا ہے۔ دیکھنے میں یہ عمارت بے حد خوبصورت تھی۔ اس میں ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں لیکن اب اس پر ہیلی کاپٹر نہیں اتارا جاتا کیونکہ ایک دفعہ حادثہ ہو گیا تھا جس سے یہ بات ممنوع قرار دے دی گئی تھی......

ہم نے یہ عمارت دور ہی سے دیکھی...... ہم نے واپس بھی جانا تھا۔

اب معلوم نہیں تھا کہ سب ریلوے کے ذریعے جائیں تو کہاں سے پتہ کریں کہ کونسی گاڑی ہمیں ایمپائر سٹیٹ کے قرب و جوار میں لے جائے گی۔ ریلوے سٹیشن کے نام وغیرہ تو لکھے ہوتے ہیں لیکن ہمیں جگہوں کا حدود اربعہ تھوڑا ہی پتہ تھا۔

اس لیے ہم نے سوچا کہ کسی سے پوچھ کر سب وے سے جانا چاہیے۔ اتنی بہت اور پر رونق کشادہ اور دو طرفہ دکانوں والی جہاں چہل پہل تھی، ریسٹورنٹ تھے۔ بار تھے۔

ہم کہاں جاتے، کدھر جاتے۔

کسی سے پوچھنا ہی بہتر جانا۔

امریکی لوگوں کی ایک اچھی یا بری عادت یہ ہے کہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دوڑے بھاگے چلے جاتے ہیں۔ کسی کی طرف دیکھتے ہیں نہ دھیان دیتے ہیں۔ کسی کو روک کر راستہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ ہر جگہ سائن بورڈ لگے ہوتے ہیں۔ جگہوں کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ سڑکوں کے نام اور ڈائرکشن بتائی ہوتی ہے۔ پھر جگہ جگہ نقشے ملتے ہیں۔

اس لیے عام لوگوں کو کسی کو روک کر پوچھنے کی شاید ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

لیکن

ہمیں تھی۔

اس لیے ہم اس ارادے سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ہمارے قریب سے لوگ تیزی سے گزر رہے تھے۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کسی تیز رفتار گاڑی کو ہم ہاتھ دے کر روکیں۔ لیکن

روکنا ضروری بھی تھا...... سائن بورڈ تھے، جگہوں کے نام تھے۔ سڑکوں اور راستوں کی ہدایات تھیں لیکن نہ ہمیں سڑکوں کے ناموں سے آگاہی تھی۔ نہ ہی جگہوں کے نام آتے تھے۔ کسی مقام سے بھی واقفیت نہ تھی۔ سائن بورڈ پڑھ لینے سے کام نہیں بن سکتا تھا۔

ہم لوگوں کو روکنے سے جھجک رہی تھیں کہ مشکل حل ہو گئی۔ ایک چالیس پینتالیس سال آدمی جو شکل وصورت سے ہمیں مشرقی معلوم ہوا، ہمارے قریب خود ہی رک گیا۔

اس نے ہمیں سلام کیا۔ ہمارے جواب پر بولا۔ ''آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہے یا کسی کے انتظار میں کھڑی ہیں؟''

اس کے اردو بولنے سے ہمیں تسلی ہوئی۔ رقیہ نے جھٹ سے پوچھا۔ ''آپ پاکستانی ہیں؟''

''جی...... آپ بھی پاکستانی ہیں یقیناً۔''

''بالکل۔''

''اگر کوئی پرابلم ہو تو میں آپ کے کام آ سکتا ہوں۔'' پھر اس نے بتایا کہ وہ سیالکوٹ کا رہنے والا ہے اور تقریباً پندرہ سال سے یہاں مقیم ہے۔ کچھ عرصہ ٹیکسی چلاتا رہا، اب ایک چھوٹا سا ذاتی سٹور کھول لیا ہے۔ میرا نام سلیم احمد ہے۔'' اس نے کہا۔

ہمارے لیے اتنا ہی تعارف کافی تھا کہ وہ پاکستانی ہے اور یقیناً ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ پندرہ سال سے یہاں رہ رہا ہے۔ ٹیکسی بھی چلائی۔ اس لیے راستوں کا اسے بخوبی علم ہو گا۔ ہم نے چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اسے اپنی پرابلم بتائی تو وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ پہلی بار نیویارک گھوم پھر رہی ہیں؟''

''جی نہیں، آج تیسری بار آئے ہیں۔'' رقیہ نے کہا۔

''چوتھی بار......'' گڈی نے اسے ٹوکا۔ ''لیکن ادھر آج پہلی دفعہ اتفاقاً ہی آ نکلے ہیں۔''

''اب واپس کہاں جانا چاہتی ہیں؟''

''ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ دیکھنے جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

نسیم نے جھٹ سے کہا۔ ''ویسے تو ٹیکسی لے کر ہم جا سکتے ہیں لیکن سنا ہے یہاں سے نیویارک کے مختلف علاقوں میں سب ویز جاتی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک۔ سب وے سے جانا فائدہ مند رہے گا۔ ٹیکسی تو بہت مہنگی پڑے گی آپ کو۔ میں آپ کو اسی ٹرین میں بٹھا دیتا ہوں جو ایمپائر سٹیٹ کے قریب ہی آپ کو لے جائے گی۔''

''بہت بہت شکریہ......''

وہ ہمیں ساتھ لے کر ایک سب وے کے ٹکٹ گھر کی طرف گیا۔ ہم نے ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے نکالے تو اس نے ازراہِ مروت کہا۔ ''آپ میری پاکستانی بہنیں ہیں۔ آپ کے ٹکٹ میں خریدوں گا۔''

ہم نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا لیکن ٹکٹ اپنے پیسوں سے ہی خریدے۔

اس نے بھی اندر جانے کے لیے اپنا ٹکٹ خریدا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ یہ بہت ہی بڑا ہال تھا۔ کافی لوگ وہاں موجود تھے۔ کچھ باہر آ رہے تھے۔ کچھ اندر جا رہے تھے۔ اس ہال میں تین چار شاپس بھی تھیں جہاں کھانے پینے کی چیزیں، چاکلیٹس، ٹافیاں، آئس کریم بسکٹ وغیرہ تھے۔ نیلے رنگ کی کوک وغیرہ کی الماریاں بھی تھیں جیسی بڑے بڑے سٹوروں کے باہر اکثر پڑی ہوتی ہیں۔ سکہ ڈالیں، بٹن دبائیں۔ ایک ڈبے سے کاغذی گلاس لیں اور کوک سے بھر لیں۔

وہاں سے ہم متحرک زینے سے نیچے آئے۔ اب ہم زمین کی کافی گہرائی میں تھے۔ یہاں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ پلیٹ فارم کافی بڑا تھا۔ یہاں بھی معلومات کا دفتر تھا۔

ٹرینوں کی آنے جانے کی سمتوں کے نقشے دیوار پر لگے تھے۔ سائن بورڈ بھی جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔

''اس پلیٹ فارم پر آپ کی ٹرین آئے گی۔'' ہمارے گائیڈ نے لوہے کی چوڑی سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے ہم سب سے کہا۔ پھر اس نے جہاں جا کر ہم نے اترنا تھا، اس سٹاپ کا نام بتایا۔ وہاں اسٹیشن سے باہر نکل کر ہم ایمپائر سٹیٹ آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔

''شکریہ۔'' ہم نے کہا۔ ''آپ اب جائیے، ہم چلے جائیں گے۔ ہم آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔''

''آپ کی مدد میرا فرض تھا۔'' وہ بولا...... ''میں گاڑی آنے تک رکتا ہوں۔ آپ سوار ہو جائیں تو میں چلا جاؤں گا۔''

وہ رکا رہا، ہم سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ پاکستان کے متعلق ہم سے بہت کچھ پوچھتا رہا۔

''پندرہ سال سے یہاں ہوں۔ بیوی بچے ساتھ ہیں۔ اللہ کا فضل ہے۔ کاروبار بھی چل رہا ہے لیکن پاکستان بہت یاد آتا ہے۔ اپنے وطن کی بات ہی کچھ اور ہے۔ آپ سے مل کر اتنی خوشی ہوئی ہے، بتا نہیں سکتا۔ لگتا ہے اپنے ہی خاندان کے لوگوں سے ملا ہوں۔''

باتیں ہوتی رہیں۔

پھر ٹرین کی وسل سنائی دی۔ گولی کی طرح آتی ٹرین پلیٹ فارم پر آتے ہی رک گئی۔ اترنے والے اترے، سوار ہونے والے اندر گئے۔ دروازے بند ہوئے اور پھر ٹرین چل پڑی۔ ہم نے سلیم احمد کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔

ایمپائر سٹیٹ ہم ٹیکسی لے کر پہنچے۔ سٹیشن سے یہ جگہ دور تو نہ تھی لیکن پیدل چلنے کا کسی کا موڈ نہ تھا۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ نیویارک سٹی میں واقع ہے۔ یہ 1250 فٹ اونچی عمارت ہے۔ اتنی اونچی بلڈنگ بنانے کا پلان امریکن پولیٹیشن الفریڈ سمتھ نے بنایا تھا۔ اس کا سٹیل

فریم اتنا مضبوط ہے کہ 1945ء میں ایک جہاز حادثاً اس سے ٹکرا گیا تھا جس سے صرف اوپر کی دو منزلوں کو نقصان پہنچا تھا۔ یہ 1931ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی تھی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی طرح یہ بھی عمودی بلڈنگ ہے۔ اسی طرح چاروں طرف فلیٹس' اپارٹمنٹس' دفاتر، کمپنیوں اور اداروں کے دفاتر، شاپنگ سنٹر۔ سبھی کچھ تقریباً اسی طرح ہے۔

یہاں بھی سیاحوں اور کاروباری لوگوں کا ہجوم تھا۔ لفٹیں لگی ہوئی تھیں۔ تیز رفتار لفٹیں لوگوں کو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر لے جا رہی تھیں۔ اس عمارت کی 102 منزلیں ہیں۔ پہلے یہ سب سے اونچی بلڈنگ گنی جاتی تھی لیکن ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور سیئرز ٹاور کے بعد اب اس کا نمبر آتا ہے۔ تاہم یہ سیاحت کے شوقین لوگوں کی توجہ کا مرکز ضرور ہے۔ ہم بذریعہ لفٹ 86ویں منزل پر اترے...... یہاں بھی اس منزل پر ایک خوبصورت ریسٹورنٹ تھا۔ صاف ستھرا ماحول، رنگ برنگ میزیں اور کرسیاں۔ سیاحت کے لیے آئے ہوئے دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ خوش گپیاں کرتے کھا پی رہے تھے۔ کچھ گھوم پھر کر چاروں طرف سے نیویارک کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچھ شیشوں والی کھڑکیوں کے سامنے پڑے صوفوں پر بیٹھے گرد و پیش کا نظارہ کر رہے تھے۔ ایک طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ دور سٹیچو آف لبرٹی بالشت بھر کی گڑیا کی طرح نظر آ رہا تھا۔

اس منزل پر ایک تھیٹر بھی تھا۔ ''سکائی رائیڈر''

''چلیں ہم بھی تھیٹر دیکھتے ہیں......'' ہم چاروں نے گھوم پھر کر باہر کا نظارہ کرنے کے بعد کہا۔

''چلیں۔'' ہم نے تیر کے بنے نشان کی طرف قدم بڑھائے جس کے آگے سکائی رائیڈر لکھا تھا۔ وہاں ہم نے ٹکٹ گھر سے ٹکٹ خریدے۔ اس کے بعد دوسرے تیر کی طرف بڑھے۔

پہلے ہم نے چند سیڑھیاں طے کیں۔ پھر ایک نیم اندھیرے کوریڈور سے گزرے۔ تھیٹر تک ہم آسانی سے اس لیے پہنچ گئے کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے واضح نشان اور اشارے تھوڑی تھوڑی دور لگے ہوئے تھے۔

ہم تھیٹر کے دروازے تک جا پہنچے۔ یہاں دیوار پر ہدایات لکھی تھیں کہ کمزور دل حضرات اور حاملہ عورتیں تھیٹر مت دیکھیں۔

"ایسی کیا چیز ہے اس تھیٹر میں؟" نسیمی بولی۔

"یہ تو دیکھنے پر ہی پتہ چلے گا۔" گڈی بولی۔

"ہاں ہم لوگ تو ان لکھی ہدایات سے خائف نہیں۔" میں نے کہا۔ "اللہ کے فضل سے ہم میں سے نہ تو کوئی دل کا مریض ہے اور نہ ہی......" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

ہم ٹکٹ دکھا کر اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک درمیانہ سا ہال تھا۔ نہ بہت بڑا نہ ہی بہت چھوٹا۔ قطار در قطار کرسیاں پڑی تھیں۔ کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ہم چاروں بھی تیسری قطار میں بیٹھ گئیں...... ہال جلد ہی بھر گیا۔

سامنے دیوار پر بڑی سی سکرین تھی جس پر فلم چلنا تھی۔ اس تھیٹر میں کوئی سٹیج پلے نہیں دکھایا جانا تھا بلکہ سکرین پر فلم دکھائی جاتی تھی۔

ہال بھر گیا تو بتیاں گل کر دی گئیں۔ ہال میں اندھا اندھیرا چھا گیا۔

اب

سکرین روشن ہوئی

اور

فلم چلنا شروع ہوئی۔ فلم کیا تھی۔ ایک ایڈونچر تھا۔ عجیب طرح کی سکرین تھی۔ دور سے جہاز آتا تو لگتا سکرین چیر کر سیدھا دیکھنے والوں پر گر رہا ہے۔ گاڑی تیزی سے آتی تو لگتا دیکھنے والوں کو روندتی ہوئی گزر جائے گی۔ کاریں ٹکراتیں تو لگتا ہمیں ایک سیکنڈ میں کچل دیں گی۔ ہال میں بیٹھے لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں۔ چیخ چیخ کر ہمارے حلق بھی خشک ہو گئے۔ جونہی کوئی جہاز' گاڑی یا کار ہمارے اوپر چڑھتی چلی آتی، ہم چیختے ہوئے سر جھکا لیتے۔ ساتھ ہی لگتا پورے ہال کی کرسیاں کبھی دائیں اور کبھی بائیں جھک گئی ہیں۔ عجیب ڈراؤنا منظر تھا۔ ہم سب کرسیوں کے ہتھوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چیختے ہوئے سر اتنا جھکا لیتے کہ گھٹنوں کو چھو لیتے۔ پھر تھوڑی دیر فلم چلتی، دیکھنے لگتے تو کبھی ریل گاڑی کبھی جہاز کبھی کار سکرین چیر کر نکلتی اپنی طرف آتی لگتی۔ پورے ہال کی کرسیاں ایک طرف سے اونچی دوسری طرف سے نیچی ہو جاتیں۔ اندھیرے میں خوف سے چیخیں ہی نکلتیں اور عورتیں اور بڑے بڑے مرد بھی چیخیں مارتے۔

فلم شاید تیس منٹ کی تھی۔ ختم ہوتے ہی ہال کی روشنیاں جل اٹھیں۔ کرسیاں جیسے تھیں ویسے ہی ہو گئیں۔

"ہائے اللہ۔"

"توبہ توبہ۔"

"واقعی دل کے مریض تو فوت ہی ہو جاتے۔"

ہم سب ہنس ہنس کر تبصرے کرتے ہوئے اٹھیں اور قطار میں کھڑی ہو گئیں۔

ہمارے رواں تبصرے جاری تھے۔ لوگ اب ہنستے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔

اپنی باری پر ہم بھی باہر آئے۔

اب چائے یا کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ اسی لیے ہم لوگ ریسٹورنٹ میں آ گئے اور کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر ایک نازک اندام گوری حسینہ کو دیا۔

جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے۔

وہیں

چند فٹ کے فاصلے پر ایک مشین نصب تھی۔ کچھ لوگ وہاں کھڑے تھے۔ مشین میں پینی ڈال کر وہ ہینڈل گھماتے۔ تھوڑی دیر بعد تانبے کا یہ گول سکہ لمبوتری شکل میں نیچے پیالہ نما چیز میں گرتا۔ اس پر ایمپائر سٹیٹ کی ابھری ہوئی تصویر بنی ہوتی۔

ہم چاروں نے بھی دو دو سکوں پر یہ تصویر بنائی۔

یہ یادگار شے تھی۔

آج ہم گھر پہنچے تو ہمارا انداز بڑا فاتحانہ تھا۔ ہم نے اکیلے گرینڈ سنٹرل ریلوے سٹیشن بھی دیکھ لیا تھا۔ ایمپائر سٹیٹ بھی دیکھی۔ سکائی رائیڈر سے بھی لطف اندوز ہوئے اور

واپسی پر باہر سے یو این او کی بلڈنگ بھی دیکھ لی۔ پتہ نہیں کہاں کہاں گھوم پھر کر بخیریت واپس گھر پہنچ گئے تھے۔

''آئے ہائے۔'' شمیم نے ہماری روئیداد سنتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ ضرورت سے زیادہ ہی تیز ہوگئی ہو...... گرینڈ ریلوے سٹیشن تو ابھی تک میں نے بھی نہیں دیکھا۔''

''شمو باجی۔'' گڈی بولی۔ ''آپ نے تو سٹیچو آف لبرٹی تک نہیں دیکھا...... اور دیکھا ہی کیا ہے۔''

''میں نے بہت کچھ دیکھا۔ امریکہ کی کئی سٹیٹس دیکھ چکی ہوں۔ تم لوگ نیو یارک ہی کا کوئی کوئی حصہ دیکھ کر اتراتی پھر رہی ہو...... پھولی نہیں سما رہیں۔'' شمو نے ہنستے ہوئے کہا۔

بہر حال

ہم واقعی اترا رہے تھے کہ اجنبی ملک میں ہم چار عورتیں اکیلی گھومتی پھرتی دنیا کے عجائبات دیکھ رہی تھیں۔

کہاں ہم نے اپنے ملک میں کسی ریلوے سٹیشن کی دس بارہ ریلوے لائنز سے زیادہ نہ دیکھی تھیں اور کہاں 123 ریلوے لائنیں اس پر طرہ یہ کہ سٹیشن دو منزلہ۔ اوپر بھی ٹرینیں آ جا رہی ہیں، نیچے بھی۔ لوگوں کا جم غفیر۔ بھاگ دوڑ۔ گہما گہمی کوئی اوپر بھاگتا ہوا جا رہا ہے، کوئی نیچے لیکن اس سب بھاگ دوڑ کے باوجود افراتفری نہیں۔ دھکم پیل نہیں۔ سارے کام ہو رہے ہیں۔ کسی کو گھبراہٹ ہے نہ پریشانی۔ ایک اپنے ریلوے سٹیشن یاد آئے جہاں مسافروں کی تعداد اس کے عشر عشیر بھی نہیں ہوتی، پھر بھی ایک شور شرابا، افراتفری دھکم پیل۔ ٹرین سے باہر آنے والے اندر جانے والوں سے متصادم ہیں۔ کسی کو کوئی نہ تو آرام سے ٹرین سے اترنے دیتا ہے نہ چڑھنے۔ نظم وضبط کا تو سوال ہی نہیں۔

پھر ہمیں یہ ریلوے سٹیشن عجوبہ کیوں نہ لگتا اور اسے اکیلے دیکھ آنے پر ہم لوگ پھولے کیسے نہ سماتے۔

یہی حال دوسری چیزوں کے دیکھنے کا تھا۔

خیر

شمیم ہمارا مذاق اڑاتی ہنستی رہی۔ لیکن آج ہم اپنے معرکے مار لینے پر بہت خوش تھیں۔ اگلے دو تین دن گھر پر ہی گزرے۔ دو تین رشتہ دار ہمیں ملنے اور اپنے ہاں مدعو کرنے آتے رہے۔

''اب کدھر کا رخ کیا جائے۔'' چوتھے دن ہم نے بیکار بیٹھنے سے تنگ آ کر ایک دوسرے سے کہا۔

''احمد نے کنیکٹیکٹ سٹی جانا ہے۔'' گڈی نے کہا۔ ''اسے شمو باجی چھوڑنے جائیں گی۔ کیوں نہ ہم بھی ساتھ چلیں۔''

''بالکل۔ امریکہ کی ایک سٹیٹ دیکھ لیں گے۔'' ہم تینوں نے کہا۔

''احمد کب جا رہا ہے؟'' میں نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''پرسوں شمو باجی کو چھٹی ہے، وہی لے کر جائیں گی۔'' گڈی بولی۔

''چلو تو پھر پروگرام پکا۔''

-------O-------

احمد سٹیپ ٹو کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ سارا دن شمیم کے گھر کے قریب جو ایک پبلک لائبریری تھی وہاں جا کر پڑھتا۔ کنیکٹیکٹ سٹی میں اس کے تین چار دوست تھے۔ کوئی امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ کسی کو ریذیڈنسی ملنے کا انتظار تھا۔ ابھی پاکستان سے ڈاکٹر بن کر آئے تھے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے گریجوایشن کی تھی لیکن جب تک وہ سٹیپ ون اور سٹیپ ٹو نہ کر لیتے۔ امریکہ میں ریذیڈنسی نہیں مل سکتی تھی اور جب تک ریذیڈنسی مکمل نہ کرتے جاب نہیں مل سکتی تھی۔

امریکہ میں کے۔ ای کی ڈگری بھی نہیں مانی جاتی۔ اس کے لیے دو امتحان پاس کرنے پڑتے ہیں۔ اب تو سنا ہے تین امتحان کر دیے گئے ہیں یعنی Step تھری بھی پاس کرنا ہوتا ہے۔

احمد کے دوست ڈاکٹر مقبول صاحب کے بھائی ڈاکٹر محمود کے ہاں یہ لڑکے مقیم تھے۔ احمد نے بھی امتحان کی تیاری کے لیے ان کے ساتھ رہنا تھا۔

ڈاکٹر محمود کی وہاں جاب تھی۔ ان کے بھائی ڈاکٹر مقبول تو ان کے پاس رہتے ہی تھے۔ پاکستان سے آنے والے تین چار لڑکے جو مقبول کے دوست تھے وہیں رہ رہے تھے اور اب احمد نے بھی ان کے ساتھ رہنا تھا۔

Connecticut یونائیٹڈ سٹیٹس کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہ چھٹی سٹیٹ تھی جو انگلینڈ کے تسلط میں تھی لیکن جنوری 1788ء میں اس میں یو ایس اے کا قانون لاگو کرنے کو جائز قرار دے دیا گیا۔ اس سٹیٹ نے یو ایس اے کی معیشت میں بڑا اہم رول ادا

کیا۔ یہ بہت بڑی سٹیٹ نہیں ہے لیکن امیر ترین سٹیٹس میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں جن شہروں اور ٹاؤنز کا نام وجود میں آیا، وہ اب بہت بڑے اور ماڈرن شہر بن چکے ہیں۔ اس کا صدر مقام ہارٹ فورڈ ہے جو میٹروپولیٹن ہے۔ برج پورٹ بھی اس سٹیٹ کا بہت بڑا شہر ہے۔ جنوبی کنیکٹیکٹ میں نیوہیون کاؤنٹی کا شہر نیوہیون کے نام ہی سے مشہور ہے۔ یہ بھی بہت بڑا اور مشہور شہر ہے۔ یہ بڑا خوشحال علاقہ ہے۔ صنعت کے لحاظ سے اس سٹیٹ کی بڑی کاؤنٹی میں یہ سنٹر کی حیثیت رکھتا ہے۔ بائیوٹیکنالوجی، ہیلتھ کیئر، اعلیٰ تعلیم، آرٹ اور انٹرٹینمنٹ کے لیے یہ جگہ بہت مشہور ہے۔

ہم نے ایسٹ ہیون کے پرسٹی میں جانا تھا۔ مونٹ ول سے یہ کوئی ساڑھے تین گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ احمد کو چھوڑ کر شام کو واپس بھی آنا تھا۔ ہم تو ویسے ہی یہ سٹیٹ دیکھنے جا رہے تھے کہ مقبول صاحب کا سپیشل بلاوا بھی آ گیا۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمود کی طرف سے بھی ہمیں ڈے سپینڈ کرنے کی دعوت دی گئی۔

ہم لوگ صبح جلدی گھر سے نکلے۔ ساڑھے گیارہ بجے ہم ڈاکٹر محمود کے گھر پہنچ گئے۔ ساڑھے تین گھنٹے کی ڈرائیو زیادہ تر ہائی وے پر ہی تھی۔ یہاں بھی نیوجرسی کی طرح صاف شفاف کشادہ سڑکیں، بلڈنگیں، کہیں سبزہ زار۔ کہیں فیکٹریوں کے علاقے۔ ٹریفک ویسے ہی رواں دواں...... کوئی شور شرابا نہ ہلا گلا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف۔ کوئی نئی چیز ہمیں نظر نہ آئی۔ یوں لگا نیوجرسی ہی میں کہیں جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمود کے گھر ہم بغیر کہیں بھٹکے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر مقبول نے جس طرح گائیڈ کیا تھا، ہم اسی روشنی میں ہائی وے سے ہوتے ایگزٹس پر نکلتے۔ بتیاں گنتے، اشارے دیکھتے پہنچ گئے۔ دو جگہ رک کر شمیم نے بورڈ بھی پڑھے جن پر ایسٹ ہیون جانے کے راستے دکھائے گئے تھے۔

چنانچہ بغیر کسی تکلیف و تردد کے، بغیر کسی کو روک کر پوچھتے ہوئے ہم منزل مقصود پر جا پہنچے۔

ان کا گھر ڈبل سٹوری اپارٹمنٹ تھا۔ امریکی دستور کے مطابق کوئی باؤنڈری وال

نہ تھی۔ دروازے سے باہر مقبول اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کھڑے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ یہاں سڑک کے دونوں طرف تقریباً اسی طرح کے دو منزلہ مکان تھے۔ مکان ایک دوسرے سے ملحق نہ تھے۔ درمیان میں تھوڑی تھوڑی زمین چھوڑی ہوئی تھی جس پر سبز گھاس بڑی خوبصورتی سے لگی ہوئی تھی۔ کچھ پھولوں کے پودے بھی نظر آ رہے تھے۔ اپارٹمنٹ کے سامنے فٹ پاتھ کی طرح اینٹوں کے فرش تھے۔

اب موسم کچھ بدل چکا تھا۔ اس دفعہ برفباری بھی کوئی خاص نہیں ہوئی تھی۔ سردی تو ابھی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی دسمبر اور جنوری میں تھی۔ اب فروری کا آغاز تھا۔ سبزے پہ بڑا نکھار تھا۔ پھولوں کے مہکنے کے دن تھے۔ وہاں فضا تو ہمیشہ ہی صاف وشفاف رہتی ہے۔ دھول نہ مٹی...... لیکن ان دنوں فضا میں ہلکی ہلکی مہک بھی رچی ہوئی تھی جو بہت بھلی لگتی۔

مقبول نے ہمارا استقبال بڑے پُرجوش انداز میں کیا۔ جب یہ کے ای کے سٹوڈنٹ تھے تو لاہور احمد اور طاہر کے ساتھ ہمارے ہاں بھی آئے تھے۔ اس لیے تھوڑی سی جان پہچان تھی۔ احمد وغیرہ ان سے جونیئر تھے لیکن ان کا رویہ ان کے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔

شمیم نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی تو ہم سب گھر کے اندر داخل ہوئے۔ چونکہ گیراج پچھلی طرف تھا اس لیے اسی طرف سے اندر آئے۔ پہلے بڑے سے باورچی خانے سے گزرے۔ یہاں دو لڑکے کھانا بنانے میں مصروف تھے۔ وہ بھی احمد کے کلاس فیلو تھے۔ ہم سب کو دیکھ کر اتنے خوش ہوئے جیسے پاکستان سے ان کی مائیں، بہنیں آ گئی ہیں۔

کچن سے ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے جو انتہائی سادہ تھا۔ ایک طرف ڈائننگ ٹیبل اور کھانے کی کرسیاں پڑی تھیں۔ مقبول اور تینوں لڑکے ہمارے ساتھ ہی ادھر آ گئے۔

احوال پرسی ہوئی۔ خیر خیریت دریافت کی گئی۔ احمد نے ہم سب کا ان سے اور ان کا ہم سے تعارف کروایا۔ سب اتنی بے تکلفی سے ملے کہ بہت خوشی ہوئی۔

''آپ لوگ کچن میں کیا کر رہے تھے؟'' شمیم نے ان سے پوچھا۔

''آپ لوگوں کے لیے کھانا بنا رہے تھے۔'' وہ بولے۔ ''آج آپ ہمارے پکے ہوئے کھانوں سے لطف اٹھائیے گا۔''

میں نے کہا۔ ''بیٹا آپ لوگ سٹوڈنٹ ہیں۔ آپ کا لمحہ لمحہ قیمتی ہے۔ ہمارے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''آنٹی۔'' ان کی جگہ مقبول بولے۔ ''کھانا انہیں بنانا ہی پڑتا ہے۔ برا بھلا پکا ہی لیتے ہیں۔''

''تو لے بھائی جان آپ سے اچھا ہی بناتے ہیں۔'' ایک لڑکا بولا۔

''واقعی۔'' ڈاکٹر سہیل نے مسکرا کر کہا۔ سہیل مقبول کے دوست اور کولیگ تھے۔

ہم سب بیٹھ گئے تو شمیم ان سب ڈاکٹروں سے ڈاکٹروں والی باتیں کرنے لگی۔ ہر ایک سے ان کے امتحان کی تیاری کے متعلق پوچھا۔

''تم لوگ کب سے یہاں ہو؟'' گڈی نے ان سے پوچھا۔

سہیل کچھ ماہ سے ادھر تھے۔ مقبول بھی بھائی کے پاس ہی تھے۔ ایک لڑکا دو دن پہلے ہی آیا تھا۔ دو لڑکوں کو دو تین ہفتے ہو چکے تھے۔ ان تین لڑکوں کے نام مجھے یاد نہیں۔ سہیل اس لیے یادوں میں رہ گئے کہ ان کے متعلق احمد نے کافی کچھ بتایا ہوا تھا۔ اونچے لمبے خوبصورت ڈاکٹر سہیل گاتے بھی بہت اچھا تھے۔ یوں اس وابستگی سے ان کا نام یاد رہا...... مقبول تو ویسے ہی اس قابل تھے کہ انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے۔

لڑکے پھر باورچی خانے میں جا گھسے۔ ہمیں کافی بنا کر پلائی اور دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے لگے۔

''آپ لوگ یہاں اکیلے ہی رہتے ہیں۔ احمد نے تو بتایا تھا کہ آپ کے بھائی ڈاکٹر محمود بھی ادھر ہی ہوتے ہیں۔'' نسیمی نے مقبول سے پوچھا۔

''جی آنٹی۔'' مقبول نے کہا۔ ''ہم سب محمود بھائی کے پاس ہی رہ رہے ہیں۔ یہ گھر انہی کا ہے۔ وہ کسی کام سے مارکیٹ گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔ ہاں بھابی اوپر ہیں، ابھی آ رہی ہیں۔''

تھوڑی ہی دیر بعد ایک خاتون اندر آئیں۔ وہ مسز محمود تھیں۔ سنہری رنگت چوڑے چہرے اور خوبصورت آنکھوں والی خاتون انڈونیشین تھیں۔ ڈاکٹر بھی تھیں۔ انہوں

نے حجاب لیا ہوا تھا۔ ایک بال نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈریس کے اوپر گرین ویلوٹ کا چغہ پہنا ہوا تھا۔ پوری آستین کا چغہ۔ ان کے صرف ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ پورا جسم ڈھیلے ڈھالے چغے سے ڈھکا ہوا تھا۔

ڈاکٹر محمود کے دو چھوٹے چھوٹے بیٹے تھے جن کی وجہ سے ان کی بیگم ابھی جاب نہیں کر رہی تھیں۔ وہ اردو سمجھ لیتی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے الفاظ بھی ادا کر لیتی تھیں۔ ان کے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ ملیں اور مسکرا کر السلام علیکم کہا۔

ہم نے بھی تپاک سے وعلیکم السلام کہا۔ اس انڈونیشی مسلم خاتون سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

ہم انگلش، اردو ملی جلی زبان سے ان سے باتیں کرنے لگے۔ میں نے نسیمی، گڈی، رقیہ اور شمیم پر نظر ڈالی۔ شمیم نے پینٹ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہماری شالیں بھی سروں سے ڈھلکی ہوئی تھیں۔ ندامت سی محسوس ہوئی۔ یہ خاتون ڈاکٹر بھی تھیں۔ امریکہ میں بھی رہ رہی تھیں۔

لیکن

صحیح اسلامی پردے میں تھیں۔

ڈاکٹر محمود بھی آ گئے۔ بہت خوشی اور تپاک سے ملے۔ ان کی شخصیت بڑی مرعوب کن تھی۔ اس وقت وہ شلوار قمیض پہنے تھے۔ سادگی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اتنے حلیم الطبع ایسے منکسر المزاج اتنے مشفق و مہربان لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ مقبول اور محمود دونوں کا مزاج ایک جیسا ہی تھا۔ گفتار و کردار میں سادگی تھی۔ دوسروں کی مدد کرنے میں پیش پیش۔ پاکستان سے آنے والے تین چار لڑکوں کو گھر میں بھائیوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ ان کی ہر طرح سے مدد کرنا گویا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ محمود مع اپنی مسز اور دونوں بچوں کے اوپر کی منزل میں مقیم تھے۔ نچلا گھر اور بیسمنٹ ان نئے ڈاکٹروں کے استعمال میں دے رکھے تھے۔

لڑکوں نے کھانا میز پر چنا۔

ایک نے کہا۔ ''پلاؤ میں نے بنایا ہے۔''

دوسرا بولا۔ ''قورمہ میں نے اور کباب میرے اس ساتھی نے۔''

سہیل نے کہا۔ ''دہی اور سلاد میں نے۔''

اس کی بات پر سب ہنس پڑے۔

ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ ان لڑکوں کے حساب سے کھانا اچھا ہی تھا۔ ہم سب نے ان کی بہت تعریف کی۔

آخر میں کھیر پیش کی گئی جو بہت عمدہ تھی۔

''یہ کس نے بنائی؟''

''بھابی نے......''

ہم نے مسز محمود سے پوچھا۔ ''واقعی آپ نے بنائی ہے؟''

''جی...... '' وہ بولیں۔ ''میں تو کھانا بھی بنانا چاہتی تھی لیکن یہ بھائی چاہتے تھے آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھانا کھلائیں۔''

ہم نے ان نئے ڈاکٹروں کا بڑے پیار سے شکریہ ادا کیا۔

''مقبول آپ نے کیا بنایا؟'' گڈی نے پوچھا۔

''میں اپنی نگرانی میں ان سے بنواتا رہا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''نہیں آنٹی، ہم نے انہیں کچن میں آنے ہی نہیں دیا۔ کچے پکائے کھانے کا ستیاناس کر دیتے۔ اصل میں ہم سب ہی کو بھابی کچن میں نہیں آنے دیتیں۔ کھانا پکانا تو ایک طرف برتن بھی خود ہی دھوتی ہیں کہ ہمارا وقت ضائع نہ ہو...... آج تو آپ کی خاطر ہم نے ان سے اجازت لی۔''

بھابی انہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہیں اور ہم ان کی عظمت کے معترف ہوتے رہے۔ جو دیور کے دوستوں تک کے لیے یہ سب کام کرتی تھیں۔ ایسے بے لوث، ایثار کرنے والے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود ان کی بیگم اور مقبول کے ان لڑکوں کے ساتھ برتاؤ سے یہی لگتا تھا جیسے سبھی ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔

شام ہم واپس لوٹے۔

احمد نے وہیں رہنا تھا۔ گڈی بیٹے سے جدا ہوتے کچھ افسردہ سی تھی۔

ڈاکٹر محمود نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولے۔ ''بھابی آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ مقبول نے مجھے بتایا تھا کہ احمد نیو جرسی میں خالہ کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہاں شاید شادی بھی تھی۔ یقین مانیں مجھے بڑی فکر تھی کہ احمد کا وقت ضائع ہو رہا ہوگا۔ اچھا ہوا، اب یہ یہاں آ گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری ہماری ہے۔ آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں۔''

''اسے یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ سہیل اور دوسرے لڑکوں کی طرح احمد بھی ہمارے لیے مقبول ہی ہے۔'' بھابی نے انگلش میں کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' گڈی نے بھابی سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

شمیم نے ان سب کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔

راستہ بھر ہم انہی کی باتیں کرتے آئے۔ کتنے سادہ، کتنے پُرخلوص، کتنے ہمدرد اور کیسے شفیق لوگ تھے یہ جو دوسروں کی ذمہ داری اتنی خوشی اور اعتماد سے اٹھاتے تھے۔ نہ اپنا کوئی مفاد پیش نظر نہ کوئی طلب بلکہ انہیں وقت دینے کے ساتھ ان پر خرچ کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ لڑکے پاکستان اپنے گھر والوں کو فون کرنے کے لیے کبھی کارڈ لے آتے تو ڈاکٹر صاحب ایسا کرنے سے منع کرتے۔ کہتے۔ ''بھئی تم نے فون کرنا ہوتا ہے تو کارڈ مت لایا کرو۔ گھر کے فون ہی سے کر لیا کرو۔ تمہارے فون کا خرچہ بچ جانے سے میں کوئی محل تو کھڑے نہیں کراؤں گا...... بے فکر ہو کر فون کیا کرو۔''

خیر ان دونوں بھائیوں نے ہمیں بڑا متاثر و مرعوب کیا۔ ایسے لوگ دیکھنے میں بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ جو بہت کچھ ہوں لیکن اپنے رویوں سے دوسروں کو بہت کچھ ہونے کا احساس نہ دلائیں۔ انتہائی پُراعتماد ہوں لیکن انکساری کو شعار بنائیں۔

دوسرے دن نسیمی حمیرا کے گھر چلی گئی۔ اس نے چند دن آمنہ کے ہاں بھی رہنا تھا۔ آمنہ کے ہاں ہم لوگ بھی مدعو تھے۔ طے یہی پایا کہ نسیمی حمیرا کے ہاں دو چار دن رہ کر آ جائے۔ پھر ہم سب آمنہ کے ہاں رہیں۔ دریں اثناء میں نے بھی سوچا، دو چار دن بشرہ

کے ہاں رہ آؤں۔ وہاں سے مجھے اپنے دیور کی بیٹی صائمہ نسیم کے ہاں بھی جانا تھا۔

چند دن کے لیے الگ ہو گئے۔ بشرہ اور فاران آ کر مجھے لے گئے۔ نسیمی کو حمیرا...... گڈی اور رقیہ شمیم کے ہاں ہی رہیں۔ صائمہ سان فرانسسکو سے اپنا کچھ سامان لینے آ رہی تھی۔ سو ان دونوں کا مشغلہ بھی اچھا رہا۔

میں دو دن بشرہ کے ہاں رہی۔ یہاں پھر وہی شغل...... روز ہی سٹوروں کے چکر۔ ہر جگہ ابھی تک سیلیں لگی تھیں۔ بعض چیزیں تو بہت سستے داموں مل جاتی تھیں۔ سردیوں کا سیزن ختم ہو رہا تھا۔ اس لیے گرم کپڑے، سویٹر، جیکٹس اور کوٹ کافی سستے مل رہے تھے۔ میں نے بھی کچھ تحفے خریدے۔ چھوٹی موٹی چیزیں تو پاکستان بطور گفٹ لانا ہی تھیں۔

میں بشرہ کے ہاں ہی تھی کہ ریشم کا فون آیا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ بولی۔

''نانی آپ ہمیں ملے بغیر چلی گئیں تو ہم لوگ آپ سے کبھی بھی نہ بولیں گے۔''

لیجیے صاحب۔ اب تو کیلیفورنیا جانا ضرور ہوگا۔ لاڈلی نواسی کو ناراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اور

پھر

اس کے شوہر برخوردار امیر احمد خان بھی مصر تھے کہ میں ان سے ملے بغیر نہ جاؤں۔ دونوں کا اتنا پیار بھرا اصرار رد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلے بھی ان کے کئی فون آ چکے تھے اور تو اور پاکستان سے ریشم کے امی ابو یعنی میری بیٹی روبو اور حسنین کے بھی فون آ چکے تھے کہ میں ریشم کے پاس سان ڈیگو ضرور جاؤں...... ورنہ وہ ناراض ہو جائیں گے۔ یہ محبت بھری دھمکیاں دونوں طرف سے مل رہی تھیں۔

اور

میں!

سوچ میں پڑ جاتی تھی کہ کیلیفورنیا جانا میرے لیے آسان نہ تھا۔ لاس اینجلس کا

ٹکٹ کم از کم چھ سات سو ڈالر تھا یعنی صرف آنے جانے کے لیے چھ سات سو ڈالر درکار تھے۔اس کے علاوہ بچی کے ہاں پہلی دفعہ جانا تھا اور بھی خرچہ ہونا تھا۔اس کے لیے گفٹ تو میں پاکستان سے لے کر آئی تھی۔ جیسے بشرہ کو دیے تھے۔خیال تھا، ریشم اور امیر صائمہ کی شادی پر آئیں گے تو دے دوں گی......

لیکن ایسا نہیں ہوا......

میں تین دن بشرہ کے ہاں رہی۔تینوں دن امیر اور ریشم فون کرتے رہے۔اب نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی بات لگتی تھی۔

خیر

میں نے کہہ دیا۔''کوشش کروں گی۔''

جواب میں ریشم ناراض ہوتے ہوئے بولی۔''کوشش کا کیا مطلب نانی۔آپ نے آنا ہے۔''

''اچھا بھئی۔دیکھوں گی۔''

''پھر وہی مشکوک بات۔''

''ہوں......چلو آؤں گی۔اب خوش۔''

''نانی اگر ٹکٹ کا مسئلہ ہے تو امیر کہتے ہیں، میں بھیج دیتا ہوں۔''

اب تو واقعی رہائی کی کوئی صورت نہ تھی......میں نے ریشم سے کہہ دیا۔''امیر سے کہنا ٹکٹ کا مسئلہ نہیں۔میں خرید لوں گی......''

''تو پھر کس بات کا مسئلہ ہے؟''

''وقت کا۔''

''کیوں؟''

''گھر سے دل اداس ہو گیا ہے۔اب ہم لوگ واپسی کا سوچ رہے ہیں۔''

''سب کو سوچنے دیں۔بے شک واپس چلی جائیں لیکن آپ یہاں آنے کی تیاری کریں اچھا۔''

''اچھا بھئی اچھا۔''

''وعدہ۔''

''وعدہ۔''

''پکا۔''

''پکا......''

''جیتیں نانی سو برس جئیں......''وہ خوشی سے بہک گئی۔ریشم کو پاکستان سے آئے تقریباً ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔سان ڈیگو میں اکیلی تھی۔بہت ہی اداس ہو گئی ہوئی تھی......

کیلیفورنیا جانا تو میں نے تھا ہی۔روبو اور حسنین نے بھی بہت کہا تھا کہ ان کی بیٹی سے مل کر آؤں۔ریشم کا بھی اصرار......امیر کے بھی بلاوے پہ بلاوے......بس وہ بات تھی۔

کہ

ارادے باندھتا ہوں......

اور

توڑ دیتا ہوں۔

لیکن

اب جائے مفر نہ تھی۔سو ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر لیا۔

لیکن

جب تک نسیمی، رقیہ اور گڈی یہاں تھیں۔مجھے جانے نہ دیتی تھیں۔

''ہم واپس چلے جائیں......تو آپ ریشو کے پاس ہو آنا۔ابھی ہم چاروں کا ساتھ ہے۔لوٹنا نہیں چاہیے۔ابھی تو ہم نے کئی جگہیں دیکھنی ہیں۔''

''ٹھیک ہے......''میں نے ان کی بات مان لی۔

تب

ہمارے روز کے معمولات اسی طرح شروع رہے۔کبھی سارا دن گھر پہ گزرتا۔کبھی آمنہ اپنے گھر لے جاتی۔کبھی سٹوروں کی سیر کراتے اور کبھی کسی رشتہ دار کے ہاں ہو آتے۔

ایک شام ہم گڈی کے جیٹھ کے بیٹے طارق کے ہاں گئے۔ اس کی بیوی امریکن تھی۔ تین پیارے پیارے بچے، چوتھا آنے والا......

امریکی معاشرے میں جائنٹ فیملی سسٹم کا کوئی تصور ہی نہیں۔ بچے بھی سولہ سال کے ہو جائیں تو ان کو حق حاصل ہوتا ہے کہ جہاں چاہیں رہیں۔ اکثر ماں باپ سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اپنا کماتے، اپنا کھاتے ہیں۔ دل چاہے تو ماں باپ سے ملنے آجاتے ہیں۔ اپنا بار ان پر نہیں ڈالتے۔ اکٹھے بھی رہیں۔ تب بھی اپنے اخراجات کا بوجھ چھوٹے موٹے کام کر کے خود اٹھاتے ہیں۔ اپنا کھانا پینا خود کرتے ہیں۔ کپڑے خود دھوتے ہیں۔ یہ بات نہ ماں باپ کو بری لگتی ہے نہ بچوں کو۔ وہاں کا دستور ہی یہ ہے۔

لیکن

طارق کے گھر جا کر ہم نے جو دیکھا وہ اس معاشرے کے مطابق بالکل الٹ تھا۔ طارق کی امریکن بیوی ڈانا ایک اچھی گھریلو خاتون تھی۔ اپنے بچے تو خیر اپنے تھے، اس نے اپنے ہاں دیور کی دو جوان بیٹیوں اور ایک بیٹے کو بھی رکھا ہوا تھا۔ نہایت ضعیف اور بہری ساس بھی اسی گھر میں رہتی تھی جس کا خیال ڈانا اتنا رکھتی تھی کہ پاکستانی بہوئیں بھی شاید ساسوں کا اتنا خیال نہ رکھ سکتی ہوں۔ وہ بستر پر ہی رہتی تھیں۔ ڈانا انہیں وقت پر چائے کھانا ناشتہ وہیں دیتی تھی۔ اس کے علاوہ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ کر ان سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی۔ بچوں کو دادی کے ساتھ پیار ڈانا کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ دیور کی بیٹیوں کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے۔ دونوں لڑکیاں اور ان کا بھائی پڑھ رہے تھے۔ پارٹ ٹائم جاب کرتے تھے۔ اس طرح ڈانا کا ہاتھ گھریلو کاموں میں کم ہی بٹا سکتے تھے۔ امریکہ میں سارا کام خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ ڈانا کمال کی عورت تھی۔ گھریلو کاموں کے ساتھ ان سب کو سنبھالنا آسان کام نہ تھا لیکن وہ اس معاملے میں مشرقی عورتوں سے بھی نمبر لے گئی تھی۔ اس کے گھر جا کر اس سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

یہاں سے ہم گھر لوٹے تو آمنہ ہمیں اپنے ہاں لے جانے آئی ہوئی تھی۔ اس کے ہاں ہم پہلے بھی رہ چکے تھے لیکن اب پھر وہ ہمیں اپنے گھر لے گئی۔ دو دن ہم اس کے

ہاں رہے۔ بہت مزہ آیا۔ رات کے دو دو بجے تک گپ شپ لگتی۔ آمنہ کبھی چائے بنالاتی، کبھی قہوہ...... آمنہ کی پانچ سالہ بیٹی بھی اتنی "نانیوں" کو اپنے گھر میں دیکھ کر خوش تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ جاگتی۔ آمنہ اسے وقت پر سلاتی لیکن وہ چپکے سے ہمارے پاس آجاتی۔ پھر ہمارے پاس ہی سو جاتی۔ یہ دو دن ہم نے آمنہ کے گھر پر ہی گزارے۔ کہیں بازار نہیں گئے۔ زمانے بھر کی باتیں کر ڈالیں اور لطف اندوز ہوتے رہے۔

آصف بھی ہماری محفل میں بیٹھتا۔ اسے ہم سے اپنے بچپن کی باتیں سن کر بہت لطف آتا۔ وہ بہت چھوٹا تھا۔ جب اس کے ابو ڈاکٹر اقبال فوت ہو گئے تھے۔ وہ بار بار انہی کے متعلق ہم سے پوچھتا۔

"وہ کیسے تھے؟"

"باتیں کیسے کرتے تھے۔ سنا ہے، بہت خوش مزاج تھے؟"

"آپ لوگوں سے ان کی بہت دوستی تھی۔"

"کھانا کیسا پسند کرتے تھے؟"

"مجھے پیار کرتے تھے......"

"مجھے ان کی شکل بالکل یاد نہیں۔"

"میری پہلی سالگرہ انہوں نے دھوم دھام سے منائی تھی نا۔"

"صائمہ تو صرف دس ماہ کی تھی جب ابو فوت ہو گئے تھے۔ اس کی سالگرہ بھی نہ منا سکے۔ امی نے بھی نہیں منائی ہوگی۔ دو ماہ تو ابھی ابو کی ڈیتھ کو ہوئے ہوں گے۔"

ہم اس کی باتوں کا جواب تو دیتے لیکن یہ محسوس کر کے بڑا دکھ ہوتا کہ آصف ماشاءاللہ بچی کا باپ بھی بن چکا ہے لیکن باپ کی کمی کو اب تک بری طرح محسوس کرتا ہے۔

آمنہ کے ہاں سے ہم لوگ پھر حمیرا کے ہاں آگئے۔ چند دن اس کے ہاں رہے۔ پھر میں بشرہ کے ہاں گئی۔ وہاں سے صائمہ نسیم کے ہاں چلی گئی۔ ایک رات اس کے ہاں گزاری۔

میں نے کالوں کے علاقے کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ امریکہ کا یہ رخ بھی دیکھوں لیکن ابھی تک وہاں نہ جا سکے۔ اکثر لوگ وہاں جانے سے کتراتے ہیں۔ ہم چاروں اکیلی بھی وہاں جانے کی ہمت نہ کر سکتی تھیں۔ شمیم سے کہتے تو وہ کہتی۔ "دفع...... وہ بھی کوئی دیکھنے کی جگہ ہے...... غریب، اجڈ، چور اُچکے، تہذیب سے نا آشنا...... مذہب سے نابلد...... سوچ لیں کہ ان کا علاقہ کیسا ہوگا۔"

لیکن

میں مصر تھی کہ ان کا علاقہ ضرور دیکھوں گی۔ پہلے نوفل سے پروگرام بنا لیکن وہ مصروفیت کی وجہ سے ہمیں نہ لے جا سکا۔ پھر صائمہ کے میاں نسیم نے وعدہ کیا کہ وہ ہمیں "ہارلیم" (کالوں کا علاقہ) دکھلائیں گے...... وہ بھی ہمیں وہاں نہ لے جا سکے۔

لیکن بندہ امریکہ جائے اور ہارلیم کا علاقہ بھی نہ دیکھے...... یہ کیسے ممکن ہے۔

میری باقی ساتھی تو وہاں جانے میں دلچسپی نہ لے رہی تھیں لیکن مجھے وہاں جانے کا شوق تھا۔ تجسس بھی تھا۔ تجربہ بھی کرنا چاہتی تھی۔ کالوں کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ہارلیم کے بارے میں بھی آمنہ نے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ ہارلیم امریکہ کا اک بھیانک رخ تھا۔ یہاں کالے امریکی لوگ کس حال میں رہتے تھے، کیا کرتے تھے، گوروں سے انہیں کتنی نفرت تھی، ان کے ذرائع آمدنی کیا تھے، طرز رہائش کیسی تھی۔ جانوروں کی سی زندگی کیوں گزارتے تھے...... میں یہ سب کچھ دیکھنا چاہتی تھی۔

ہمارے ایک عزیز تھے جو اتفاقاً ہی ملے۔ باتوں باتوں میں ہارلیم کا ذکر ہوا اور میں نے یہ علاقہ دیکھنے میں دلچسپی دکھائی تو وہ ہنس کر بولے۔ "آپا وہ علاقہ دیکھ کر آپ کو متمدن اور متمول امریکہ سے گھن آنے لگے گی۔ ان کی دوغلی طرز زندگی دیکھ کر آپ پریشان ہوں گی۔ چھوڑیں ہارلیم کو۔ بس اسی خوبصورت امریکہ کی سیر کریں۔ جہاں زندگی آسائشوں، سہولتوں سے معمور ہے۔"

انہوں نے اتنا کچھ کہا کہ میرے شوق کو جیسے مہمیز لگی۔ میں نے ان سے کہا۔ "اب تو میں ضرور ہارلیم دیکھوں گی اور تم ہی مجھے لے کر جاؤ گے۔"

وہ ہنس کر بولے۔ "وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ پہلے مجھے ایک بانڈ لکھ دیجیے گا کہ وہاں آپ پر کسی نے وار کیا یا آپ سے پرس چھینا۔ یہ تھوڑا سا زیور جو آپ نے پہن رکھا ہے، اتروانے کی کوشش کی تو مجھے ذمہ دار نہ ٹھہرائیں گی۔"

"بہانے مت بناؤ...... تم نے مجھے وہاں لے کر جانا ہے۔"

"ایسا ہوتا بھی ہے آپا۔ مذاق نہیں کر رہا......"

"کیوں وہاں چور اُچکے، ڈاکو لٹیرے بستے ہیں؟"

"صرف یہی نہیں، قاتل بھی۔"

"تم مجھے ڈرا رہے ہو؟"

"بالکل نہیں...... سچ کہہ رہا ہوں۔"

"کیا وہاں کالوں کے سوا دوسرے لوگ نہیں جاتے؟"

"جاتے ہیں، سیاح تو ضرور جاتے ہیں۔"

"مجھے بھی سیاح سمجھ لو۔ میں وہاں سیاحت کے لیے جانا چاہتی ہوں۔"

"اکیلی جائیں گی یا نسیم آپا اور......"

"وہ جائیں نہ جائیں، تم یہ بتاؤ مجھے دکھانے لے جاؤ گے؟"

"چلیے لے جاؤں گا۔"

"کب؟"

"جب آپ کہیں۔"

"کل آ جاؤں، مجھے کل چھٹی ہے۔"

"پھر تو اچھی بات ہے۔"

"میں سات بجے تک آ جاؤں گا۔ تیار رہیے گا بلکہ ان سب کو بھی تیاری پر آمادہ کر لیجیے گا۔ اس نے نسیمی، گڈی اور رقیہ کی طرف اشارہ کیا۔"

"یہ خود ہی چل پڑیں گی۔ اب تم وقت پر آ جانا، ہم تیار رہیں گے۔"

"میں تو آپ لوگوں کو کھانے کی دعوت دینے آیا تھا۔ چلیں کل دوپہر نہ سہی، کل

رات کھانا ہمارے ہاں ہوگا......"

"نہیں راشد۔ تم ہمیں ہارلیم گھما پھرا لاؤ گے، اتنا ہی کافی ہے۔"

"کھانا تو آپ کو ہمارے ہاں کھانا ہی ہوگا۔"

"ابھی ہم یہیں ہیں۔ پھر کسی دن کھالیں گے۔ گھر والی بات ہے۔"

ہمیں ہارلیم دکھانے کا وعدہ راشد نے کر لیا۔ صبح ساڑھے چھ بجے اس نے ہمارے ہاں پہنچنا تھا تا کہ پورے سات بجے نیو یارک روانہ ہوسکیں۔

ہم وقت سے پہلے ہی تیار ہو گئے۔ شمیم نے ہسپتال جانے سے پہلے ہمیں ہارلیم جانے سے ایک بار پھر روکا لیکن ہم کہاں رکنے والے تھے۔ وہ ہوسپٹل چلی گئی۔

اور

ہم راشد کے ساتھ نیو یارک روانہ ہو گئے۔ راشد اپنے ساتھ ہارلیم کے بارے میں شائع ہونے والے پمفلٹ میں سے ایک لے آیا۔ یہ عام طور پر سیاحوں کے لیے ہدایات پر مبنی ہوتے ہیں۔

"آپا ہارلیم جانے سے پہلے یہ ہدایات پڑھ لیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے پمفلٹ مجھے پکڑا دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"ہارلیم جانے والوں کے لیے ہدایات ہیں۔"

"اچھا۔"

"جی ہاں۔" وہ گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔ میں نے پرس میں سے عینک نکالی اور پمفلٹ پڑھنے لگی۔ اس میں جو ہدایات درج تھیں، انہوں نے خاصا پریشان کر دیا۔

"کیوں؟" راشد مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"کیا ہے آپا؟" نسیمی نے ہاتھ بڑھا کر پمفلٹ مجھ سے لے لیا۔ وہ تینوں پمفلٹ پڑھنے لگیں۔ اس میں ہدایات کچھ یوں تھیں۔

"اس علاقے میں اکیلے ہرگز نہ جائیں۔"

"بہت زیادہ لوگوں کے گروپ کی شکل میں بھی نہ جائیں۔"

"پرس میں قیمتی چیزیں اور زیادہ پیسے نہ رکھیں لیکن بیس تیس ڈالر ضرور ساتھ لے جائیں۔"

"جیولری پہن کر نہ جائیں۔ نہ ہی بہت قیمتی اور فیشن ایبل لباس پہن کر جائیں۔"

"بڑی سڑکوں پر ہی گھومیں۔ سائیڈ لین میں نہ جائیں۔"

"رات کے وقت وہاں جانے کی حماقت کبھی نہ کریں۔"

"کیمرہ ساتھ ہرگز نہ لے جائیں۔"

"کار پر نہ جائیں۔ ٹیکسی یا گائیڈ ایجنسی کی کسی بس میں جائیں۔"

نسیمی، رقیہ اور گڈی بھی پریشان ہوئیں لیکن اب تو ہم روانہ ہو چکے تھے۔ ہارلیم دیکھنا ہی تھا۔

میں نے راشد سے کہا۔ "بھئی کار کی بجائے گائیڈ ایجنسی کی بس میں جانا ٹھیک نہ رہے گا؟"

"بالکل۔ ہم گاڑی نیو یارک ہی میں چھوڑ دیں گے۔ وہاں سے بس میں جائیں گے۔ دو کمپنیاں ہارلیم کے لیے بسیں چلاتی ہیں۔ یہ کمپنیاں کالوں کی ملکیت ہیں۔ بس ڈرائیور بھی کالے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی ہمراہی میں وہاں جانا زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔"

"آپا آپ کو ایسی خطرناک جگہ جانے کا کیا شوق چڑھا تھا؟" رقیہ ڈر گئی تھی۔

"تم نہ آتیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"گھر پر اکیلی کیا کرتی۔"

"کچھ نہیں ہوتا بھابی۔" نسیمی نے کہا۔

"لوگ ہارلیم دیکھنے جاتے ہی ہیں نا...... اتنی اندھیر گردی تھوڑا ہی ہے۔"

"ہے تو سہی......" راشد ہنستے ہوئے بولا۔ "کبھی کبھی کچھ نہ کچھ ہو بھی جاتا ہے۔"

"بھئی اب کوئی اچھی اچھی باتیں کرو...... ہمیں وہاں لے جا رہے ہو۔ واپس بھی لانا ہے۔"

''فکر نہ کریں آپا۔ انشاء اللہ آپ ہارلیم دیکھیں گی۔ گو یہ ایک ناخوشگوار تجربہ ہوگا۔ کالوں کی پسماندگی، طرزِ رہائش' طور طریق دیکھ کر آپ سوچیں گی کہ کیا یہ لوگ بھی امریکن ہیں؟ یہ علاقہ بھی امریکہ کا حصہ ہے؟''

ہم باتیں کرتے رہے اور راستہ کٹتا رہا۔

وہی راستہ

جس پر سے کئی بار گزر کر ہم نیویارک آتے جاتے رہے تھے۔

-------O-------

ہارلیم کا علاقہ 110 ویں سٹریٹ سے شروع ہوتا ہے اور سنٹرل پارک تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ 110 اور 136 سٹریٹ کے درمیان واقع ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک ہارلیم چھوٹا سا گاؤں تھا اور یہاں ہالینڈ کے باشندے آباد تھے لیکن جب ہالینڈرز کے باہر سے آنے میں اضافہ ہوا تو یہ لوگ اس خوشحال علاقے کو چھوڑ چھوڑ کر دوسری جگہوں میں آباد ہونے لگے۔

امریکہ کی آبادی جب یہ ملک دریافت ہوا تو بہت کم تھی۔ ریڈ انڈین یہاں کے باشندے تھے۔ ملک بے حد وسیع و عریض تھا۔ وسائل بے پناہ تھے۔ کاشتکاری، صنعتکاری اور دیگر شعبوں کے بے پناہ میدان تھے۔ لوگ انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے علاقوں سے یہاں منتقل ہونے لگے تھے اور اپنی اپنی بستیاں آباد کر لیں۔ جوں جوں لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہ لوگ ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلنے لگے۔ ہالینڈ والوں نے پہلے ہارلیم کا علاقہ چنا، اٹلی نے منی اٹلی بسایا۔ چین نے چائنا ٹاؤن کی بنیادیں رکھیں۔ انگریز تو نیویارک کے کئی علاقوں پر چھا گئے۔

یوں یہ سب بستیاں نیویارک کے ساحلی یا سمندر کے قریب قریب علاقوں میں وجود میں آ گئیں۔ یہ لوگ خوشحال ہوئے تو دوسرے علاقوں میں جانے لگے لیکن ان کے آباد کردہ علاقے خاصے بڑے بڑے شہروں کی طرح بن گئے۔ جیسے چائنا ٹاؤن بہت وسیع و عریض علاقہ ہے۔ چینی بازار، چینی ریسٹورنٹ، چینیوں کے چینی طرز کے گھر۔ غرضیکہ ہر چیز ہی وہاں چینی ہے۔ لگتا ہے چھوٹا چین آباد ہے۔ اب تو چائنا امریکی

معیشت پر تیزی سے چھا رہا ہے۔ چینی پورے امریکہ میں پھیلے ہیں لیکن چائنا ٹاؤن اب بھی چینی مرکز ہے۔

اسی طرح اٹلی کے لوگوں نے جو علاقہ بسایا وہاں اب بھی اٹالین موجود ہیں۔ اس علاقے کو منی اٹلی بھی کہا جاتا ہے اور ان لوگوں نے بھی بستیاں آباد کیں۔ پھر پورے امریکہ میں پھیل گئے۔ یہ بستیاں اب بہت پھیل چکی ہیں۔

ہارلیم میں خوشحال ہالینڈرز رہتے تھے۔ یہاں انہوں نے بڑے خوبصورت رہائشی مکانات بنوائے تھے۔ معیار زندگی دولت ہونے کی وجہ سے بلند تھا۔

لیکن

جب مین ہٹن میں خوشحالی آئی۔ ترقی کی راہیں استوار ہوئیں تو وہاں کی سیاہ فام آبادی سمٹ کر ہارلیم میں منتقل ہونے لگی۔ جب ان کی آبادی میں اضافہ ہوا تو ہالینڈ کے باشندے یہاں سے امریکہ کے دوسرے حصوں میں منتقل ہونے لگے۔

اور یہاں

سیاہ فام لوگوں کی آبادی بڑھنے لگی۔ 1920ء تک یہ علاقہ خالص کالوں کی بستی میں تبدیل ہو گیا۔

اس وقت یہاں کچھ سیاہ فام خوشحال بھی تھے۔ جاز موسیقی کے اس زمانے میں بعض کالوں نے بہت نام پیدا کیا اور خوب دولت کمائی۔ وہ بڑے بڑے میوزیکل شو کرتے اور خوب پیسہ کماتے۔ باکسنگ میں بھی ان لوگوں نے نام پیدا کیا۔

لیکن یہ سیاہ فام خوشحال لوگ بھی آہستہ آہستہ امریکہ کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہوتے چلے گئے۔

اور

یہاں پسماندہ، غیر تعلیم یافتہ اور بے ہنر لوگ رہ گئے۔ جن عمارتوں میں یہ لوگ رہائش پذیر تھے۔ ان کے اخراجات ادا نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے گیس، بجلی اور پانی کے بل ادا نہ ہونے کی صورت میں ان لوگوں کو ان بنیادی سہولتوں سے محروم کر دیا گیا۔ پھر انہیں ان

عمارتوں سے بے دخل کیا جانے لگا تو انتقاماً لوگ رات کو کسی نہ کسی بلڈنگ کو آگ لگا دیتے۔ وہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتیں۔ بلدیہ والے دراصل ان عمارتوں سے غریب کالوں کو بے دخل کر کے کسی اور علاقے میں جانوروں کی طرح دھکیلنا چاہتے تھے جس کا نتیجہ یہ آتشزدگی اور بڑی خوبصورت عمارتوں کی توڑ پھوڑ کی صورت میں نکلا۔

یوں یہ علاقہ کھنڈر بن گیا اور انتہائی غریب سیاہ فام ان کھنڈروں میں رہنے لگے۔ کچھ علاقے اس دستبرد سے بچ بھی گئے۔ ان پر بہتر حالت والے سیاہ فاموں نے قبضہ کر لیا جواب بھی یہاں رہتے ہیں۔ جن سیاہ فاموں نے تعلیم حاصل کی تھی یا مالی ذرائع اچھے تھے، وہ امریکہ کے دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ وہاں محنت کی، کاروبار چلائے۔ نوکریاں کیں۔ اپنی پوزیشن مستحکم کی لیکن آبادی کے لحاظ سے ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سفید فام امریکی ان سیاہ فاموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انہیں اپنے برابر کا انسان نہیں سمجھتے۔ اچھی نوکریاں ان لوگوں کا مقدر نہیں۔ گو اب سفید فام کچھ لبرل ہو گئے ہیں۔ پھر بھی ان سیاہ فاموں کی اچھی ملازمتوں پر تعیناتی ایک فیصد سے زیادہ نہیں۔ چھوٹے موٹے کام اور سٹوروں میں نوکریاں ہی کرتے ہیں۔ کچھ ڈاکٹرز اور انجینئرز بھی بن گئے ہیں لیکن امریکن آبادی کے لحاظ سے ان کی تعداد بہت کم ہے۔

ہارلیم اب بیروزگاری کے مارے کالوں کی آبادی مشہور ہے۔ جرائم اور مار دھاڑ عام ہے۔ منشیات کا دھندہ بھی عام ہے۔ غنڈوں نے یہاں قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ پولیس بھی دخل اندازی نہیں کرتی۔ ان لوگوں کو ان کے حالوں پر چھوڑ دیا ہوا ہے۔ زیادہ تو تکار کرنے پر یہ لوگ پولیس مین کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہاں پولیس آفیسر دوسرے علاقوں کے پولیس افسروں سے کئی گنا زیادہ تنخواہ پر متعین کیا جاتا ہے کیونکہ ان سیاہ فاموں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ کسی بات پر طیش میں آ کر اسے قتل کر دیں۔ جان خطرے میں ڈال کر وہ یہ جاب لیتا ہے۔

چونکہ یہ لوگ غربت اور افلاس کے مارے ہوئے ہیں، ڈھنگ کا کوئی کام نہیں کرتے۔ بلا کے سست ہیں، اس لیے نہ تو نئی روشنی ان تک پہنچی ہے، نہ تہذیب و تمدن ان

پراثر انداز ہوئی ہے۔

ہم ہارلیم بذریعہ بس گئے۔ اس کا ڈرائیور کالا تھا۔ اونچا لمبا موٹا تازہ۔ موٹے موٹے ہونٹ، بھدی موٹی ناک، آنکھیں بڑی بڑی چوپٹ کھلی ہوئیں۔ وہ راستہ بھر بولتا رہا اور ہارلیم کے بارے میں بتاتا رہا۔ کبھی اس کی آواز غصیلی ہو جاتی۔ سفید فاموں سے نفرت کا اظہار کرتا۔ کالوں کو ان حالوں تک پہنچانے والے اس کی نظر میں یہ سفید فام اور ان کی حکومت تھی۔

ہم سٹاپ پر اترے۔ راشد ہمارے ساتھ تھا۔

ارد گرد نگاہ ڈالی تو یوں لگا جیسے کسی ہولناک زلزلے سے یہاں سب کچھ تہس نہس ہو چکا ہے۔ جلی ہوئی سیاہ بلڈنگیں جیسے بمباری میں تباہ ہوئی ہوں۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی۔ جگہ جگہ گڑھے، کوڑے کے ڈھیر۔ سڑکوں کے کنارے کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی نے پیشاب نہ کیا ہو۔ بد بو ہی بد بو تھی۔ جو لوگ وہاں گھوم پھر رہے تھے۔ میلے کچیلے لباس پہنے تھے، بال گندگی سے اکڑے ہوئے۔ چہروں پر داغ دھبے۔ جیسے برسوں سے نہائے نہ ہوں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے غول بیکار ادھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ کچھ دیواروں کے ساتھ لگ کر چپ چاپ کھڑے تھے۔ چہروں پر اک مہیب سی خاموشی تھی۔ کچھ معمر لوگ برآمدوں کے تھڑوں پر بیٹھے نشہ آور سگریٹ پی رہے تھے۔ کچھ شراب کے ٹن تھامے تھے۔ ٹن ختم کر کے زور سے سڑک پر پھینک دیتے۔ امریکہ میں جو صفائی کا معیار دیکھا تھا، وہ یہاں آ کر کرچی کرچی ہو گیا۔ یقین نہ آتا تھا۔ یہ بھی امریکہ ہے اور یہ گندے مندے لوگ امریکی باشندے ہیں۔ جو زندگی کی ہر سہولت سے محروم ہو کر پتھر ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی سست' کاہل الوجود...... بیزار نشئی ہیں۔ کام کرنے سے کتراتے ہیں۔ گزر بسر کے لیے کبھی چوری ڈکیتی' کبھی دنگا فساد کر لیتے ہیں۔ راہ جاتوں سے مانگنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان کی سب سے بڑی ہابی بچے پیدا کرنا ہے۔ شادی یا شادی کے بغیر افزائش نسل ان کا مشغلہ ہے۔ بچے پیدا کر کے ان کے مرد بچوں کی ذمہ داری قطعاً نہیں اٹھاتے۔ مائیں جوان قانونی یا غیر قانونی بچوں کو جنتی ہیں، ساری ذمہ داری ان پر ڈال کر کالے یا تو راہ فرار

اختیار کرتے ہیں یا لاتعلق بن جاتے ہیں۔ مائیں اب ان کو پالیں یا تھوڑا بہت کام کر کے روزی کمائیں۔ وہ دونوں کام ہی پوری طرح نہیں کر پاتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے خود رو پودوں کی طرح پل جاتے ہیں۔ تربیت سے عاری یہ بچے سکول نہیں جاتے۔ چھوٹی عمر ہی میں بری صحبت میں پڑ جاتے ہیں۔

یہ سیاہ فام راندۂ درگاہ لوگ بہت کم بولتے ہیں۔ ہنستے بھی نہیں۔ قہقہہ تو کبھی کسی نے سنا ہی نہیں ہوگا۔ بس خلاؤں میں گھورتے ہوئے ملیں گے یا سفید فاموں سے نفرت کا اظہار کرتے۔ انہیں ہر سفید چیز سے نفرت ہے۔ نفرت کا لاوا ان کے اندر پک رہا ہے۔ مذہب سے بھی یہ لوگ بے بہرہ ہیں۔ کئی کالے عیسائیوں سے انتقام لینے کے لیے مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے متعلق انہیں کوئی خاص معلومات نہیں ہوتیں۔ کلمہ بھی پوری طرح نہیں آتا لیکن کسی مسلم فرقے سے وہ حلقہ اسلام میں آنے کی استدعا کر کے نام نہاد مسلمان بن جاتے ہیں۔

ایک سروے رپورٹ ہے کہ امریکہ میں غیر قانونی بچوں کی تعداد کالوں میں بہت زیادہ ہے۔ سیکس ان کے لیے عام اور روزمرہ کے معمول کی چیز ہے۔ بارہ تیرہ سالہ لڑکیاں مائیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ یہاں عام طور پر مشترکہ خاندانی طریق قائم ہے، اس لیے یہ فالتو اور ان چاہے بچے کسی نہ کسی طرح پل ہی جاتے ہیں۔ بعض سفید فام بھی یہاں عیاشی کے لیے آتے ہیں۔ سفید اور سیاہ کے امتزاج سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں، ان کے رنگ خالص کالوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ بعض اوقات تو گورے ہوتے ہیں لیکن عام طور پر ان کی رنگت سانولی ہوتی ہے۔ جو نہ کالی ہوتی ہے نہ گوری۔ سیاہ فام اور سفید فام شادیوں کے نتیجہ میں بھی سانولی نسل عام ہے۔

ہارلیم میں اکثریت غریبوں، بیکار اور بیروزگاروں کی ہے۔ لوگ کھنڈروں میں رہتے ہیں۔ کئی بڑے بڑے کریٹوں میں گھر بسا لیتے ہیں۔ بڑے بڑے بیکار پڑے سیمنٹ کے پائپوں میں بھی بسیرا کر لیتے ہیں۔

کالوں کی کافی تعداد امریکہ میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ لوگ ان لوگوں سے

بالکل مختلف ہیں۔ پڑھ لکھ کر نوکریاں کرتے ہیں۔ گورے گوریوں سے ان کی شادیاں بھی ہو رہی ہیں۔ یہ لوگ میوزک کے شوقین ہیں۔ چونکہ جسمانی لحاظ سے تنومند ہیں، اس لیے باکسنگ میں پیش پیش ہیں۔ گو ان کالوں کو بھی گورے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے لیکن پھر بھی ہارلیم کے کالوں سے یہ بدر جہا بہتر حالت میں رہ رہے ہیں۔ اب گورے بھی کچھ لبرل ہوتے جا رہے ہیں اور ان پڑھے لکھے کالوں سے مراسم رکھنے میں شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔

ہارلیم میں کچھ علاقے بہتر حالت میں بھی تھے۔ امریکی علاقوں کی طرح تو خیر نہیں لیکن کچھ سہولتیں اور قدرے صفائی یہاں تھی۔ یہاں ریسٹورنٹ، سٹور، شراب خانے اور جوا خانے بھی تھے۔ یہاں لوگوں کی مالی حالت نسبتاً اچھی لگتی تھی۔ ان لوگوں نے ہارلیم میں رہتے ہوئے بھی نیویارک میں گھر خرید رکھے تھے۔

ہارلیم دیکھ کر حیرانگی بھی ہوئی اور ان لوگوں کی کسمپرسی پر افسوس بھی ہوا۔ اتنا گندا علاقہ اور اتنے گندے لوگ تو شاید ہمارے پسماندہ سے پسماندہ علاقوں میں بھی نہیں ہوتے۔

یہ امریکہ کا اک نیا اور بھیانک چہرہ تھا۔

خیر

کالے امریکی حکومت سے شاکی اور متنفر ہیں اور امریکی حکومت ان سے جوان کی حالت بہتر بنانا چاہتی ہے لیکن سست، کاہل اور بیکار لوگ اس سے تعاون نہیں کرتے۔ بنا ہاتھ ہلائے سب کچھ پانا چاہتے ہیں۔

واللہ اعلم کون سچا کون جھوٹا۔ ہم نے تو امریکہ کا یہ علاقہ دیکھا تو مایوسی ہوئی لیکن تجربہ اچھا ہی تھا کہ امریکنوں کی دوغلی پالیسیوں کا عملی تجربہ کر لیا۔

ہم واپس نیویارک آنے کے لیے بس میں سوار ہوئے تو ایک موٹا تازہ کالا جس کے گندے لباس سے بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے، آ گیا اور رقیہ بھابی کے قریب آ کر بولا۔

"دو ڈالر۔"

وہ حیران ہوئی۔ کچھ کہنے کو تھی ہی کہ راشد نے کہا۔ "دے دیں بھابی۔"

رقیہ نے دو ڈالر اسے دے دیے۔ پھر اس نے ہم سب سے دو دو ڈالر وصول کیے اور بس سے اتر گیا۔

اس کے جانے کے بعد راشد ہنس کر بولا۔ "گھبرائیں نہیں۔ یہ ان کا ٹیکس ہے۔ جب اور جس سے جی چاہے وصول کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات انکار کرنے والوں کو مار پیٹ بھی لیتے ہیں۔ ان کے اپنے اصول اور اپنے ہی قانون ہیں۔"

"ہائے ہائے" رقیہ بولی۔ "یہ آپا کو کیا شوق چرایا تھا یہاں آنے کا۔ بدبو سے دماغ خراب ہو گیا۔"

"کیوں بھابی۔" گڈی بولی۔ "مجھے تو یہ نئی دنیا دیکھنے کا تجربہ اچھا لگا۔"

"واقعی" نسیمی نے کہا۔ "لیکن ایسے خستہ حال لوگوں کو سب وے میں بھی تو دیکھ چکے ہیں۔"

"وہ پھر بھی ان لوگوں سے اچھی حالت میں ہیں۔ یہاں تو گند ہی گند، غربت ہی غربت، پسماندگی ہی پسماندگی......"

"نفرت اور بیزاری بھی۔"

"اس کا لاوا تو ان لوگوں کے اندر پک رہا ہے۔"

"حکومت اس طرف پوری توجہ دے تو ان لوگوں کی حالت کچھ نہ کچھ تو بہتر ہو سکتی ہے۔ یہ کہنا تو محض اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کا ایک جھوٹا بہانہ لگتا ہے کہ یہ لوگ اپنی حالت ٹھیک کرنا ہی نہیں چاہتے۔"

"جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں یہ لوگ۔"

"دیکھا نہیں۔ ایک دوسرے سے بھی بیگانہ ہیں۔ چہروں پر خوشی کی رمق نہیں۔ جوان لڑکے لڑکیاں بھی پتھرائے ہوئے چہرے لیے دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے ہیں۔"

"بیکاری کی بیماری میں مبتلا ہیں۔"

"حکومت سنجیدہ ہو تو انہیں آہستہ آہستہ ٹھیک کر سکتی ہے۔ لگتا ہے ان کالوں سے

حکومت خود بھی نفرت کرتی ہے۔"

"گورے ان کالوں کو امریکہ کے حق میں اک بددعا سمجھتے ہیں۔"

"بیچارے بے انسان۔"

ہم سب تبصرہ کر رہی تھیں کہ راشد ہنس کر بولا۔"اب جانے دیں۔ جس حالت میں یہ لوگ ہیں، ٹھیک ہی ہوں گے۔ نہ ہوں تو اپنے حق کے لیے لڑیں کیوں نہ۔"

"یہ لاوا پک رہا ہے۔ فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ لاوا کسی دن ایٹم بم ہزاروں کی تعداد میں بنانے والے امریکنوں پر ایٹم بم کی طرح ہی پھٹے گا۔"

راشد پھر ہنسا اور بولا" آثار سے لگتا ہے ہنوز دلی دور است۔ چھوڑیں انہیں۔ اپنی باتیں کریں۔ امریکہ کے اچھے رخ دیکھیں۔ آپ سیر و تفریح کے لیے آئی ہیں۔ دل جلانے نہیں۔" راشد نے گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

بس سے اتر کر ہم لوگ اس کے ساتھ پیدل اُدھر چل دیئے جدھر اس نے گاڑی کھڑی کی ہوئی تھی۔

ہارلیم دیکھ کر طبیعت دو چار دن مکدر رہی۔

پھر

وہی معمولات شروع ہو گئے۔

چند دن بعد پھر نیویارک کا چکر لگا۔ گڈی کو آسیہ کے ہاں جانا تھا۔ ہم بھی ساتھ چل پڑے۔ اس دفعہ نیویارک میں تھوڑا ہی گھومے پھرے۔ ہاں اس بار ہم نے نیویارک کی نیو پبلک لائبریری دیکھی۔

نیویارک میں پبلک لائبریریاں اور میوزیم غالباً ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ آرٹ گیلریوں کا بھی شمار نہیں۔

لیکن

پھر وہی بات

کہ ان سب چیزوں کو دیکھنے کے لیے مہینوں کے حساب سے وقت چاہیے۔ چند

دنوں میں ہر چیز دیکھ لینے کی خواہش بیکار ہے۔ ہاں جتنا وقت ملے اور جتنی جگہیں دیکھ لیں، وہی غنیمت ہیں۔

پبلک لائبریری بھی ہم نے اتفاقاً ہی دیکھی۔ آسیہ کے گھر سے نکلے تو ٹیکسی پکڑی۔ جس نے ہمیں نیویارک کے پتہ نہیں کس سٹاپ پر ڈراپ کر دیا۔ وہاں سے ہم پیدل ہی چل پڑیں اور چلتے چلتے کرسٹل پارک کے عقب میں جا پہنچیں۔ وہیں پبلک لائبریری کی بہت وسیع اور شاندار عمارت نظر آئی۔ جدید طرز کی اتنی بڑی عمارت دیکھ کر حیرت بھی ہوئی، خوشی بھی...... اتنی بڑی لائبریری تو ہم نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔

یہ لائبریری جدید آرٹ اور فنِ تعمیر کا عجوبہ ہے۔ اونچے اونچے سفید ستون جنہیں ایک اونچے چبوترے پر کھڑا کر کے اور اونچا بنایا گیا ہے۔ لائبریری تک جانے کے لیے بہت ہی کشادہ اور چوڑی سیڑھیاں سفید پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ اس عمارت کے سامنے دو بڑے بڑے شیر بنائے گئے ہیں۔ اللہ جانے ان کا مقصد کیا ہے۔ کیا صرف خوبصورتی اور آرائش یا کچھ اور بہر حال یہ شیر عمارت کے سامنے بہت ہی خوبصورت لگتے ہیں۔

یہاں بھی دیگر جگہوں کی طرح سیاحوں، طالب علموں اور دانشوروں کا بہت ہجوم تھا۔ کچھ لوگ اندر جا رہے تھے۔ کچھ باہر آ رہے تھے۔ لڑکے، لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد کشادہ سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ کوئی دوستی کے تقاضے نباہ رہے تھے۔ کچھ محبتوں کے ابواب کھولے تھے۔ امریکہ میں ایسی باتوں پر کوئی پابندی نہیں۔ پیار و محبت کا کھلے بندوں اظہار معاشرتی تقاضوں کا حصہ ہے۔ اس لیے کئی لڑکے، لڑکیاں، جوان مرد، عورتیں ان خوبصورت، صاف و شفاف سیڑھیوں پر بیٹھے ایسی حرکات کر رہے تھے جن کے ہم لوگ عادی نہیں لیکن وہاں کوئی ان لوگوں کو دیکھ کر رک نہیں جاتا تھا۔ نہ ہی کسی قسم کے تجسس یا تعجب کا اظہار کرتا تھا۔ ہر طرح کی شخصی آزادی کے اس ملک میں کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کا حق ہی نہیں ہوتا۔

پبلک لائبریری دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ یہ بہت بڑی

عمارت جس کے کئی حصے ہیں، میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں کروڑوں کے حساب سے کتابیں ہیں اور کروڑوں ہی نادر مسودے ہیں۔ یہاں آ کر کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بڑے بڑے ہال ہیں۔ خوبصورت چمکتا صاف شفاف فرنیچر ہے۔ لوگ گھنٹوں کے حساب سے یہاں بیٹھ کر اپنی دلچسپی کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں وقفوں سے کتابوں کی نمائش بھی ہوتی رہتی ہے۔ لائبریری میں کتابیں پڑھنے یا نمائش دیکھنے کے لیے داخلہ مفت ہے۔

لائبریری کے بیرونی حصے میں ایک جگہ لکھا ہوا ہے کہ آپ علم پھیلانا چاہیں تو دو ڈالر یہاں ڈال دیں۔ ڈالر ڈالنے کے لیے جگہ بنی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جو علم پھیلانے کی جدوجہد میں دو ڈالر ڈال کر حصہ نہ لینا چاہے۔ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ لوگ یہاں آتے ہیں اور یقیناً دو ڈالر ہر کوئی ضرور ڈالتا ہوگا۔ یہ فنڈ لائبریری ہی کے کام آتا ہے۔

یہ لائبریری صحیح علوم کا خزانہ ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں انگریزی میں چھپنے والے معیاری علمی و تحقیقی جرائد لائبریری میں دستیاب ہیں۔ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، جرمنی اور چینی زبان میں چھپنے والے جرائد بھی یہاں پہنچتے ہیں۔ نئے رسائل پہنچنے پر پرانے جرائد اٹھا لیے جاتے ہیں لیکن انہیں تلف نہیں کیا جاتا بلکہ جلدوں میں محفوظ کر کے الماریوں میں رکھ دیا جاتا ہے اور اگر کسی وقت کسی کو ان جرائد سے کچھ معلومات لینے کی ضرورت پیش آئے تو وہ بڑی آسانی سے ترتیب وار رکھی ان جلدوں سے اپنی مطلوبہ جلد نکال کر اپنا کام کر سکتا ہے۔ جرائد کے علاوہ دنیا کے تقریباً ہر ملک سے یہاں اہم اخبارات بھی پہنچتے ہیں اور لوگ اپنے اپنے ملک کے اخبارات یہاں بیٹھ کر پڑھتے اور اپنے ملکی حالات کی معلومات حاصل کرتے ہیں۔

یہاں کتابیں الماریوں میں الفابٹک آرڈر میں رکھی ہوئی ہوتی ہیں یعنی A.B.C وغیرہ۔ اسی طرح الماری اور مطلوبہ کتابیں ڈھونڈنے میں بڑی آسانی ہوتی۔ ہر کتاب اس کے مضمون کے لحاظ سے رکھی جاتی ہے۔ یہاں نقشوں اور وہاں دستیاب کیٹلاگ

کی مدد سے کتابوں کی تلاش بہت سہل ہے۔

یہاں فوٹو کاپی مشین بھی رکھی ہوتی ہے۔ جہاں اگر کسی نے کسی کتاب کا کوئی حصہ مستقلاً اپنے پاس رکھنا ہو تو مشین سے فوٹو کاپی نکال لیتا ہے۔ اس کے لیے مشین میں کام کے مطابق سکہ ڈالنا ہوتا ہے یعنی کوارٹ (پچاس سینٹ) یا ڈائم (دس سینٹ) کا سکہ ڈالنا ہوتا ہے۔ مشین جتنے کا کام کرے گی، اتنے پیسے رکھے گی باقی واپس نکال دے گی۔ ان مشینوں سے عام طور پر طلبہ اور محقق زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹ بھی یہاں موجود ہوتی ہیں۔ سلائیڈز اور فلم سٹرپس بھی ہوتی ہیں جن میں کتب یا پرانا لٹریچر ریکارڈ کیا گیا ہوتا ہے۔ اگر آپ کتاب پڑھنے سے گریزاں ہیں تو ان کیسٹس، ویڈیو ٹیپس، سلائیڈز اور فلم سٹرپس سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بڑے بڑے ہال نما کمروں میں چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوتے ہیں جن میں بیٹھ کر آپ اپنی مطلوبہ کیسٹ یا فلم سٹرپس یا سلائیڈ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ہیڈ فون بھی ہوتے ہیں۔ آپ ہال میں بیٹھ کر اپنی مطلوبہ کیسٹ کا استعمال کر کے کسی دوسرے کو ڈسٹرب کیے بغیر استفادہ کر سکتے ہیں۔

غرضیکہ اس لائبریری میں آپ چاہیں تو علم کے خزانے سمیٹ سکتے ہیں۔ یہاں کتابوں کا اتنا اور نادر ذخیرہ ہے کہ ہر موضوع پر ہر قسم اور ہر ملک کی کتاب آپ کو مل جائے گی۔ بفرض محال آپ کو کسی وجہ سے مطلوبہ کتاب نہیں ملی تو آپ لائبریری کے انچارج سے بات کریں۔ وہ آپ کے لیے اس کتاب کا بندوبست کرے گا۔ چاہے جس ملک کی کتاب ہے، اس کے ساتھ رابطہ کرے، خواہ ملک کے اندر دوسری لائبریریوں سے رجوع کرے۔ کتاب آپ کو ضرور دلا دی جائے گی۔ بشرطیکہ اس کتاب کا وجود ہو اور یہ کسی نصاب یا کسی تحقیقی کام سے متعلق ہو۔ جدید علوم وفنون سے اس کا واسطہ ہو یا کوئی دستاویز یا پرانا مسودہ ہو۔

لائبریری میں ایک بہت بڑا شعبہ ریفرنس بکس کا بھی ہے جن میں انسائیکلو پیڈیاز کے علاوہ سینکڑوں ایسی کتب ہیں جو مختلف قسم کے علوم تحقیقات، جغرافیہ، معاشیات،

سیاست اور سائنس۔ غرضیکہ کوئی موضوع ایسا نہ ہوگا جس کے متعلق ایک سے بڑھ کر ایک رہنمائی کرنے والی کتاب نہ مل سکے۔

یہ لائبریری نہیں علم کا ایسا خزانہ ہے جس سے چھوٹا بڑا معمولی تعلیم یافتہ، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا، طلباء، محققین بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ طرہ امتیاز یہ ہے کہ یہ لائبریری پبلک لائبریری ہے اور پبلک اس سے مفت فائدہ اٹھاتی ہے۔ سوائے دو ڈالر علم پھیلانے کے سلسلے میں جمع ہوتے ہیں۔ اس میں مرضی ہے کوئی حصہ ڈالے یا نہ ڈالے۔ کسی کو یہ دو ڈالر دینے پر بھی مجبور نہیں کیا جاتا۔

ہم لوگ پوری لائبریری تو گھوم پھر کر نہ دیکھ سکے۔ ہمیں واپس نیوجرسی جانا تھا اور دو ایک گھنٹوں میں یہ علم کا خزانہ سرسری نظر سے بھی دیکھنا ممکن نہ تھا۔ بس کوئی کوئی شعبے ہی چلتے پھرتے دیکھ سکے۔ پھر بھی بے حد خوشی ہوئی کہ ہم علم و دانش، تحقیق و تخلیق، دستاویزات اور ہر قسم کی مطبوعات کے بحرِ زخار میں تھوڑی دیر کے لیے تو کود سکے۔

نیویارک میں دیکھنے کی اور بہت سی جگہیں تھیں لیکن اس کے لیے وقت درکار تھا۔

اور

اب

ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ نسیمی، رقیہ اور گڈی اب واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ اوائل دسمبر میں ہم لوگ یہاں آئے تھے۔

اور اب مارچ گزر رہا تھا۔ پاکستان سے گھر والوں کے واپسی کے تقاضے بھی ہو رہے تھے۔ میرا پروگرام کیلیفورنیا جانے کا کچھ کچھ بن ہی گیا تھا۔ اس لیے مجھے واپسی کی جلدی نہ تھی لیکن ان لوگوں کو ہفتے ڈیڑھ میں واپس جانا تھا۔

اسی طرح نیویارک کی "فور گولڈن گرلز" کی سیر کا خاتمہ ہی ہو گیا تھا۔ خیال تھا۔ اب نیویارک آنا ممکن نہ ہوگا۔

گھر واپس پہنچ کر ہم سب نے باری باری پاکستان اپنے اپنے گھروں میں فون کئے۔ دوسرے تیسرے ہفتے فون کر لیا کرتے تھے۔ ہماری خیر خبر پاکستان میں پتہ چل جاتی

اور ان کی ہمیں۔ ہم سبھوں کے گھر والے اب واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس لیے واپسی کے پروگرام بننے لگے۔ ہاں مجھے واپسی کی کوئی ایسی جلدی نہ تھی۔ میاں مرحوم تو تھے نہیں۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں تھیں۔ میرے گھر میں فری ہی تھی۔ خیر بال بچوں میں مصروف تھیں سب۔ میں مہینہ اور بھی گھوم پھر لیتی تو کوئی بات نہ تھی۔

دو دن بعد بشریٰ کا فون آیا۔

"میں آپ کو کل لینے آؤں گی۔" اس نے علیک سلیک کے بعد کہا۔

"میں شمیم کے ساتھ کسی دن چکر لگا لوں گی۔ تم کہاں چھوٹی سی سارہ کو لے اتنا لمبا چکر لگاؤ گی۔"

"نانی۔"

"ہوں۔"

"آپ کو بھول گیا ہے۔"

"کیا؟"

"کہ کسی شریف انسان نے آپ کو کھانے کی دعوت دے رکھی ہے اور پرسوں دعوت پہ جانا ہے۔"

ایک لمحہ کو تو مجھے یاد نہ آیا لیکن یاد آتے ہی بولی۔ "اوہ ہاں۔ میں تو واقعی بھول گئی تھی۔ فاران کی بیا آنٹی کے ہاں دعوت ہے نا۔"

"جی ہاں۔ شکر ہے آپ کو یاد تو آیا۔"

"بالکل یاد آ گیا۔ میں ان سے ملنے ضرور جاؤں گی۔"

"صرف ان سے ہی نہیں۔ ان کے ہاں کم از کم بیس پچیس مدعو ہیں اور سب آپ سے ملنے کے خواہشمند۔ آپ نے ضرور ضرور جانا ہے۔"

"ضرور ضرور جاؤں گی۔ فکر نہ کرو۔"

بیا فاران کی آنٹی تھی۔ ان کے میاں خالد پلاسٹک سرجن تھے۔ وہ خود ہاسپٹلز میں ایڈمنسٹریٹر تھیں۔ بہت سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ بشریٰ کے ہاں ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔

انہیں بھی شمیم کی طرح ستائیس اٹھائیس سال امریکہ میں رہتے ہو چکے تھے لیکن اپنے ملک کو بھولے نہیں تھے۔ نہ ہی اپنے طور طریق نئے سانچوں میں ڈھالے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تو اتنے سادہ دل تھے کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اتنے بڑے سرجن ہیں اور پلاسٹک سرجری میں اپنی ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر بہت نام کمایا ہے۔ جب ملے تو اتنے خلوص اور تپاک سے جیسے برسوں سے مجھے جانتے ہوں۔ بیا نے طالبعلمی کے زمانے میں میری کچھ کتابیں پڑھی تھیں، اس لیے میرے نام سے شناسائی تھی۔

ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک ڈاکٹر، دوسرا شاید انجینئر۔ اپنے دونوں بیٹوں کو وہ لوگ ہر سال چھٹیوں میں پاکستان بھیجتے تھے۔ یہ نوجوان اپنے رشتہ داروں سے مل کر پاکستان سے ملتے تھے یعنی کبھی کسی شہر چلے جاتے، کبھی کسی گاؤں میں وقت گزارتے۔ یوں وہ رشتہ داروں کے علاوہ پاکستانی شہریوں اور دیہاتیوں سے مل کر اپنے ملک کی تہذیب سے آشنا ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ امریکہ میں پیدا ہونے، پلنے بڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وہ پاکستانی تہذیب وتمدن، یہاں کے طرز زندگی، لوگوں کے حالات، دولت کی غیر مساوی تقسیم، معاشی ناانصافیاں، تلخیاں، ترشیاں، راحتیں، چاہتیں ہر چیز سے بہرہ مند تھے۔ بیا نے یہ باتیں بتائیں تو مجھے ان کا طرز فکر بہت اچھا لگا تھا۔

امریکہ میں بھی بیس پچیس پاکستانی اور ہندوستانی مسلم خاندانوں سے وہ ایک طرح سے جڑی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ اپنا پاکستانی کلچر فراموش نہیں کیے ہوئے تھے۔ ہر جمعہ کو اکٹھے نماز کے لیے جاتے۔ (امریکہ میں مسلم عورتیں بھی مساجد میں نماز پڑھتی ہیں) پاکستانی، ہندوستانی لباس پہنتے۔ پھر کسی نہ کسی کے گھر کھانا ہوتا۔ جہاں یہ لوگ اپنی خوشیاں اپنے دکھ آپس میں بانٹتے۔ ایک دوسرے کی حتی الوسع مدد کرتے۔ اس طرح میل جول بھی رہتا اور ایک دوسرے کی تکالیف سے بھی آگاہی رہتی۔ ان فیملیز نے ایک طرح کی کلب بنا رکھی تھی۔

میں نے بیا سے دعوت میں شرکت کا پکا وعدہ کر لیا۔ میں وطن سے ہزاروں میل

دور بیٹھے ان لوگوں کے تاثرات سے آگاہ ہونا چاہتی تھی۔

چنانچہ

بشرہ کو میں نے کہہ دیا کہ وہ مجھے آ کر لے جائے۔

''میں دعوت میں ضرور شرکت کروں گی بشرہ۔''

''نانی۔ یہ دعوت خاص آنٹی بیا آپ ہی کی کر رہی ہیں۔ وہ جو باری باری دعوت وہ لوگ کرتے ہیں، وہ الگ ہوتی ہے۔''

''اچھا۔''

''جی۔''

''بڑی نوازش ہے ان کی۔''

''آپ کو خاص طور پر کہہ کر تو گئی تھیں۔ پھر یاد دہانی کا ان کا فون بھی آیا ہے۔''

''بس ٹھیک۔ آ جانا مجھے لینے۔''

''کل تیار رہیے گا۔ میں بارہ ساڑھے بارہ تک آ جاؤں گی۔''

''ٹھیک۔''

اس کے بعد وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پاکستان سے بھی نینو یعنی اپنی امی اور میری بیٹی کا فون آیا تھا کہ اب پاکستان میں سب نانی سے اداس ہو گئے ہیں۔ انہیں کہیں اب واپس آ جائیں۔

''نسیمی، گڈی اور رقیہ تو واپسی کا پروگرام بنا رہی ہیں۔''

''لیکن آپ نے ابھی نہیں جانا۔ میں نے امی سے کہہ دیا ہے کہ آپ ریشو کے پاس سان ڈیگو جا رہی ہیں۔''

میں ہنس پڑی۔ ''اب میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ ریشو سے بھی مل ہی آؤں۔ امیر اور ریشم کے کتنے ہی فون آ چکے ہیں۔''

''بس مل آئیں انہیں بھی۔ آپ نے کونسا روز روز امریکہ آنا ہے۔''

کچھ

دیر ہم دونوں باتیں کرتی رہیں۔

پھر

فون بند کر دیا۔

لیکن

چند منٹ بعد ہی پھر فون کی گھنٹی بجی۔ میں چونکہ قریب ہی بیٹھی تھی، اس لیے فون اٹھالیا۔

دوسری طرف حمیرا تھی۔

سلام ودعا کے بعد اس نے پوچھا۔ ''امی کہاں ہیں؟''

''وہ شاید اوپر ہے۔ ہولڈ کرو، بلاتی ہوں۔''

''رضیہ خالہ۔ امی سے بھی بات کرلوں گی، پہلے آپ سنائیں، کیا حال چال ہے۔ نیو یارک کی سیر کی آپ سب نے۔''

''بس جتنی ہو سکی۔ اب تو تمہاری امی، رقیہ اور گڈی واپسی کی تیاری کر رہی ہیں۔''

''امی کو میں ابھی جانے نہیں دوں گی۔ میرے پاس تو رہی نہیں اور آپ لوگ بھی ابھی نہیں جائیں۔ کل تو ہماری طرف آئیں نا۔''

''کیوں؟''

''خالہ کیوں کی کیا بات ہے۔ میرے پاس بھی کچھ دن رہیں نا۔''

''لو حد ہو گئی۔ دو تین دفعہ تمہارے گھر آچکے ہیں اور تین تین چار چار دن وہاں رہے بھی ہیں۔''

''اب لمبا پروگرام بنائیں۔''

میں ہنس پڑی تو وہ بولی۔ ''جی۔ رضیہ خالہ کل تو آپ لوگوں نے ضرور آنا ہے۔ نوفل نے پرسوں آپ سب کو واشنگٹن لے جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ آپ جانتی ہیں، وہ کتنے مصروف ہوتے ہیں۔ بڑی مشکل سے پرسوں وہ وقت نکال کر آپ سب کو واشنگٹن

دکھانے لے جا رہے ہیں۔''

''پرسوں؟''

''ہاں۔''

''لیکن!''

''لیکن کیا رضیہ خالہ؟''

''پرسوں تو میں نہیں جا سکوں گی۔''

''کیوں؟''

میں نے اسے فاران کی خالہ کے ہاں دعوت کا بتایا تو وہ جھٹ سے بولی۔ ''دعوت پھر کھالیں۔ پہلے واشنگٹن دیکھ لیں۔ نوفل نے سارا انتظام کرلیا ہے اور بمشکل کام سے دو دن کی چھٹی کی ہے۔ ہم رات وہیں رہیں گے۔ دوسرے دن گھوم پھر کر شام واپس آجائیں گے۔ وقت ہوا تو آپ کو پنسلوینیا بھی دکھا لائیں گے۔''

واشنگٹن اور پنسلوینیا دیکھنے کا اس سے اچھا موقع کہاں مل سکتا تھا۔

لیکن

بیا کے ہاں دعوت؟

یہ دعوت وہ مجھے اپنی دیگر ملنے والی فیملیز کے ساتھ ملانے کے لیے کر رہی تھی۔

اس نے سب کو کہہ بھی دیا ہوا تھا۔

اور

اب؟

میں شش و پنج میں پڑ گئی۔

نسیمی اوپر سے آگئی تھی اور حمیرا سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔

میں سمجھ نہ پا رہی تھی کہ کیا کروں۔

واشنگٹن بھی دیکھنا چاہتی تھی۔

اور

دعوت پہ جانا بھی ضروری تھا۔ کچھ اخلاقی تقاضے بھی تو ہوتے ہیں نا؟

لیکن

واشنگٹن دیکھنے کا بھی یہ نادر موقع تھا' ورنہ کس نے وہاں جانا اور کس نے ہمیں لے جانا تھا۔

فون بند کر کے نسیمی خوشی سے بولی۔ ''چلیں سب تیار ہو جائیں۔ واشنگٹن دیکھنے جانا ہے۔ نوفل نے دعوت دی ہے۔''

''لیکن نسیمی میں تو نہ جا سکوں گی۔''

''کیوں؟''

میں نے وجہ بتائی تو وہ بولی۔ ''دعوت کا کیا ہے، معذرت کر دیں۔ پھر کسی دن ہو آئیں وہاں۔''

''بری بات ہے۔ بیا نے تو بہت سے لوگوں کو میری خاطر بلایا ہوا ہے۔ اب تو وہ ان لوگوں کو دعوت بھی دے چکی ہیں۔''

''ہائے ہائے یہ کیا بات ہوئی۔''

''مجبوری ہے......''

''تو پھر آپ نہیں جائیں گی۔''

''جی تو چاہتا ہے جانے کو' لیکن بیا کے ہاں جانا بھی ضروری ہے۔ خالی میری دعوت ہوتی تو میں معذرت کر دیتی۔ اس نے بیس پچیس کپلز کو بلایا ہوا ہے۔''

نسیمی بھی بات سمجھ گئی لیکن پھر اسی انداز میں کہا۔ ''ہائے ہائے۔ اس دعوت نے مصیبت کھڑی کر دی۔''

''بہرحال میں کل بشرہ کے ہاں جا رہی ہوں۔ پرسوں شام دعوت پر جانا ہے۔ اگر نوفل پھر کسی دن کا پروگرام بنا لے تو......''

''توبہ...... یہ وقت بھی اس نے پتہ نہیں کیسے نکالا ہے۔ حمیرا بتا رہی تھی۔ ان دنوں وہ بہت ہی مصروف ہے۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے یہ وقت نکالا ہے۔''

''پھر تم لوگ چلی جانا۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

نسیمی نے ایک بار پھر زور دیا کہ میں دعوت سے معذرت کر لوں۔

لیکن

ایسا کرنا مشکل کیا ناممکن تھا۔ میں بیا کے خلوص اور لوگوں کے ملنے کے اشتیاق کو رد نہ کر سکتی تھی۔



بیا کا گھر سٹیٹن آئی لینڈ میں تھا۔ یہ بھی نیوجرسی سے تقریباً اڑھائی گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ ڈنر کا ٹائم ساڑھے آٹھ بجے تھا۔ ہم گھر سے چھ بجے سے بھی پہلے نکلے۔

پتہ نہیں ہم کس کس سڑک سے گزرے۔ کتنے ہی برج گزرے۔ جارج واشنگٹن کا مضبوط پل خوبصورت بھی ہے اور سارے کا سارا لوہے کا بنا ہے۔ یہاں سے کئی بار گزر چکے تھے۔ نیویارک جاتے تھے تو اس برج پر سے بھی گزرتے تھے۔ اس لیے یہ برج مانوس سا لگتا تھا۔ باقی راستہ پتہ نہیں کدھر کدھر سے ہو کر جا رہا تھا۔ سٹیٹن کا علاقہ مری کے پہاڑی علاقے سے بہت ملتا جلتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مری کے پہاڑی علاقے کی اٹھان زمین سے اٹھتی ہے۔

لیکن

یہ جزیرہ جو پلوں سے دوسرے علاقوں سے جڑا تھا، سمندر سے اوپر اٹھتا ہے۔ بڑا خوبصورت، انتہائی سرسبز پہاڑی سلسلہ جس کے قدموں میں سمندر کی شوریدہ سر لہریں ٹکراتی تھیں۔

گاڑی پہاڑی راستے سے چکر کاٹتی اوپر ہی اوپر جا رہی تھی۔ اوپر والی سڑک پر آئیں تو نیچے والی سڑک نظر آتی ہے۔ پہاڑی کے گرد گھماؤ در گھماؤ ہم اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ روشنیوں کے غبار پھیلے تھے۔ دور نیچے سمندر کا پانی قدرے سیاہی مائل نظر آ رہا تھا لیکن جہاں جہاں روشنیوں کا عکس پڑتا تھا، سمندر کی خوبصورتی دلفریب لگتی تھی۔

پہاڑی سڑکوں پر گھومتے اوپر جاتے کئی خوبصورت مکان بھی دکھائی دیتے تھے۔

عام گھروں کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔

بیا کا گھر سڑک کے عین کنارے پر تھا۔ دوسری طرف پہاڑی ڈھلان تھی جو دور نیچے تک سمندر میں گم ہو جاتی تھی۔ ابھی سڑک اور بھی اونچائی پر جا رہی تھی یعنی چوٹی تک ہم نہیں گئے تھے۔ اوپر تک خوبصورت مکان تھے۔ ہم نے جہاں جانا تھا، وہاں پہنچ گئے تھے۔ گھر کے سامنے سائیڈوں پر کئی گاڑیاں کھڑی تھیں جس کا مطلب تھا کہ کافی مہمان پہنچ چکے تھے۔ فاران نے گھڑی دیکھی تو پونے نو ہو چکے تھے۔ پہاڑی راستے کی وجہ سے پندرہ منٹ لیٹ ہو گئے تھے۔ ورنہ گھر سے تو ٹھیک وقت پر نکلے تھے۔

خیر

ہماری اطلاع ملتے ہی ڈاکٹر صاحب اور بیا باہر آ گئے۔ بڑے خلوص اور جوشیلے تپاک سے ہمیں خوش آمدید کہا...... ڈاکٹر صاحب اس وقت کریم کلر شلوار قمیض اور براؤن سویٹر پہنے ہوئے تھے۔ بیا نے بھی شلوار قمیض ہی پہن رکھی تھی۔ حالانکہ اپنی ڈیوٹی پر انہیں امریکن لباس ہی پہننا ہوتا ہے۔

اس سادہ سے لباس میں دونوں میاں بیوی بہت اچھے لگ رہے تھے۔ شخصیتوں کا اپنا نکھار بھی تو ہوتا ہے۔

"لگتا ہے کافی مہمان آ چکے۔" فاران نے کہا۔

"تم آ گئے تو محبوب آ گئے۔" بیا نے ہنس کر کہا۔

"آنٹی آپ کا گھر ہی اتنی دور اور بھول بھلیوں میں ہے کہ تھوڑا ٹائم ضائع ہو ہی گیا۔" بشرہ نے کہا۔

"تم تو اندر چلو جلدی سے۔ چھوٹی سی بچی ہے۔ سارہ کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"آپ بھی چلیے۔ فاران گاڑی بند کر کے آ جاتا ہے۔" بیا نے مجھ سے کہا۔

ہم تینوں اندر چلے آئے۔

بیا کا گھر بھی شمو کے گھر کی طرح بہت بڑا اور خوبصورت تھا۔ ڈیکوریشن بھی

بہت نفیس تھی۔

بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مرد حضرات ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ سیاست ڈسکس ہو رہی تھی۔

خواتین لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ سترہ اٹھارہ عورتیں وہاں موجود تھیں۔ لگتا تھا دو ایک مہمان ہی آنے والے رہ گئے ہیں۔

علیک سلیک کے بعد میں اور بشرہ بھی اس طویل و عریض لیونگ روم کے ایک نرم وگداز صوفے پر بیٹھ گئے۔ اس لاؤنج کی ایک پوری دیوار شیشے کی کھڑکیوں کی تھی جن سے پہاڑی سلسلے اور ان کے قدموں میں مچلتا سمندر نظر آتا تھا۔ بہت ہی خوبصورت اور دلفریب منظر تھا۔ سمندر میں یا اس کے کنارے کوئی روشنی کا مینار تھا جو پانی کی لہریں ہلکورے لیتی ہوئی چاندی کی طرح چمکتی تھیں۔ فاران اور ڈاکٹر صاحب ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

بیا اندر آئی۔ اپنے مہمانوں سے ہمارا تعارف کروایا۔ خواتین میرا نام سن کر مسکراتی ہوئی اپنی سیٹوں سے اٹھیں اور میرے ارد گرد کھڑی ہو گئیں۔ میں بھی اٹھ کر ان سے ملی، ان کی محبت اور ملنساری کا شکریہ ادا کیا۔

"بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔"

"بڑا اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔"

"شادی سے پہلے آپ کو بہت پڑھا۔"

"میں تو اب بھی ان کے ناول پاکستان سے منگواتی رہتی ہوں۔"

"آج کل کیا لکھ رہی ہیں؟"

"کل کتنی کتابیں لکھی ہیں؟"

"کب لکھنا شروع کیا تھا؟"

"کس وقت لکھتی ہیں؟"

"لکھنے کی فرصت مل جاتی ہے آپ کو؟"

ہر عورت اپنا اپنا سوال داغ رہی تھی۔ میں مسکرا مسکرا کر ان کے سوالوں کا جواب

دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب سب خواتین اور میں بیٹھ چکی تھیں لیکن سب میرے ارد گرد ہی بیٹھی تھیں۔ کسی نے کرسی لی۔ کوئی صوفے پر جگہ بنا کر بیٹھی۔ کچھ نے کشن لے لیے اور کچھ قالین پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔

پھر

باتوں کے سلسلے شروع ہوئے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ یہ عورتیں مالی لحاظ سے ٹھیک ٹھاک تھیں۔ یہاں ہر طرح کی سہولتیں بھی حاصل تھیں۔ بہت سی تو بیس بیس پچیس پچیس سال سے یہاں رہ رہی تھیں۔ کوئی ڈاکٹر کی بیوی تھی۔ کوئی خود ڈاکٹر تھی۔ کسی کا میاں انجینئر تھا اور کسی کا کاروبار کرتا تھا۔ ایک وکیل کی بیوی تھی۔ خود بھی جاب کرتی تھیں۔ ایک خود وکیل خاتون تھیں۔ سبھی پڑھی لکھی اور تقریباً سبھی جاب بھی کرتی تھیں۔ بچے بھی تھے۔ کسی کے جوان، کسی کے چھوٹے۔ نوکریاں کرنے کے ساتھ گھر داری اور بچوں کو بھی سنبھالتی تھیں۔ یہاں پیسہ بھی تھا۔ سہولتیں بھی۔

لیکن

سب پاکستان سے اداس تھیں۔ اپنی دھرتی کا اور ہی پیار تھا جو سب کے دلوں میں دھڑکن کی طرح بسا ہوا تھا۔ دو تین ہندوستانی مسلم عورتیں بھی تھیں۔ وہ بھی اپنے وطن کی مٹی سے پیار کرتی تھیں اور اداس بھی ہو جاتی تھیں۔

یہ سب مسلم خواتین تھیں اور یہاں اپنی شناخت قائم رکھنے کے لیے انہوں نے یہ ادارہ سا بنا رکھا تھا۔ ہر جمعہ کو اکٹھی نماز پڑھنے جاتیں۔ اپنے ملکی لباس پہنتیں اور رات کسی نہ کسی کے ہاں اکٹھی ہوتیں۔

"آپ لوگ تو پاکستان میں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمان ہیں لیکن یہاں رنگا رنگ قومیں آباد ہیں۔ اس لیے ہمیں انہیں مسلمان بن کر دکھانا پڑتا ہے۔" ایک معزز خاتون بولی۔

"بچوں کے معاملے میں ہم لوگ جن مشکلوں سے گزرتے ہیں، آپ لوگ سوچ

بھی نہیں سکتیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جس کے طور طریق ہمارے معاشرے سے بالکل مختلف ہیں۔ بچوں کو پالنا اور اپنے معاشرے کے مطابق ڈھالنا بہت ہی مشکل ہے کیونکہ گھر میں تو ہم انہیں وہی کچھ سکھاتے ہیں جو ہمارے معاشرے کا تقاضا ہے لیکن یہ بچے جب بالکل مختلف معاشرے میں نکلتے ہیں تو اکثر کنفیوژ ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنی راہ پر چلانا مشکل امر ہے۔"

"یہی تو سب سے بڑا مسئلہ ہے ورنہ اور تو سب کچھ یہاں ہے۔ برا نہ منائیں تو کہہ سکتی ہوں کہ پاکستان سے اچھا ہے۔"

"لیکن خامیوں کے باوجود پاکستان ہماری سرزمین ہے جو ہمیں بہت پیاری ہے۔"

کافی دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

پھر

بیا نے آ کر سلسلہ کلام توڑتے ہوئے کہا۔ "کھانے کے لیے تشریف لائیے۔ مرد حضرات اٹھ چکے۔"

ہم سب بھی اٹھے۔

اور بیا کے بڑے سے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے جس میں لمبی چوڑی کھانے کی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری تھی۔

"بیا یہاں نوکر تو ہوتے نہیں۔ یہ سارا انتظام آپ نے اکیلے ہی کیا؟"

وہ ہنس کر بولی۔ "بالکل آپا۔ ہم لوگ عادی ہو چکے ہیں ان کاموں کے۔"

"جاب کے ساتھ گھر کے کام، کھانا پکانا، بچوں کی دیکھ بھال۔ واقعی بڑی ہمت کا کام ہے۔"

"ہم سب یہ کام خود ہی کرتی ہیں۔"

"پھر اتنا تکلف نہیں کرنا چاہیے...... دیکھیں نا بیا نے شاید ہی کوئی چیز چھوڑی ہو۔ کیا کچھ نہیں بنایا۔"

"مہمان نوازی کا اپنا ہی لطف ہے۔ مجھے تو مہمانوں کے لیے دعوتوں کا اہتمام

کرنا بہت اچھا لگتا ہے...... اور پھر...... یہ ہم سب کے مل بیٹھنے کا بہانہ بھی ہے۔ ہم اپنی پاکستانیت کا یوں اظہار تو کرتے ہیں......"

پُر لطف کھانے کے بعد سب واپس اپنی اپنی جگہوں پر آن بیٹھے۔

"قہوہ یا چائے۔" بیا نے سب سے پوچھا۔

اکثریت نے قہوے کی فرمائش کی۔ بیا قہوہ بنانے چلی گئی۔ اس کی مدد کے لیے دو نوجوان بیاہتا عورتیں بھی کچن میں گئیں۔ بشرہ کی بچی سو چکی تھی۔ سو وہ بھی آنٹی کی مدد کرنے کچن میں چلی گئی۔ قہوہ تو بیا نے بنا ہی لینا تھا۔ ان تینوں نے ڈائننگ ٹیبل پر سے برتن اٹھائے۔ بچا ہوا کھانا الگ کیا اور کچھ برتن دھونے کے لیے سنک میں ڈال دیے۔ بیا کے احتجاج کے باوجود ان خواتین نے کافی برتن دھو ڈالے۔

ہم سب پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اب موضوع امریکہ میں رہ کر بچوں کی شادیاں تھا جو کہ ایک بہت بڑا اور گھمبیر مسئلہ تھا۔ اتفاق ہی سے سوائے بیا کے سب ہی کی ایک ایک دو دو تین تین لڑکیاں تھیں...... مائیں پریشان تھیں کیونکہ لڑکیاں اب شادی کی عمروں سے آگے نکل چکی تھیں۔ شادی کی عمر کا تعین تو خیر نہیں ہوتا۔ کسی عمر میں بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن

جب لڑکیاں پچیس سال کی عمر پار کر لیں تو شادی واقعی مسئلہ بن جاتی ہے۔ جس وکیل خاتون کا میں نے ذکر کیا، ان کی تین بیٹیاں تھیں جو بالترتیب تیس، بتیس اور چونتیس برس کی ہو چکی تھیں۔ چونکہ ان لڑکیوں کو انہوں نے مشرقی انداز سے پالا پوسا تھا، اپنے تہذیبی آداب سے روشناس کروایا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ دوستانہ ماحول یا ان کے ساتھ مادر پدر آزادی دے کر کھلے بندوں گھومنے پھرنے نہیں دیا تھا۔ ڈیٹس پر یہ لڑکیاں نہیں جاتی تھیں۔

اس لیے

ان کی شادیاں اب تک نہ ہو سکی تھیں۔ جو پاکستانی یا ہندوستانی مسلم لڑکے حصول تعلیم کے لیے امریکہ میں آئے ہوئے انہیں ملتے۔ وہ ان سے اس لیے شادیاں کرنے پر

تیار نہ ہوتے کہ یہ لڑکیاں چونکہ امریکی معاشرے میں پلی بڑھی ہیں۔ اس لیے ٹھیک نہیں ہیں۔ پاکستان میں لڑکے تلاش کرنے کی کوشش کی تو یہاں کی پلی بڑھی لڑکیوں کو قبول کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ اس وجہ سے کہ ان کے خیال میں امریکن لڑکیاں پاکستانی معاشرے میں فٹ نہیں ہو سکتیں۔ دو ایک لڑکے تیار بھی ہوئے تو اس لالچ میں کہ سٹیزن لڑکیوں سے شادی کرنے سے انہیں گرین کارڈ اور امریکن سٹیزن شپ مل جائے گی۔ شادی میں انہیں دلچسپی نہ تھی۔ ہاں گرین کارڈ کے حصول کا یہ آسان ذریعہ تھا۔ سو یوں والدین بیٹیوں کی شادی کر کے ان کے لیے مصائب خرید نہیں سکتے تھے۔

وکیل صاحبہ کے پاس بے شمار دولت تھی۔ شوہر کاروبار کرتے تھے جو عروج پر تھا لیکن ان کی بے انتہا دولت بیٹیوں کے مسئلے کا حل نہ نکال سکی تھی۔ گرین کارڈ کے حصول کے خواہشمند لڑکوں سے بھی بیٹیوں کی شادیاں اس لیے نہ کر سکیں کہ یہ لڑکے اکثر لالچی ہوتے ہیں۔ بیویوں کو امریکہ میں سیٹل ہونے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ جب پاؤں مضبوط ہو جاتے ہیں تو اکثر انہیں چھوڑ کر بھاگتے ہیں یا طلاق دے دیتے ہیں۔ ایک وجہ تو ان کا لالچ ہوتی ہے۔ دوسرا الگ الگ معاشرے میں پلے بڑھے لڑکے لڑکیاں ایڈجسٹ بھی نہیں کر سکتے۔

اسی طرح دوسری بیٹیوں والیوں کا بھی المیہ تھا۔ وہاں جن کے بیٹے تھے، جوان اور لائق بھی، بقول ان کی ماؤں کے انہیں گوریاں پھنسا لیتی تھیں۔ کوئی اپنے دیس کی لڑکی سے شادی کر بھی لیتا تو اس کے ذہن میں یہ اندیشہ موجود ہوتا کہ یہ لڑکی ٹھیک نہیں۔ آزاد امریکی معاشرے میں جانے وہ کس کس سے تعلقات بنا چکی ہے۔ ان کے معیار کے مطابق وہ شریف ہرگز نہیں۔

یہ امریکہ میں بسنے والے تقریباً اکثریت کا المیہ ہے۔ شادیاں پاکستان سے کر کے لے جائیں تو بہت کم نبھتی ہیں۔ سوائے اس کے کہ جانے پہچانے عزیزوں، رشتہ داروں میں کی جائیں۔

یہ

ان لوگوں کا ایسا مسئلہ تھا جسے حل کرنا آسان نہ تھا۔ امریکہ میں بچوں، بڑوں کی

شخصی آزادی بھی اس المیے کو زیادہ بھیانک بنا رہی ہے۔ لڑکے، لڑکیاں اپنی مرضی اور آزادی پر کوئی پابندی قبول نہیں کرتے۔

اس لیے

اب امریکہ میں مسلمان لڑکیاں لڑکے یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی شادیاں کر رہے ہیں۔ ہندو لڑکیوں کے بھی ایسے ہی مسائل ہیں۔ اس لیے وہ بھی اپنی پسند سے جس مذہب کے لڑکے سے چاہیں شادی کر رہی ہیں۔ یہ رجحان بہت زیادہ تو نہیں لیکن حالات دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ بڑھتا ہی جائے گا کیونکہ شادی انسان کی فطری خواہش ہے۔

بہر حال

ان خواتین کے مسائل سن کر دکھ ہوا۔ جن دو ایک عورتوں نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں امریکہ ہی میں پلے بڑھے پاکستانی لڑکوں سے کر کے فریضہ ادا کیا تھا۔ ان کی بیٹیاں بھی خوش نہ تھیں۔ ایک کی تو طلاق بھی ہو چکی تھی۔

سو

یہ امریکہ میں رہنے والے پاکستانی لوگوں کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ بے شمار دولت اور بے انتہا زندگی کی سہولتیں حاصل ہونے کے باوجود اکثریت اس المیے سے دوچار تھی۔ دکھ تو اس بات کا تھا کہ مسلم لڑکیاں عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں، سکھوں سے شادیاں کرنے سے گریزاں نہ تھیں۔ اسی طرح ہندوستانی لڑکیاں جن میں مسلم، سکھ اور ہندو لڑکیاں شامل تھیں، ایسے ہی کر رہی تھیں۔

ایسی شادیاں اکثر طلاقوں پر منتج ہوتی تھیں جسے کوئی بری بات نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جو لڑکیاں مادر پدر آزاد ہو جاتیں، والدین سے الگ رہنا شروع کر دیتیں۔ لڑکوں سے دوستی کر لیتیں۔ ڈیٹس پر جاتیں، لڑکی لڑکا چاہتے تو شادی کر لیتے ورنہ دوستی اور ڈیٹس کے سلسلے بھی چلتے رہتے۔

ایسے لوگوں کی بچیاں جو والدین کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ جن کی تربیت خالص مشرقی طرز پر ہوئی تھی۔ جنہیں اسلام کا شعور و ادراک تھا۔ آزاد اور جنسی بے راہ روی کے

معاشرے میں اپنا دامن بے داغ رکھا ہوا تھا۔ ان لڑکیوں اور ان کے والدین کے لیے ان کی شادیاں ایک بہت گھمبیر مسئلہ تھیں۔

کئی لوگ تو امریکہ آ کر ہمیشہ کے لیے سیٹل ہونے پر اپنے آپ کو کوستے بھی دیکھے

لیکن

اب نہ جائے رفتن

نہ

پائے ماندن والا حساب تھا۔

رات بارہ بجے تک یہ خواتین اپنے اپنے مسائل سناتی رہیں۔ سب کچھ ہونے کے باوجود یہ عورتیں تہی دامن لگ رہی تھیں۔ سوائے دو عورتوں کے۔ جن کے بیٹے پاکستان سے اپنے عزیزوں کی بیٹیوں سے شادیاں کر کے آئے تھے۔ لڑکیاں ان لڑکوں کے رنگ میں رنگ گئی تھیں۔ دو دو بچے بھی تھے۔ یہ جوڑے خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ اسی طرح کے اور لوگ بھی ہوں گے۔

لیکن

امریکہ میں بسنے والوں کے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ ضرور ہے۔

بیا کے گھر یہ محفل بہت اچھی رہی۔ امریکن سٹیزن لوگوں کے مسائل زیر بحث آئے۔ یہ لوگ پاکستان سے جتنی محبت اب بھی کرتے تھے، اس کا بھی احساس ہوا۔ ان کے ہر جمعہ آپس میں ملنے جلنے کی ریت بھی اچھی لگی۔

یہ نسل تو اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وطن کی خاک بھی انہیں عزیز ہے۔ ہم وطنوں سے مل کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو پاکستانی بھی کہتے ہیں اور منواتے بھی ہیں۔

لیکن

امریکہ کا معاشرہ جس طرح کا ہے اور جس طرح وہاں ہر طرح کی آزادی ہے، چھوٹے بچوں سے لے کر بڑوں تک سب کے حقوق متعین ہیں۔

اس معاشرے میں امریکہ میں جا کر بسنے والی اگلی نسلوں پر وہی رنگ چڑھے گا جو وہاں کا تقاضا ہے۔ اپنے آپ کو معاشرے سے الگ رکھنا ان لوگوں کے لیے مشکل کیا ناممکن ہو جائے گا۔

اپنی دھرتی چھوڑ کر دوسری بالکل غیر اور معاشرتی لحاظ سے مختلف دھرتی پر جا بسنے والوں کے لیے ایسے مسائل پیدا ہوتے ہی ہیں۔ جن کا کوئی حل کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ نئے معاشرے کی لپیٹ میں آنے والے رد و بدل کا شکار ہوتے ہی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات ہے نہ انہونی۔

پھر

یہ نئی نسلیں اسی معاشرے میں رچ بس جاتی ہیں۔ اسی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ وہی طور طریق اپنا لیتی ہیں۔ اسی طرح کی بود و باش شروع کر دیتی ہیں۔

یہ فطری بات ہے۔

ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔

اور

ہوتا رہے گا۔

ہجرتیں اگر کسی ملک میں فاتح کی حیثیت سے کی جائیں تو ملک اور معاشرے کو بہت حد تک فاتح لوگوں کا کلچر لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

لیکن

ہجرت اگر کسی معاشرے یا ملک میں روزی کمانے، مالی حالات سنوارنے، تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسی معاشرے میں مدغم ہو جانے کے لیے ہو تو جو نسل اس کی مرتکب ہو گی، وہ تو کسی حد تک اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کرے گی لیکن ان کی اگلی نسلوں پر وہاں کا معاشرہ پورے زور و شور سے رنگ جما لے گا۔ اپنے اندر ڈھال لے گا اور پھر جب نسل در نسل یہی سلسلہ چلے گا تو آنے والی نسلیں اپنے آپ کو وہیں کا باشندہ کہیں گی اور سمجھیں گی۔ وہ وہی کچھ کریں گی جو وہاں ہوتا ہے۔ انہیں اپنے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی

دھرتی غیر لگے گی اور وہ کبھی بھی اسے اپنا نہیں کہہ پائیں گے۔ نہ ان کے اصول اپنا سکیں گے۔ نہ اخلاقی قدروں کا اطلاق اپنے اوپر سمجھیں گے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں ہوگا۔

ان کے لیے تو وہی دیس اپنا دیس ہوگا جہاں ان کے باپ دادا نے جنم لیا، پرورش پائی۔

امریکہ میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ ان کے ناموں کے ساتھ ابھی تو ان کے ممالک کا نام کسی حد تک چلتا ہے یعنی کوئی اٹالین ہے، کوئی ہالینڈر۔ کوئی جرمن، کوئی سپینش...... انگریز تو وہاں کے ہو ہی چکے ہیں۔ چینی، جاپانی بھی ہیں اور ہندوستانی، پاکستانی بھی۔ لیکن ان میں امریکن سٹیزن شپ اختیار کر لینے والوں کے حقوق ومفادات بھی امریکہ سے وابستہ ہیں اور طور واطوار بھی اس سرزمین میں پہلے سے بسنے والوں کے اپنا لیے ہیں۔ اب یہ سب امریکی ہیں۔

اور

اگر

اب ان لوگوں کی سوچ، طرز رہائش، اصول، مسائل، انٹر میر یجز اور دوسری کئی باتیں ایک جیسی ہیں اور امریکی ہیں تو اچنبھے کی کیا بات؟

بیا کے ہاں سے ہو کر آئے تو کئی دن مجھے وہاں ملنے والی عورتوں کے مسائل نے پریشان رکھا۔

لیکن

بہت سوچ بچار کے بعد یہی سمجھ پائی جو میں نے اوپر لکھا ہے۔ ان لوگوں نے دیس چھوڑا ہے تو اب بھیس بھی چھوڑنے کا تقاضا ہے۔ واپس یہ لوگ جا کر اپنے وطن میں کسی طور فٹ نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی ان کے بچے اب اس مٹی کو اپنا سکتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ قدرتی اور فطری امر ہے...... ہونے دیں۔

میں دو دن بشرہ کے ہاں رہ کر پھر شمیم کے گھر آ گئی۔ اب نسیمی، رقیہ اور گڈی واپسی کے لیے رخت سفر باندھ رہی تھیں۔ ہم چاروں نے آخری چکر حمیدہ، آمنہ اور بشرہ کے ہاں لگائے۔ کچھ سٹوروں میں شاپنگ کی۔ کچھ اور لوگوں سے ملے۔

پھر

میں تو ریشم کے پاس جانے کے لیے وہیں رہ گئی...... اور میری تینوں ساتھی پاکستان کے لیے روانہ ہو گئیں۔

ہم چاروں نے جتنا وقت اکٹھے گزارا تھا، بہت ہی پُر لطف تھا۔ جتنا ہم اس عرصہ میں ہنسے اور خوش باش رہے، شاید پہلے ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ سب کو اتنا عرصہ اکٹھا رہنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ شمیم جو اکیلی رہنے کی عادی تھی، وہ بھی ان خوبصورت دنوں سے بہت لطف اندوز ہوئی۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی ابھی واپس جائے۔

لیکن

سب کے میاں اور بال بچے اب اس سے زیادہ ڈھیل دینے کو تیار نہ تھے۔ واپسی کے تقاضے ہو رہے تھے اور وہ حق بجانب بھی تھے۔

ہم نیو جرسی اور نیو یارک میں خوب گھومی پھری تھیں لیکن اتنے بڑے ملک نما شہروں کو پوری طرح دیکھنا اور وہاں کے معاشرے کو ہر زاویے سے پرکھنا تین چار ماہ میں ممکن ہی نہ تھا۔

جتنا کچھ دیکھا، ہمارے لیے حیران کن تھا اور معاشرے کا جتنا جائزہ لیا، وہ بھی اس طرح کا نہیں تھا جس طرح کا ہمیشہ سے سنتے چلے آئے تھے۔

امریکن معاشرہ بڑا مضبوط اور مربوط ہے۔ سسٹم نہایت عمدہ اور بغیر کسی جھول کے ہے۔ لوگ اصول وضوابط کے پابند ہیں۔ امریکنوں کی اکثریت اپنے ملک کی وفادار ہے۔ ملک سے محبت کرتے ہیں۔ حکومت کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے اصول کا اپنے آپ کو پابند سمجھتے ہیں۔ اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ جھوٹ نہیں بولتے۔ بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکومت نے جو حقوق انہیں دے رکھے ہیں، وہ ضرور حاصل کرتے ہیں۔ چوری چکاری بہت کم ہوتی ہے۔ بڑی بڑی چوریاں فراڈ، خود غرضی، مطلب پرستی، دوسرے ممالک پر اپنی سپرمیسی کا حق جتانا۔

انہیں چاہیں تو کسی بہانے روند ڈالیں۔ ایسے تمام جرائم اور برائیاں شاید عوام نے اپنے لیڈروں کی جھولی میں ڈال رکھی ہیں۔

عوام کی اکثریت بہت بھلی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ کسی کے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑاتے۔ پانچ دن ایمانداری سے کام کرتے ہیں۔ دو دن چھٹی کے عیش مناتے ہیں۔ پھر تازہ دم ہو کر نئے سرے سے پانچ دن کام میں جت جاتے ہیں۔

امریکہ میں شخصی آزادی ہر ایک کو حاصل ہے۔ اظہار خیال پر پابندی نہیں۔ اپنے لیڈروں کی کوئی برائی نہیں چھپاتے۔ ان سے ہر طرح کا جواب طلب کرنے کا انہیں حق ہے۔ ٹیکس دیتے ہیں اور جہاں یہ ٹیکس حکومت خرچ کرتی ہے۔ اس کا حساب لینے کا ہر ٹیکس دہندہ کو حق ہے۔

وہاں کام پوری ایمانداری سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ادھر سڑک بنی ادھر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ ادھر پل بنا اور افتتاح سے پہلے ہی ٹوٹ گیا۔ کوئی سرکاری بلڈنگ بنی تو پورے کی پوری کچھ ہی مدت میں ڈھے گئی۔ ایسی کسی بے ایمانی کا ان لوگوں میں تصور بھی نہیں پایا جاتا۔

یہی حال کھانے پینے کی چیزوں کا ہے۔ کسی چیز کا تول کم نہیں ہوتا۔ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا ڈبے، ٹین یا پیکٹ پر درج ہو۔ چیزیں ناخالص ہونے کا سوال ہی نہیں، اپنے ہاں کی طرح نہیں کہ ہر چیز میں ملاوٹ۔ نمک میں پتھر پسا ہوا، مرچوں میں اینٹوں کی سرخی، چائے میں کالے چنوں کے چھلکے۔ وہ لوگ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔

میں تو اکثر سوچتی تھی کہ جو جو ہدایات اسلام نے مسلمانوں کو دی ہیں، ان پر پوری طرح یہ لوگ عمل پیرا ہوتے ہیں۔

وہاں عوام کی اکثریت میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں لیکن یہ بات بھی نہیں کہ وہاں سارے کے سارے لوگ ایسے ہیں۔ وہاں بھی بدکردار لوگ ہیں۔ اخلاق سوز حرکات کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ چوری، ڈکیتی اور بڑے بڑے فراڈ بھی ہوتے ہیں۔ مار دھاڑ اور قتل قتلام بھی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں ہر پندرہ منٹ بعد ایک کرائم ضرور ہوتا ہے۔

لیکن

اس کے باوجود امریکی عوام کا مزاج امن پسندی ہے۔ اکثریت خوبیوں سے مالا مال ہے۔ ٹیکس ایمانداری سے دیتی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کا سوچا بھی نہیں جاتا۔ ناپ تول میں رتی بھر بے ایمانی نہیں ہوتی۔ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں اور اس کی بہبود کے لیے ہر کام کرنے کو تیار ہیں۔ سب سے بڑی بات کہ یہ لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دوسروں کی عیب جوئی ان کی عادت نہیں۔ نہ ہی دخل اندازی کرنا ان کا شیوہ ہے۔

امریکنوں میں مذہبی وابستگی بھی ہے۔ چرچ جاتے ہیں۔ وہاں اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ چرچ کی بہبود کے لیے دیتے ہیں۔ مذہب کے معاملے میں وہ لوگ انتہا پسند نہیں ہیں۔

امریکی قانون کے مطابق ہر شخص کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ وہ جو چاہے، جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔ مرد، عورت میں آزادانہ میل جول یا لڑکی لڑکے میں جنسی آزادی ہمارے لیے تو بری بات ہے لیکن اس معاشرے میں اس بات پر کوئی قدغن نہیں۔ کوئی جوڑا شادی کر کے گھر بسائے۔ بچے پیدا کرے یا شادی کے بغیر شوہر و زن کی طرح رہیں۔ بچے بھی پیدا کر لیں، تعلقات نبھائیں یا توڑ دیں۔ حکومت کی طرف سے اس بات پر کوئی پابندی نہیں۔ کنواری مائیں وہاں عام ہیں۔ ایسے بچے بے شمار ہیں جو اپنے باپ کے نام و ذات سے نا آشنا ہیں۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں بچے ماؤں یا والدین سے الگ ہو جاتے ہیں۔ خود کماتے ہیں اور زندگی کا بار اٹھاتے ہیں۔ لڑکیاں، لڑکے جنسی بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس بات کا اطلاق سب امریکیوں پر نہیں ہوتا۔ کچھ فیصد لوگ ٹھیک ٹھاک فیملی لائف گزار رہے ہیں۔ گو ان کی بھی بچوں پر کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ بچے شخصی آزادی کا حق حاصل کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہاں خاندان ٹوٹ بکھر گئے ہیں۔ ہر کوئی آزاد ہے۔ گھریلو زندگی بری طرح متاثر ہے۔ جہاں ہر کوئی اپنی من مانی کرنے کا حق رکھتا ہو، اپنی زندگی آپ جی رہا ہو، کسی کی بالادستی تسلیم کرنے سے بے نیاز ہو۔ وہاں گھریلو سسٹم تو خراب ہوگا ہی۔ اب مغرب کا المیہ یہی ہے کہ حد سے تجاوز کرنے والی آزادی دے کر انہوں نے گھریلو

سسٹم کو بکھیر دیا ہے اور اس ستون سے نا آشنا ہو گئے ہیں جو فیملی لائف کا خاصا ہوتا ہے۔

ہم لوگ اپنی زندگی اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ دکھاوا، بناوٹ، مصنوعی پن عام ہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر بچوں کے لیے جمع کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم شادیوں پر خرچ کرنے کے لیے ہماری اکثریت ساری عمر ٹینشن میں گزار دیتی ہے۔ ہم لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ چھوڑ جائیں۔ جمع تفریق ہی میں زندگی گزر جاتی ہے۔ یہ قربانی ہم بچوں کے لیے دیتے ہیں کیونکہ ہم لوگ اپنی زندگی بچوں کے لیے جیتے ہیں۔ گو کسی حد تک یہ زیادتی بھی ہے لیکن اس سے ہمارے گھروں میں سکون ہے۔ وہ بے اطمینانی نہیں جو مغرب کا مقدر بن چکی ہے۔ ہماری بے سکونیاں بھی ہیں تو وہ اور نوعیت کی ہیں۔

بہر حال

امریکی اپنے انداز سے جی رہے ہیں۔ خوبیوں، خامیوں کے ساتھ۔ انفرادی طور پر وہ اچھے شہری اور اچھے لوگ ہیں۔

امریکی وقت کے قدر دان ہیں۔ اسے ضائع نہیں کرتے لیکن کچھ تہوار بھی یہ بڑی فراخدلی سے وقت نکال کر منا لیتے ہیں۔ کرسمس ان کا مذہبی تہوار ہے جسے دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ مہینوں پہلے سے تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔

پھر

نیو ایئر ایو بھی بڑے دھوم دھڑکے سے مناتے ہیں۔

ویلنٹائن ڈے بھی اہتمام سے مناتے ہیں۔ یہ ان کے ایک سینٹ ویلنٹائن کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ ویلنٹائن پیار و محبت کا مجسمہ تھا۔ لوگوں میں محبت بانٹنا، خلوص کا درس دینا اس کا شیوہ تھا۔

اس دن لوگ وہاں اپنے پیاروں کو سرخ گلاب کا تحفہ دیتے ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں سرخ گلاب محبت کی نشانی کے طور پر ایک دوسرے کو بڑے والہانہ اور جذباتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ لڑکے لڑکیوں کی محبت کی تجدید کا دن ہوتا ہے۔

آج کل ان لوگوں کی دیکھا دیکھی یہ رسم ہمارے ہاں بھی چل نکلی ہے۔ اس دن پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی لڑکے، لڑکیاں اپنی مشرقی تہذیب کی دہلیزیں تیزی سے پھلانگ کر مغرب کے بہاؤ میں بہہ رہے ہیں۔ ویلنٹائن ڈے منانے کا جنون چند سالوں سے یہاں بھی بڑھ رہا ہے۔ لڑکیوں، لڑکوں کا بے محابا ملنا اور گلاب محبت کے طور پر پیش کرنا ہماری روایت نہیں۔ یہ مغرب کی تقلید ہے جس کا ٹکراؤ ہماری تہذیب سے ہوتا ہے۔ یہ دن 14 فروری کو منایا جاتا ہے۔

ایسٹر بھی امریکی جوش و خروش سے مناتے ہیں۔

تھینکس گیونگ ڈے Thanks Giving Day بھی ان کے ہاں منایا جاتا ہے۔ یہ امریکہ کا قومی تہوار ہے۔ اس کا تعلق امریکہ کے ان یورپین آباد کاروں سے ہے جنہوں نے پہلے پہل امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اور جس کی مخالفت امریکہ کے اصل باشندوں یعنی ریڈ انڈین نے قدم قدم پر کی تھی۔ انہیں یورپی لوگوں کا اپنی سرزمین پر آباد ہونا پسند نہ تھا۔ اس لیے ان میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم کچھ مقامی لوگ ان نئے آباد کاروں سے دوستی کا رشتہ بھی جوڑ چکے تھے اور ایک دوسرے کے کام بھی آتے تھے۔

ایک دفعہ یوں ہوا کہ یورپین آباد کاروں کی فصلیں بالکل پیدا نہیں ہوئیں جس سے انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے مقامی دوستوں سے رجوع کیا اور اپنی مشکلات بتائیں۔

ریڈ انڈینز نے اپنے ان دوستوں کو زمین اور موسم کے متعلق اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر مفید مشورے دیے۔ چنانچہ اگلے سال آباد کاروں کی فصلیں بہت ہی اچھی ہوئیں۔ آباد کار خوشی سے پھولے نہ سمائے۔

اس موقع پر انہوں نے اپنے مشورہ دینے والے دوستوں کو شکریہ ادا کرنے کے لیے دعوت پر بلایا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ اپنے قبیلے کو بھی ساتھ لائیں۔ آباد کار مقامی لوگوں سے دوستی بڑھانا چاہتے تھے۔ یہ بات ان کے مفاد میں تھی۔ چنانچہ وہ لوگ آئے اور اپنے ساتھ ایک بہت بڑا پرندہ "ٹرکی" بھی لے کر آئے جس کا مزیدار گوشت پکایا گیا۔ یہ محفل

ایک جشن کی صورت اختیار کر گئی۔ آبادکاروں نے ''پمکن پائی'' (حلوہ کدو کی مٹھائی) بھی بنائی۔ آبادکاروں اور قومی باشندوں میں اس دن سے گرم جوشی کی مفاہمت پیدا ہو گئی۔ آبادکاروں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ دوسروں کے علم، تجربے اور تحقیق سے فائدہ اٹھایا جانا بہت ہی اچھی بات ہے۔ چنانچہ امریکی یہ تہوار ہر سال مناتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو چکی ہے کہ اجنبیوں کا علم، تجربہ اور تعاون بھی بہت سی صورتوں میں مفید ہوتا ہے۔ یہ دن وہ ہر سال پورے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ اپنے گھروں میں اکثر غیر ملکیوں کو مدعو کرتے ہیں۔ اکثر ٹرکی کا گوشت پکاتے ہیں اور حلوہ کدو توڑتے اور اس سے ''پمکن پائی'' (ایک قسم کا کیک یا مٹھائی) بناتے ہیں۔ ایسی محفلوں میں وہ غیر ملکی لوگوں کے تجربات، مشاہدات، علم اور عمل سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا پلان ذہنوں میں ضرور بناتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی خوشیاں سمیٹنے کے لیے برتھ ڈے مناتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑے ویڈنگ اینورسری منانے اور ایک دوسرے کو تحفے دینا پسند کرتے ہیں۔ امریکی بہت قیمتی، نادر و نایاب تحفے دینا فضولیات میں شمار کرتے ہیں۔ البتہ دس بیس ڈالر تک کی چیز تحفے میں دے کر یا لے کر خوش ہوتے ہیں۔

ان سب چیزوں کے علاوہ اکثر لوگ سوشل ورک میں دلچسپی لیتے ہیں۔ خاص کر ریٹائرڈ یا بڑی عمر کے لوگ اپنا فالتو وقت ضرور کسی سوشل کام کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ مشتاق لوگ اپنے نام ایسے اداروں میں لکھوا دیتے ہیں جو انہیں جب وقت پڑے، کوئی نہ کوئی کام کرنے کی آفر دے دیتے ہیں۔ بعض مذہبی قسم کے لوگ گرجا گھروں کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فلاحی اور اصلاحی کام کر کے یہ لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ ہم لوگ آمنہ کے ساتھ شاپنگ کرنے جا رہے تھے۔ دوپہر ہونے کو تھی۔ ہم ایک سڑک پر جا رہے تھے۔ سامنے چوراہا تھا۔ شاید وہاں کوئی سکول تھا کیونکہ یونیفارم میں ملبوس بچے وہاں سے گزر رہے تھے۔ کچھ سائیکلوں پر جا رہے تھے۔ کچھ پیدل

بھی تھے۔ گاڑیوں میں بھی بیٹھے تھے۔

چوراہے کے کونے پر ایک مدبر قسم کا امریکن کھڑا تھا جو اچھے لباس میں ملبوس تھا۔ اس کی مالی حیثیت اس کے لباس سے ظاہر تھی۔

ہم نے دیکھا۔

وہ چوراہے پر ایک سپاہی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ گاڑیوں کو روک کر بچوں کو سڑکیں پار کرا رہا تھا۔ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چوراہا پار کرا رہا تھا۔ کسی کی سائیکل کا ہینڈل تھامے اسے ایک سے دوسری سڑک پر لے جا رہا تھا۔

''اس آدمی کو دیکھ رہی ہیں آپ؟'' آمنہ نے ہم سب سے کہا۔

''ہاں۔''

''یہ ایک امیر آدمی ہے۔ وہ سامنے اس کی گرینڈ سی گاڑی کھڑی ہے۔''

''یہ یہاں......''

وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ معمر آدمی ریٹائر ہو چکا ہے۔ اب صبح و دوپہر یہ یہاں آتا ہے اور بچوں کو بحفاظت سڑکیں اور چوراہا پار کراتا ہے۔ برف پڑ رہی ہو۔ بارش ہو رہی ہو۔ یہ روزانہ اپنی ڈیوٹی دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے بچے محفوظ ہیں اور اس چوراہے پر کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ اسے کسی نے یہ فرض ادا کرنے پر مقرر نہیں کیا ہوا۔ اس نے یہ ذمہ داری خود اپنے اوپر ڈال رکھی ہے۔ اس عمر میں یہی کام آسانی سے کر سکتا ہے۔ سو کر رہا ہے۔''

ہم نے غور سے اس گورے کو دیکھا۔ وہ کم از کم پچھتر برس کا ہو گا لیکن وہ بڑی باقاعدگی سے اپنے اوپر عائد کردہ ذمہ داری پوری کر رہا تھا۔

ہم سب بے حد متاثر ہوئیں۔

''کیا لوگ ہیں یہ۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''یہاں اس عمر کے لوگ چھوٹے چھوٹے سوشل ورک کرتے رہتے ہیں۔''

آمنہ بولی۔ ''رضیہ خالہ یہ لوگ یہ سارے کام خوشی اور سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ دیکھ لیں اس بابے پر کوئی پابندی نہیں لیکن روزانہ یہ اپنی ڈیوٹی اسی طرح دیتا ہے۔''

"آفرین ہے۔" نسیمی نے کہا۔

"ہم لوگ ان خطوط پر کیوں نہیں سوچتے؟" گڈی بولی۔

"ہم صرف باتیں بنانے والے لوگ ہیں۔" رقیہ نے کہا۔

بچوں نے سڑکیں پار کر لی تھیں۔ اب گورے نے گاڑی گزرنے کا اشارہ کیا۔ ہم اسی کی باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

امریکی قوم میں ڈھیروں خوبیاں ہیں۔ کچھ خامیاں بھی ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے لیکن بھلائیوں اور برائیوں کا تناسب اتنا ہے کہ ایک پلڑا اوپر اور دوسرا خاصا نیچے ہوتا ہے۔ امریکہ میں تقریباً ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ انہیں وہاں کی شہریت بھی حاصل ہوتی ہے۔ قانوناً وہ ہر سہولت کے مستحق ہیں جو امریکی شہری کو ملتی ہے لیکن ایک بات ہے کہ امریکی ایسے سب لوگوں کو اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ ان کے ذہنوں میں یہ غیر ملکی ہیں جو ان کے ملک کے آبادکار بن گئے ہیں۔ اس لیے انہیں نمبر 2 قسم کا شہری سمجھتے ہیں۔ بے شک وہ ان لوگوں کو کچھ نہیں کہتے، ملتے جلتے ہیں۔ دوستی بھی کرتے ہیں۔ اکٹھا کھاتے پیتے بھی ہیں لیکن ان کی آنکھوں میں امریکن ہونے کا فخر ضرور ہوتا ہے۔ بعض اوقات اپنے رویوں سے اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ کالوں سے تو ان کا اور ان کی حکومت کا برتاؤ احساس برتری کا حامل ہوتا ہے۔ انہیں وہ کسی طور اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ ہارلیم کے کالے تو کسی گنتی میں نہیں آتے۔

-------O-------

اب میں نے کیلیفورنیا جانا تھا۔ کئی ایئر لائنز کے پیکجز دیکھے۔ ٹاور ایئر لائن کا پیکج اچھا تھا۔ نیوجرسی سے لاس اینجلس کا ٹکٹ پانچ سو ڈالر میں مل جاتا تھا ورنہ دوسری ایئر لائنز کے ٹکٹ ساڑھے چھ اور ساڑھے سات سو ڈالر تک کے تھے۔

ٹاور ایئر لائن یہودیوں کی ملکیت ہے۔ اس کا جہاز بوئنگ 707 لاس اینجلس صبح جاتا اور رات کو واپس آتا ہے۔ اس کی روز کی یہی دو پروازیں تھیں۔ اس کا ٹرمینل اپنا تھا اور کوینز کے علاقے میں تھا۔

میں نے دو ہفتے کا قیام ریشو کے پاس کرنے کا پلان بنایا۔ اسی حساب سے اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں بیگ میں رکھیں۔ ریشو کا ایک سوٹ کیس شمیم کے ہاں پڑا ہوا تھا جس میں امیر اور ریشم کے کچھ کپڑے تھے۔ وہ بھی ساتھ لے جانا تھا۔ ریشو کے لیے جو گفٹ میں پاکستان سے لائی تھی اور جو اس کی امی روبو نے بھجوائے تھے، وہ سب اسی بکس میں ڈال لیے۔ میں نے اپنا بیگ ہلکا پھلکا ہی رکھا۔ واپسی پر آسانی رہتی۔

سامان لے کر میں بشرہ کے ہاں آ گئی۔ اسی کے ساتھ صائمہ، نسیم کے ہاں جانا تھا کیونکہ وہ کوینز میں رہتی تھیں اور ٹاور ایئر لائن کا ٹرمینل کوینز ہی میں تھا۔ اس کے گھر سے بمشکل دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ فلائٹ چونکہ صبح آٹھ بجے کی تھی۔ ایئرپورٹ پر کم از کم آدھا گھنٹہ پہلے پہنچنا تھا، اس لیے کوینز سے سوار ہونا بہ سہولت تھا۔ بشرہ کے گھر سے تو یہ تین سے بھی زیادہ گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔

ویسے بھی صائمہ کئی بار کہہ چکی تھی کہ میں رات اس کے ہاں ٹھہروں۔ دو دفعہ اس کے ہاں جانا ہوا تھا۔ رات واپس آ گئے تھے۔

فاران اور بشرہ مجھے صائمہ کے ہاں شام لے گئے۔ رات کھانا سب نے اسی کے ہاں کھایا۔ خاصی دیر خوشگوار گپ شپ رہی۔ صائمہ کے دونوں پیارے پیارے بچے پڑھنے کے بہت شوقین ہیں۔ میں ان کے لیے Story Books لے گئی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ نسیم اور صائمہ بھی بڑے پیار و خلوص سے ہماری خاطر داری میں مصروف رہے۔

صبح میں نے سفر کے لیے جلدی اٹھنا تھا لیکن رات گپ شپ اتنی دلچسپ رہی کہ سوتے سوتے بارہ ساڑھے بارہ ہو گئے۔ فاران اور بشرہ بھی کافی لیٹ واپس گئے۔

صبح میں جلدی ہی اٹھ گئی اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

صائمہ نے ناشتہ بنایا۔

نسیم بھی تیار ہو گئے۔

ناشتے کے بعد نسیم مجھے ناورا ایئر لائن ٹرمینل لے جانے کے لیے تیار تھے۔ یہ نیو یارک ایئر پورٹ کا ہی ایک حصہ ہے۔ میلوں پر پھیلے ہوئے ایئر پورٹ کا یہ حصہ کوینز میں ہے۔

میں اکیلی کیلیفورنیا جا رہی تھی۔ ایک اجنبی دیس میں بالکل نئی جگہ پر اکیلے جانے سے دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ یہ فلائٹ جس پر میں جا رہی تھی، لاس اینجلس جانا تھی۔ وہاں سے بذریعہ کار سان ڈیگو جانا تھا۔ یہ ڈرائیو کوئی ساڑھے تین گھنٹے کی تھی۔ امریکہ کی سب سے خوبصورت، سب سے چوڑی اور لمبی ہائی وے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس ہائی وے پر سفر کرنا بذات خود ایک تفریح ہے۔

نیو یارک سے سان ڈیگو بھی فلائٹس جاتی آتی تھیں لیکن اس کے لیے سان فرانسسکو میں جہاز بدلنا پڑتا تھا۔ اس لیے میں نے یہی طے کیا تھا کہ سیدھی لاس اینجلس کی فلائٹ لوں۔ ریشو اور امیر نے بھی یہی کہا تھا۔ پروگرام یہ بنا تھا کہ امیر مجھے لاس اینجلس ریسیو کرے گا اور پھر بذریعہ کار سان ڈیگو جائیں گے۔ انہوں نے میرے اکیلے آنے کی گھبراہٹ محسوس کر کے مجھے بہت تسلیاں دی تھیں کہ میں کسی قسم کا فکر نہ کروں۔ امیر مجھے

لینے لاس اینجلس کے ایئر پورٹ پر موجود ہوگا۔ ریشو نے تو فون کیا کہ میں جہاز کی جیٹی سے نکل کر لاؤنج کے دروازے پر ہی کھڑی رہوں۔ ادھر اُدھر نہ ہو جاؤں۔ امیر مجھے وہیں سے پک کر لیں گے۔

خیر

جانا تو تھا ہی۔ خوف، خدشے اپنی جگہ۔ ریشو اور امیر کی باتوں سے کچھ تسلی ہو ہی گئی۔ ان کی ہدایتوں پر عمل کر کے میں بخیر لاس اینجلس اور پھر سان ڈیگو پہنچ سکتی تھی۔

صائمہ اور بچوں سے مل کر میں نسیم کے ساتھ ناورا ایئر لائن کے ایئر پورٹ پر جانے کے لیے چل دی۔ دس گیارہ منٹ ہی میں ہم وہاں پہنچ گئے۔

اندر داخل ہوئے۔ کاؤنٹر پر سامان رکھا۔ ٹکٹ دکھا کر بورڈنگ کارڈ لیا۔ سامان کی رسید بھی لی۔ اب میرے پاس صرف میرا ہینڈ بیگ تھا۔ سامان لاس اینجلس جا کر وصول کرنا تھا۔

کاؤنٹرز نیچے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا تھا۔ وہاں سے ایک لمبے کوریڈور سے ہوتے ہوئے جہاز تک پہنچنا تھا۔ نسیم لاؤنج تک میرے ساتھ آئے۔ پھر خدا حافظ کے تبادلے کے بعد میں کوریڈور کے ذریعے جہاز تک پہنچی۔ ایئر پورٹ کا عملہ جگہ جگہ موجود تھا۔ ہدایات کی تختیاں جگہ جگہ لگی تھیں۔ اب میں حوصلہ مند تھی۔ سوچ رہی تھی۔ ان ہدایات کی روشنی میں میں نیچے سے اوپر آ کر کوریڈور سے ہوتی اکیلی ہی جہاز تک پہنچ سکتی تھی۔ مسافر بھی آ رہے تھے اور عملہ ہر قسم کی مدد اور رہنمائی کے لیے بھی موجود تھا۔

بہرحال

میں جہاز میں آ بیٹھی۔ مجھے کھڑکی والی سیٹ ملی اور میرے ساتھ ایک موٹا تازہ کالا دوسری سیٹ پر آ بیٹھا۔

اس فلائٹ میں یہودیوں کی خاصی تعداد تھی۔ یہودی ایک چھوٹی گول سی ٹوپی سر کے پچھلے حصے پر ضرور پہنتے ہیں جو ان کے یہودی ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔

میں نے بیگ گود میں رکھا۔

اور آرام سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے کالے نے کوئی ناول کھول لیا اور گردوپیش سے بے خبر ہو کر اس کے مطالعے میں مشغول ہو گیا۔ یہ ہارلیم کا کالا نہیں تھا بلکہ پڑھا لکھا تہذیب یافتہ آدمی تھا۔

لوگ آ رہے تھے۔ جہاز کی خالی سیٹیں بھر رہی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگ، تھیلے اور بریف کیس وغیرہ لوگ اوپر والی کیبنٹس میں رکھ کر اپنی اپنی سیٹیں پکڑ رہے تھے۔

پورے آٹھ بجے جہاز نے ٹیک آف کرنا تھا۔ چند منٹ پہلے معمول کی طرح ایئر ہوسٹس نے سفر کے متعلق ہدایات دیں۔ لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اب جہاز ٹیک آف کے لیے تیار تھا۔

پورے آٹھ بجے جہاز رن وے پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پھر رفتار پکڑی اور چند لمحوں ہی میں اڑان لے کر اونچے سے اونچا ہونے لگا۔

میں نے حفاظت اور سلامتی کے لیے زیر لب دعائیں پڑھیں۔ دل میں وسوسے تو موجود تھے۔ اجنبی سرزمین پر اکیلے ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جا رہی تھی جس کے متعلق کچھ علم تھا نہ پتہ۔ صرف نام معلوم تھا یا تھوڑی بہت اس کی جغرافیائی پوزیشن اور خصوصیات جو کبھی کبھار پڑھنے کو ملتی تھیں۔

خیر اللہ کا نام لے کر دھیان بٹانے کو میں نے اکانومی کلاس کے اس حصے پر نظر ڈالی۔ عورتیں، مرد۔ کالے پیلے گورے بھی آرام سے اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ نیو یارک سے لاس اینجلس کی پرواز پورے چھ گھنٹے کی تھی۔ نیو یارک شمال مشرق میں تھا اور کیلیفورنیا امریکہ کے جنوب مغرب میں۔ وہاں پہنچنے پر وقت میں بھی کوئی چار گھنٹے کا فرق آ جاتا تھا۔

یعنی

ہم نے آٹھ بجے پرواز کی تھی۔ نیو یارک کے وقت کے مطابق ہم نے لاس اینجلس دو بجے پہنچنا تھا۔

لیکن

وہاں پہنچ کر وقت 4 گھنٹے پیچھے چلا جانا تھا یعنی جب ہم لاس اینجلس اترتے، اس وقت ٹائم دس بجے ہونا تھا۔ ہم مشرق سے مغرب جو جا رہے تھے۔

میں کھڑکی سے باہر وقفوں سے دیکھ لیتی لیکن جہاز بہت زیادہ اونچائی پر تھا۔ اس لیے کچھ نظر آتا۔ یوں لگتا ہم بادلوں سے بھی اوپر جا رہے ہیں۔ اتنی بلندی سے زمین کہاں نظر آتی تھی۔

میں نے کچھ دیر کے لیے سر سیٹ سے لگا کر آنکھیں موند لیں لیکن نیند کہاں آتا تھی۔ پھر سر اٹھا لیا۔ لوگوں پر نظر ڈالی۔ کچھ لوگ آپس میں باتوں میں مشغول تھے۔ کچھ رسائل کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ کچھ خاموش بیٹھے تھے اور کچھ سکرین پر چلتی فلم دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ ایئر فون کانوں پر لگائے بیٹھے تھے۔

دریں اثناء ایئر ہوسٹس اپنی ٹرالیاں گھسیٹتی مسافروں کو ڈرنکس اور کھانے پینے کی چیزیں پیش کرنے لگیں۔ قدرے ہلچل ہوئی جو کھانے لینے اور چیزیں کھانے کے بعد ختم ہو گئی۔

میں نے کافی کا گلاس لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

سچی بات۔

اپنے آپ کو مطمئن سمجھنے کی کوشش کے باوجود جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی، میرا دل ہول رہا تھا۔

اگر امیر وقت پر نہ پہنچ سکا تو......

سان ڈیگو تو تین سوا تین گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔

میں کونسا کسی جگہ سے واقف ہوں جو اس کے نہ آنے کے باوجود گھر پہنچ جاؤں گی۔

لیکن

میں اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے سوچتی۔

امیر آئے گا کیوں نہیں۔

دس دفعہ تو فون پر بات ہو چکی ہے۔

صائمہ کے گھر بھی اس کا فون آیا تھا۔ ریشو نے بھی بات کی تھی۔ یہی کہا تھا کہ جہاز سے اتر کر ٹیوب (جیٹی) سے گزرتے ہوئے جب لاؤنج میں داخل ہوؤں تو وہیں کھڑی رہوں۔ امیر ادھر ہی سے مجھے لے لے گا۔

ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ان کا فون نمبر میرے پاس ہے۔

میں خود ہی ڈرتی اور خود ہی اپنے آپ کو ڈھارس دیتی رہی......

کیلیفورنیا امریکہ کی تیسری بڑی سٹیٹ ہے۔ کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے یہ اکتیسویں ریاست تھی جو امریکن یونین میں شامل ہوئی تھی لیکن یہ تیزی سے ترقی کرتی ہوئی اکنامک' پولیٹیکل اور سماجی لحاظ سے دنیا بھر میں اول نمبر کی ریاستوں میں شمار ہونے لگی۔ اس کی آبادی پانچ ملین سے زیادہ اور اکانومی ٹریلین ڈالر سے بھی زیادہ ہوگئی۔ کیلیفورنیا نے تجارت، اعلیٰ تعلیم، سائنسی ترقی اور تحقیقات، ٹیکنالوجی اور انسانی اقدار کی ترقی میں دنیا بھر میں اپنا لوہا منوایا۔ اس کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑی۔ بے شمار مسائل سے دوچار ہوتے ہوئے آگے بڑھنے کا راستہ اپنائے رکھا۔

کیلیفورنیا کی آبادی تقریباً ساری دنیا کی اقوام کا مجموعہ ہے۔ یہاں کے اصلی باسی جو ساحلوں کے قریب تھے۔ اب امریکہ کے دوسرے ساحلوں کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔ یہاں ایک ملین سے زیادہ میکسیکن آباد ہیں۔ اس کے علاوہ ایرانی، آرمینین، ایشیائی ہندوستانی، پاکستانی، ویت نامی کے علاوہ اور بھی بے شمار قومیں آباد ہیں جو باہر سے آ کر یہیں کے ہو کر رہ گئے اور سٹیزن ہو کر امریکن کہلانے لگے۔

کیلیفورنیا ایک ہری بھری شاداب سٹیٹ ہے۔ میدانی علاقے بھی ہیں۔ پہاڑی بھی۔ یہاں کے سائنس دانوں نے سمندری کھارے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کرنے کے لیے بڑی بڑی مشینیں ایجاد کیں اور اس پانی سے زراعت کو فروغ دیا۔ یہاں بے شمار ریزروواٹرز اور ڈیم اور دیگر آبی ذخائر موجود ہیں۔

پانی سے انہوں نے بجلی بھی بنائی۔ ہائیڈرو الیکٹرک سے 1870ء سے بھی پہلے کیلیفورنیا کو بجلی کی سہولت میسر آ گئی تھی۔

یہاں تحقیق اور ترقی کا کام جاری ہے جس کے لیے بے شمار ادارے مصروف کار رہتے ہیں۔ یہاں تعلیم کی سہولت ہر ایک کو میسر ہے۔ بے انتہا یونیورسٹیاں، کالج اور سکول ہیں۔

تفریحی مقامات کی بھی اس ریاست میں بہتات ہے۔ یہاں ڈزنی ورلڈ جیسا عجوبہ اور یونیورسل سٹوڈیوز بھی ہیں جو لوگوں کی تفریح کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اس کے علاوہ آرٹ و فن، میوزیم، تھیٹر ہر جگہ بکثرت ہیں۔

کیلیفورنیا ایک امیر ریاست ہے اور یہاں ہر شعبے میں آگے بڑھنے، پیسہ کمانے اور ملک کی ترقی کے لیے کام کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔

طیارہ لاس اینجلس کے ہوائی اڈے پر اترنے کے لیے نیچی پرواز پر آیا تو میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہم ہوائی اڈے کے اوپر ہی تھے شاید کیونکہ دور و نزدیک میلوں تک ایئرپورٹ سے متعلق ہی چیزیں تھیں۔ جہاز جگہ جگہ کھڑے تھے۔ ان کے رنگوں اور ڈیزائنوں سے پتہ چلتا تھا کہ غیر ملکی جہازوں کی بہتات بھی یہاں موجود ہے' جو اپنی پروازیں لے کر آتے جاتے ہیں۔ کہیں ورکشاپ قسم کے ہٹس تھے۔ دور تک پورٹ پر لگنے والے جہازوں کے لیے جیٹی کے کبوترے ہول نظر آ رہے تھے۔ کئی جہاز پروازوں کے لیے تیار تھے۔ کئی اڑ رہے تھے۔ کئی اتر رہے تھے۔ جدھر نظر پڑتی ہوائی جہاز اور ان سے متعلق چیزیں اور ایئرپورٹ کی وردیوں میں ملبوس لوگ ہی نظر آئے۔

لاس اینجلس انٹرنیشنل ایئرپورٹ دنیا میں تیسرے بڑے ایئرپورٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسافروں کی بہتات اور ایئرپورٹ والوں کی کارکردگی اسے دنیا کے امیر پورٹس میں ممتاز و منفرد مقام دیتی ہے۔ 2000ء میں کوئی 67.3 ملین مسافروں نے اس ایئرپورٹ سے سفر کیا۔ کارگو کا سامان اور فریٹ وغیرہ 2.2 ملین ٹن اس انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے لایا' لے جایا گیا۔ اس کی کارکردگی نہایت عمدہ ہے اور یہی بات اس ایئرپورٹ کی پاپولیرٹی میں اضافے کا باعث ہے۔ یہاں سے دن میں سینکڑوں ڈومیسٹک اور انٹرنیشنل فلائٹس آتی جاتی ہیں۔

بہت پہلے یہ ایئر فیلڈ MINES FIELD کہلاتا تھا اور یہاں سول ایوی ایشن کے چھوٹے جہاز ہوتے تھے۔ 1928ء تک یہ سول ایوی ایشن کے لیے ہی مخصوص رہا پھر World War II میں یہ اڈا جنگی جہازوں کے استعمال میں آیا۔ اس کے بعد کمرشل سروس 1946ء میں شروع ہوئی۔ پھر موجودہ کمپلیکس 1961ء میں بنایا گیا۔ اس اڈے کے نو ٹرمینل ہیں جنھیں آپس میں U شیپ سڑک سے ملایا گیا ہے۔ یہ کمپلیکس جو کہ سنٹرل کمپلیکس کہلاتا ہے، بے حد وسیع و عریض ہے۔ اوپر کے لیول پر لاؤنجز ہیں۔ جیٹی سے جہاز سے اترنے والے مسافران لاؤنجز میں آتے ہیں۔ کئی جگہ ٹکٹ اور سامان بک کرانے کے کاؤنٹرز بھی اوپر ہی ہیں۔ سامان لینے کے لیے نیچے جانا پڑتا ہے جس کے لیے کئی لفٹیں موجود ہیں۔ ڈھلانی برآمدے ہیں اور سیڑھیوں کی سہولت بھی حاصل ہے۔ یہ بہت مصروف ایئرپورٹ ہے۔ اس لیے ہر طرف انسانوں کا ہجوم ہی دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پروازیں آتی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ ہجوم متحرک ہی دکھائی دیتا ہے۔ ہر فلور پر خوبصورت اور آرام دہ لاؤنجز ہیں۔ ریسٹورنٹس، گفٹ شاپس، نیوز سٹینڈز، منی چینجرز، ریسٹ رومز، پبلک ٹیلی فونز کی سہولتیں بھی موجود ہیں۔

ٹام بریڈلے ٹرمینل پر فرسٹ ایڈ سٹیشن ہے جسے سپیشل ٹیلی فونوں کے ذریعے دوسرے ٹرمینلز کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ ہوٹلوں، موٹلوں اور دیگر رہائشی جگہوں سے بھی فون کے ذریعے رابطے کی سہولت موجود ہے۔ مسافروں کی سہولت کے لیے گاڑیاں، بسیں اور لیموزینز کرائے پر مہیا کرنے کے لیے مختلف کمپنیوں کے ٹھیکے ہیں۔ بغیر کسی تردد کے آپ ان میں سے جس چیز میں جانا چاہیں مل سکتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی شٹل ٹرینیں بھی ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل تک چلتی ہیں۔ یہ فری ہوتی ہیں۔ یہ سب ٹرمینلز کے درمیان چلتی ہیں اور پارکنگ لائن تک بھی جاتی ہیں۔

ایک بے حد خوبصورت اور دلکش ریسٹورنٹ تاریخی اہمیت کی حامل Theme Building Complex میں 77 فٹ کی اونچائی پر بنا ہوا ہے جو لاس اینجلس ایئرپورٹ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ تھیم بلڈنگ کے عین درمیان میں بنا ہوا ہے۔

اس ایئرپورٹ کا کنٹرول ٹاور 277 فٹ کی بلندی پر واقع ہے جہاں سے چار رن ویز پر ایئر ٹریفک کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔

اس ایئرپورٹ پر 21144 پارکنگ کی جگہیں موجود ہیں۔ سنٹرل ٹرمینل میں اس کے علاوہ 10000 پارکنگ کی جگہیں ہیں۔

یہاں معذوروں کے لیے بطور خاص اہتمام ہے۔ اس ایریا میں ان کے لیے اوپر نیچے آنے جانے کے لیے خاص لفٹیں ہیں جن میں وہیل چیئرز پڑی ہوتی ہیں۔ بہرے لوگوں اور گونگے لوگوں کے لیے سپیشل فون سروس بھی موجود ہے۔

اس ایئرپورٹ سے پسنجرز فلائٹس کے علاوہ تقریباً 1000 کارگو فلائٹس دنیا کے دوسرے ممالک کو جاتی ہیں۔

آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ لاس اینجلس کتنا بڑا، کتنا مصروف اور کتنی اچھی کارکردگی کا حامل ایئرپورٹ ہے۔

ہاں تو

جہاز جیٹی سے لگا۔ مسافر اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھے۔ اوپر کی کیبن میں رکھے بیگ، لفافے، بریف کیس وغیرہ نکال کر قطار میں کھڑے ہونے لگے۔ باری باری سب جہاز سے نکلے۔

میں بھی ان لوگوں کے ساتھ جہاز سے نکلی۔ جیٹی سے ہوتی لاؤنج میں آ گئی۔ یہ بہت بڑا لاؤنج تھا جس کے دوسری لاؤنج کے درمیان لکڑی کی دیوار تھی۔ یہاں سے بھی کئی دروازے باہر کی طرف کھلتے تھے۔ لاؤنجز میں مسافر بیٹھے تھے۔ لاؤنجز کے سامنے کافی کشادہ کھلی جگہ تھی جس کی لکڑی کی دیوار میں بڑے بڑے شیشوں کے در تھے۔ یہاں سے باہر کا خوبصورت منظر نظر آتا تھا۔ یہ کشادہ جگہ کسی بہت بڑے برآمدے کی طرح تھی جو ڈھلانی تھا۔

یعنی بائیں ہاتھ شیشے کی دیوار اور دائیں ہاتھ لاؤنجز اور آفسز کے علاوہ ٹیلی فون بوتھ تھے۔ اسی ہاتھ سات آٹھ فٹ کی بلندی پر لکڑی کی تختیوں پر ہدایات لکھی تھیں۔ یہ جگہ

جگہ نصب تھیں۔ انہیں پڑھ کر بندہ آسانی سے جہاں جانا ہو پہنچ سکتا تھا۔

میرے ساتھ جتنے مسافر اترے وہ سب اس برآمدے سے ہوتے ہوئے ڈھلان کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے چونکہ ریشو نے تاکید کی تھی کہ جیٹی سے نکل کر دروازے کے پاس ہی کھڑی رہوں۔ امیر مجھے وہاں سے خود آ کر لے جائے گا، اس لیے میں باقی مسافروں کے ساتھ نہیں گئی بلکہ قریبی لمبے چوڑے شیشے سے باہر کے مناظر دیکھنے لگی۔

میرے پاس صرف ہینڈ بیگ تھا۔ میرا سامان یقیناً لگیج لینے والی بیلٹ تک جا چکا تھا۔

میں چند منٹ باہر دیکھتی رہی۔ اب برآمدے میں اکا دکا مسافر ہی رہ گئے تھے جو اپنی منزل کی سمت جا رہے تھے۔

میں لاؤنج میں بیٹھے لوگوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں جاپان جانے والی فلائٹس اناؤنس ہوئی تو اس لاؤنج کے لوگ اپنا اپنا دستی سامان سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پچھلی طرف باہر جانے کا دروازہ تھا۔ چند لمحوں ہی میں لوگ اس دروازے میں چلے گئے۔ ان کا جہاز ادھر کی جیٹی سے لگا ہوگا۔

پھر

دس پندرہ منٹوں میں کئی فلائٹس آئیں اور گئیں۔ مختلف لاؤنجز میں ہلچل ہوتی رہی۔

میں برآمدے میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ کبھی دور برآمدے کے گھماؤ پر نظریں جما دیتی۔ جہاں آنے والی فلائٹس کے لوگ سامان کے حصول کے لیے جاتے دکھائی دیتے۔ رش ہوتا، پھر چند لوگ رہ جاتے۔

مجھے کھڑے کافی دیر ہو گئی تھی۔ امیر احمد ابھی تک مجھے یہاں لینے نہیں آئے تھے۔

"یا اللہ امیر کہاں رہ گئے؟"

"کیا انہیں فلائٹ کا ٹائم معلوم نہ تھا؟"

"لیکن نہیں۔ ان سے تو صبح ہی بات ہوئی تھی۔ انہیں پتہ تھا کہ میں نادرن ایئر لائن سے آ رہی ہوں۔"

"تو پھر اب تک آئے کیوں نہیں......؟"

میں اپنے آپ سے سوال و جواب کر رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اب الجھن اور گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ انجان اور اجنبی سرزمین پر میں تن تنہا کھڑی تھی۔ کہاں جانا ہے، کیسے جانا ہے، کچھ پتہ نہ تھا۔ ہزاروں لوگ فلائٹس سے آنے لگے تھے لیکن ایک بھی مانوس چہرہ نظر نہ آیا تھا۔

جوں جوں سوچتی گئی، میری پریشانی اور گھبراہٹ بڑھتی گئی۔

اب کیا کروں؟ کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

میں نے سوچا کسی سے پوچھنا چاہیے؟

اب اکا دکا لوگ برآمدے میں آ جا رہے تھے۔ کچھ لاؤنجز میں جا رہے تھے۔

کوئی کافی شاپ پر کھانے پینے کی چیزیں لے رہا تھا۔ کوئی روتے بچوں کو بہلا رہا تھا۔

اتنے میں چار پانچ لوگوں میں ایک سکھ صاحب نظر آئے۔ میں جلدی سے ان کی طرف بڑھی۔ یقیناً ان سے مجھے کچھ مدد مل سکتی تھی۔ پنجابی میں کھل کر بات بھی ہو سکتی تھی۔

"سردار جی۔" میں نے ان کے قریب جا کر کہا۔

"جی بہن جی۔" لال پگڑی اور سوٹ میں ملبوس وہ صاحب بڑی تعظیم سے بولے۔ "آپ انڈیا سے ہیں یا پاکستان سے؟"

"میں پاکستان سے آئی ہوں۔"

وہ بڑے تپاک سے بولے۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر۔"

"شکریہ" میں نے کہا۔

پھر

میں بولی۔ "سردار صاحب میں اکیلی نیوجرسی سے آئی ہوں۔ سان ڈیگو جانا ہے۔ مجھے میرے نواسے نے یہاں لینے آنا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔ کیا وہ اوپر یہاں آ سکتا ہے؟"

"پتہ نہیں بہن جی...... میں تو دو دن کے لیے یہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ آج واپس جا رہا ہوں۔ یہاں کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔"

میں مایوس ہو گئی۔

وہ صاحب کچھ دیر کھڑے رہے، پھر آگے بڑھ گئے۔

اب میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے کھانے کا وقت کبھی کا ہو چکا تھا۔ گو یہاں ابھی بارہ بجنے والے تھے لیکن یہ وقت تقریباً چار گھنٹے پیچھے تھا۔ اب تو تین چار بجنے کے قریب تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن بھوک تو سامنے ہی کی شاپ سے برگر لے کر مٹائی جا سکتی تھی۔ امیر کا کیا کرتی۔

میں نے ایک برگر خریدا۔ کوک کا ٹن لیا۔ ایک بنچ پر بیٹھ کر جلدی جلدی کھایا پیا۔

پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے امیر کا انتظار کرنے لگی۔

جو

اب واقعی

سوہانِ روح ہو رہا تھا۔

کئی منٹ اور گزر گئے۔

میرے پاس ریشو کا فون نمبر تھا۔ سوچا اسے ہی فون کر کے امیر کے نہ آنے کی وجہ پوچھ لوں۔

ایک گوری قریب سے گزری تو میں نے پوچھا۔ "فون کرنا ہے، کہاں سے کروں؟"

اس نے کچھ فاصلے پر ایک بڑی سی کیبن کی طرف اشارہ کیا اور آگے چل دی۔

میں اس کیبن کی طرف گئی۔ وہاں کرسیوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ شاید یہ بھی کہیں جانے والے مسافر تھے۔

مجھے یہاں کوئی فون پڑا نظر نہ آیا۔ پریشانی اور بڑھی۔

لیکن

جلد ہی میری نظر سامنے والے بورڈ پر پڑی جس کے سامنے دو تین لوگ فون کانوں سے لگائے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ رنگت سنہری، بال کالے، آنکھیں چمکتی ہوئی کالی تھیں۔ لباس گوریوں جیسا تھا۔ غالباً وہ سپینش عورت تھی۔

وہ فون کر چکی تو میں نے کہا۔ "میں نے فون کرنا ہے۔"

"ہاں۔ ضرور۔" اس نے کہا۔

میں نے بورڈ پر نگاہ ڈالی۔ وہاں بٹن ہی بٹن تھے۔ کچھ جگہ سکے ڈالنے والے ہول بنے تھے۔ اب مجھے خاک سمجھ آتی کہ فون کیسے کیا جاتا ہے اس بورڈ سے۔

"پلیز۔" میں نے اس عورت سے کہا۔

"ہوں۔" وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

میں نے ریشو کا نمبر جس کاغذ پر لکھا تھا، وہ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سان ڈیگو کا نمبر ہے۔ یہاں سے فون ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔

"مجھے یہاں سے فون کرنا نہیں آتا۔ کیا آپ میری مدد کر سکتی ہیں؟"

"ہاں۔"

اس نے فون نمبر مجھ سے لیا اور بولی۔ "ایک ڈالر دو۔"

میرے پاس چینج نہیں تھا۔ میں نے دس ڈالر کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے ایک انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ "ون ڈالر۔"

"میرے پاس ایک ڈالر نہیں، یہ نوٹ ہے۔"

قریب ہی بیٹھے ایک فربہ سے گورے نے مجھ سے نوٹ مانگا اور اس کا چینج مجھے دے دیا۔

وہ سمجھ چکا تھا کہ میں غیر ملکی ہوں۔ منہ سے کچھ بولے بغیر مجھے نوٹ لے کر چینج دے دیا۔

میں نے شکریہ کہا۔

اور

ایک ڈالر اس عورت کو دے کر فون نمبر والی اپنی چھوٹی سی نوٹ بک کا صفحہ کھول کر کاغذ اس کے سامنے کر دیا۔

اس نے فون ملایا اور بیل کی آواز آنے پر فون مجھے پکڑا دیا۔

"شکریہ۔" میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرائی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

بیل جا رہی تھی۔ مسلسل جا رہی تھی۔

لیکن

دوسری طرف سے کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔

یا اللہ......

فون ڈسکنیکٹ ہو گیا۔ میری پریشانی اور گھبراہٹ کا شاید آپ لوگ اندازہ نہ کر پائیں۔ بعید نہیں تھا کہ میں گر جاتی۔

لیکن

ایک دم ہی مجھے خیال آیا۔ ریشو تو امیر کے ساتھ مجھے لینے آئی ہوگی۔ یقیناً وہ گھر پر نہیں۔

اس بات سے مجھے قدرے تسلی بھی ہوئی کہ وہ لوگ گھر پر نہیں، مجھے لینے آئے ہوئے ہیں۔

اب پھر میں ادھر اُدھر گھومنے لگی۔ لوگوں کی وہی چہل پہل۔ فلائٹس کا آنا جانا لگا تھا۔

لیکن

مجھے امیر لینے نہیں آ رہا تھا۔

اب میں نے ذرا اپنے آپ کو سنبھالا۔ گھبرانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرے پاس واپسی کا ٹکٹ تھا۔ اگر رات یہاں بھی آ جاتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لاؤنج میں پڑی گدے دار کرسیوں پر رات گزر سکتی تھی۔ کل کی فلائٹ سے میں واپس جا سکتی تھی۔ یہاں موسم سرد نہیں بلکہ خوشگوار تھا۔ اس لیے کپڑوں کی بھی فکر نہ تھی۔

یہی سوچتے ہوئے میں وہیں کھڑی ہو کر شیشوں سے باہر حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا لاس اینجلس کا ہوائی اڈہ دیکھنے لگی۔

میں چند لمحے دیکھنے کے بعد پھر مڑی۔ ایک عملے کی گوری عورت یونیفارم میں

ادھر سے گزر رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی......" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

وہ رک گئی۔

"کیا مسافروں کو ریسیو کرنے یہاں اوپر کوئی آ سکتا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو......؟" میں ہڑبڑا گئی۔

اس نے برآمدے کے گھماؤ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرف چلی جائیں۔" پھر ہاتھ سے ہدایات کی تختیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "لگیج نیچے ہوگا۔ وہاں سے سامان لے کر آپ گیٹ سے باہر جا سکتی ہیں۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سامان لے کر باہر جاؤں گی کہاں؟

چند لمحے تذبذب کا شکار رہنے کے بعد میں ادھر چل پڑی۔

"ہو سکتا ہے امیر نیچے ہو۔"

میں جا رہی تھی کہ عملے کے یونیفارم میں ایک موٹا تازہ چمکتی رنگت والا کالا نظر آیا۔

"لگیج بیلٹ؟" میں نے کہا۔

اس نے گھماؤ کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارا سامان ادھر ہے۔"

میں نے اس کی بات پر غور نہیں کیا کہ اسے کیسے پتہ چلا کہ میرا سامان ادھر ہے۔

اس نے خود ہی کہا۔ "میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں...... آئیں میرے ساتھ۔"

وہ عملے کا آدمی تھا۔ اس لیے میں اس کے ساتھ چل دی۔ وہ گھماؤ کی طرف جانے کی بجائے مجھے ایک لفٹ میں نیچے لے آیا۔ لفٹ میں اس نے مجھ سے کہا۔

"تمہارا گرینڈ سن تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔"

"اوہ۔" میری جان میں جان آئی۔ "امیر احمد خان؟"

"ہاں۔" اس نے جواباً امیر احمد خان کو اپنے انگریزی لہجے میں کہا۔

"وہ آیا ہوا ہے؟"

"ہاں......"

میری ڈھارس بندھی۔ میں لفٹ سے باہر نکلی تو وہ مجھے لگیج بیلٹ کی طرف لے آیا۔ لیکن

میرا سامان وہاں نہیں تھا۔

اب پھر پریشانی نے آن گھیرا۔ یہ کالا مجھے یہاں لے تو آیا تھا لیکن سامان کدھر گیا۔

"ٹھہریں میں پتہ کرتا ہوں۔"

اس نے کہا اور سامنے کیبن میں بیٹھے دوسرے کالے کے پاس جا کر کچھ کہا۔ اس نے جواباً کچھ کہا۔

پھر دونوں میری طرف آ گئے۔

اس فلور پر لوگوں کے جمگھٹے تھے۔ چہل پہل، رونق، رنگا رنگ لوگ، لاؤنجز مسافر...... منی چینجرز۔ شاپس پتہ نہیں کیا کچھ تھا۔

دوسرا کالا میرے پاس آتے ہی بولا۔ "آپ کا سامان یہاں سے اٹھوا کر اس سامنے والے سٹور میں رکھ دیا گیا ہے۔ آپ کا گرینڈسن وہاں رکھوا گیا ہے۔"

"وہ ہے کہاں؟"

اس نے کہا۔ "وہ سپیشل پرمیشن لے کر اوپر آپ کی تلاش میں گیا ہے۔ فلائٹ آنے پر آپ دوسرے مسافروں کی طرح ادھر سامان لینے کیوں نہیں آئی تھیں؟"

اب میں اسے کیا بتاتی کہ ریشم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ جیٹی سے نکل کر دروازے کے پاس کھڑی رہوں۔

"اب میں کہاں جاؤں؟"

"اوپر۔" وہ کالا بولا۔ دوسرا کالا پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔

"کیسے؟"

"لفٹ ہے۔"

"لیکن...... مجھے لفٹ آپریٹ کرنا نہیں آتی۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "آپ

میرے ساتھ اوپر جا سکتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ امیر احمد خان اوپر گیا ہوا ہے۔ وہ آپ کو ادھر تلاش کر رہا ہوگا۔ آپ اوپر چلی جائیں۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر اس سے پوچھا۔ "آپ کو کیسے پتہ کہ وہ میرا گرینڈ سن ہے؟"

وہ بولا۔ "ڈیڑھ گھنٹے سے وہ یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی گرینڈ ما آ رہی ہیں۔ سوٹ کیس پر نام تھا جسے پڑھ کر اسے پتہ چل گیا کہ آپ آ چکی ہیں۔ اسی لیے وہ اب خاص اجازت لے کر آپ کو لینے اوپر گیا ہے۔ بہتر ہے آپ اوپر چلی جائیں ورنہ وہ پریشان ہوگا......"

میں پریشان کم تو نہیں تھی لیکن لفٹ سے اوپر نہ جا سکتی تھی۔ میں پاکستان میں بھی لفٹ میں کبھی اکیلی نہیں گئی۔ اسے کیسے آپریٹ کرتے ہیں، میں نہ کبھی گئی ہوں، نہ کبھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

"ویل" وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "آئیں آپ کو انکوائری والوں کے پاس لے چلوں۔" میں اس کے ساتھ چل دی۔

تھوڑی ہی دور "معلومات" کا دفتر تھا۔ وہاں دو گوری لڑکیاں ایئرپورٹ کے یونیفارم میں ڈیوٹی پر تھیں۔

کالے نے ان سے میرے متعلق بات کی۔

"اوہ یس۔" ان میں سے ایک لڑکی بولی۔ "ایک پاکستانی نوجوان آپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔ غالباً آپ کا گرینڈسن۔"

"ہاں۔"

"وہ اب اوپر گیا ہے، آپ اوپر چلی جائیں۔ وہ ادھر ہی آپ کو تلاش کر رہا ہوگا۔"

"مجھے نہیں پتہ، اوپر کدھر سے جانا ہے۔"

"وہ سامنے لفٹ ہے۔"

سامنے فاصلے پر ایک نہیں تین چار لفٹیں تھیں۔ پتہ نہیں کتنے فلور تھے اور کونسی لفٹ کہاں جاتی تھی۔

"میں اوپر اکیلی نہیں جا سکتی۔ کچھ اور کریں۔"

"ٹھیک ہے آپ یہاں بیٹھیں۔" دوسری گوری نے مجھے کہا۔

پھر دونوں مجھے پریشان دیکھ کر تسلی دینے لگی۔

ایک بولی "اوپر کے فلور پر اناؤنسمنٹ کروا دیتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" دوسری نے کہا۔

پھر دونوں کاؤنٹر پر چلی گئیں۔ مجھ سے امیر احمد کا نام پھر سے پوچھا اور چند لمحوں بعد اناؤنسمنٹ گونج رہی تھی۔

"مسٹر امیر احمد خان۔ آپ کی گرینڈ ما نیچے معلومات کے دفتر میں ہمارے پاس ہیں، نیچے آ جائیں۔"

اب مجھے قدرے حوصلہ ہوا۔

اور

کچھ دیر بعد

امیر احمد خان صاحب دور سے سیڑھیاں اترتے، پھلانگتے پھولی سانسوں کے ساتھ میری طرف لپکے۔

اسے میں دیکھتے ہی باہر دوڑی۔

قریب آتے ہی وہ مجھ سے لپٹ کر بولا۔ "اوہ نانی آپ کدھر گم ہو گئی تھیں۔"

"شکر کرو مل گئی...... ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا۔" میں نے اس کا ماتھا چوما۔

"ہاں شکر کی بات ہے نانی۔ آپ کا سوٹ اور اس پر نام نہ ہوتا تو میں کیسے جان پاتا کہ آپ آ گئی ہیں۔ میں نے تو واپس چلے جانا تھا۔"

"اف توبہ...... بڑی پریشانی دیکھی ہے میں نے۔"

اس نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے مجھے پیار کیا۔ بے حد پیار کرنے والا بچہ

ہے امیر۔

"چلیں۔ دو تین گھنٹے تو ضائع ہوئے لیکن آپ کو ڈھونڈ ہی لیا۔"

اس نے دونوں گوریوں کا شکریہ ادا کیا جو ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

امریکہ میں عام طور پر بچے اپنے گرینڈ پیرنٹس سے بہت زیادہ مانوس ہوتے ہیں اور انہیں پیار کرتے ہیں۔

امیر میرا سامان لے آیا۔

اور

ہم دونوں خوشی خوشی پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیے جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں باتیں کرتے ہنستے مسکراتے دنیا کی سب سے بڑی اور خوبصورت شاہراہ پر سان ڈیگو کی طرف جا رہے تھے۔

"نانی۔" امیر نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد مجھ سے کہا۔ "آپ فلائٹ آتے ہی دوسرے مسافروں کے ساتھ لگیج لینے کیوں نہ آئی تھیں؟"

"بھئی میں کیسے آتی؟"

"کیوں؟"

"مجھے ریشو نے فون کیا تھا۔ تاکیداً کہا تھا کہ میں جیٹی سے نکل کر دروازے کے قریب ہی کھڑی رہوں۔ تم مجھے وہاں سے لے لو گے۔"

"اوہ خدایا۔" امیر نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"کیوں؟" میں بولی۔

"نانی...... میں نے ریشو سے کہا تھا کہ نانی کو کہہ دینا۔ لگیج لے کر دروازے کے باہر نہ آئیں، دروازے کے قریب ہی رہیں۔ اس نے غلط پیغام دے دیا۔ اف کتنی پریشانی اٹھانا پڑی۔"

"چلو خیر۔ دیر آید درست آید۔ کوئی بات نہیں۔ تم نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ اب میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔ اب پریشانی نہیں۔ ریشو اور منے اکمل سے ملنے کی بے تابی ہے۔"

"ویسے نانی۔" وہ ہنس کر بولا۔ "آپ کی نواسی کے غلط پیغام نے......"

"تم نے اسے ایسے ہی کہا ہوگا۔" میں بھی ہنسی۔

"اچھا۔ اپنی نواسی پر غلطی کا الزام نہیں لگانا چاہتیں آپ۔"

"بالکل......"

"میں موردِالزام ہوں۔"

میں ہنس پڑی۔ "تم مجھے ریشم ہی کی طرح پیارے ہو۔ چلو جو ہوگیا سو ہوگیا۔ اب تو ہم مل گئے نا۔"

وہ ہنس پڑا۔

امیر انجینئر ہے۔ ریشو چونکہ امریکن سٹیزن تھی، اس لیے شادی ہوتے ہی امیر کو بھی امریکہ کا ویزا مل گیا تھا اور دونوں امریکہ آ گئے تھے۔ اب امیر ایک بہت اچھی پوسٹ پر ہے۔

امیر پٹھان ہے اور پٹھانوں والی ساری خصوصیات اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ امریکہ میں رہ کر بھی اپنی شناخت قائم رکھنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ غیرت مند نوجوان ہے۔ جوشیلا بھی بہت ہے۔ دوستی میں جان دینے اور دشمنی میں جان لینے والے مقولے کو پسند کرتا ہے۔ بڑوں کی خواہ غیر ہی کیوں نہ ہوں، عزت وتکریم اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے۔ مہمان نواز ہے۔ بہت لائق اور محنتی ہے۔ ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کر رہا ہے۔ مزاج میں نرمی اور سختی کا امتزاج ہے۔ میری ریشم ایسی نواسی ریشم اور وہ اپنے ڈیڑھ سالہ بچے پیارے سے ایمل کے ساتھ سان ڈیگو کے ایک سنگل بیڈروم اپارٹمنٹ میں ان دنوں رہائش پذیر تھے۔

چونکہ لاس اینجلس سے سان ڈیگو کی ڈرائیو تین گھنٹوں پر محیط تھی، اس لیے کچھ دیر تو میں امیر کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی اردگرد کے نظاروں سے مسحور ہوتی رہی۔ شاہراہ کے ایک طرف اونچے نیچے پہاڑی سلسلے تھے۔ دوسری طرف ٹھاٹھیں مارتا بحراوقیانوس، درمیان میں ریتلے میدان۔

"نانی۔" امیر نے مجھے بحراوقیانوس کا وہ علاقہ دکھاتے ہوئے کہا جہاں سے امریکی جنگی جہاز عراق پر بمباری کرنے کے لیے اڑتے تھے، وہ مجھے تفصیلاً سب کچھ بتا رہا تھا۔

"جی۔" میں نے اسے مخاطب کرنے پر کہا۔

"ابھی کافی ڈرائیو باقی ہے۔ آپ تھک گئی ہیں تو پچھلی سیٹ پر لیٹ جائیں۔"

"ٹھیک ہے امیر میں واقعی تکان محسوس کر رہی ہوں۔"

امیر نے سڑک کے ایک طرف لے جا کر گاڑی روک دی۔ وہ باہر نکلا، پچھلا دروازہ کھولا۔ "آیئے ادھر آرام سے لیٹ جائیں۔ اتفاق سے گاڑی میں یہ کشن بھی پڑا ہے۔ اس کا تکیہ بنالیں۔"

میں پچھلی سیٹ پر آ گئی۔ امیر اپنی سیٹ پر بیٹھا۔ "نانی گھر جا کر خوب باتیں کریں گے۔ آپ فی الحال آرام سے لیٹ جائیں۔"

میں

لیٹی کیا...... سو ہی گئی۔

جاگی تب جب امیر نے گاڑی اپنے گھر کے سامنے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی۔

ریشو مجھ سے لپٹ گئی۔ چمٹ گئی۔ وہ بے حد اداس ہو رہی تھی۔ فرط جذبات سے آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ جدائی کا عذاب آنسوؤں سے دھلا۔ ملن کی خوشی چہکاروں میں بدلی۔ ہم دونوں کئی لمحے جذباتی کیفیت سے دوچار ہونے کے بعد جب سنبھلیں تو احوال پرسی کا مرحلہ طے کیا۔ گول مٹول اور بے حد پیارے خوبصورت ایمل کو گود میں لے کر بھینچا۔ پیار کیا۔ خاندان میں سب سے پہلے میں نے اس بچے کو دیکھا تھا۔ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

ریشو نے اسے شلوار قمیض، طِلے والی کالی واسکٹ اور طِلے والی پشاوری چپل پہنا کر بالکل پٹھان بچہ بنایا ہوا تھا۔ ڈیڑھ سالہ ایمل ابھی باتیں نہیں کرتا تھا لیکن مجھے دیکھ کر کوئی اجنبیت ظاہر نہیں کی۔ میری گود میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ریشو سے کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے ہم دونوں کچھ جذباتی ہو گئی تھیں۔

ریشو کا اپارٹمنٹ یوشیپ بے شمار اپارٹمنٹس کے ایک سرے پر تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ ایک طرف سیڑھیاں اور دوسری طرف لفٹ تھی۔ نیم دائرے میں جو کھلی جگہ چھٹی تھی، اس میں سرسبز گھاس پھولدار پودے اور درخت ترتیب سے لگے تھے۔ درمیان

میں سوئمنگ پول تھا۔

خاصی بارونق جگہ تھی۔

سان ڈیگو کیلیفورنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے یعنی لاس اینجلس کے بعد اس کا نمبر آتا ہے۔ یہ تقریباً 838 Sq KM رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ کیلیفورنیا کے جنوب مغربی کونے میں واقع ہے۔ محل وقوع اور تفریحی اعتبار سے یہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خلیج سان ڈیگو پر واقع ہونے کی وجہ سے دنیا کی بہت خوبصورت اور قدرتی بندرگاہ بھی ہے۔ یہ یونائیٹڈ سٹیٹس نیوی کا بیس بھی ہے اور تجارتی نقطۂ نگاہ سے بھی بڑا اہم ہے۔

اس کی آبادی 1980ء میں 875.538 تھی اور یہ امریکی ریاست کا چھٹا بڑا شہر آبادی کے لحاظ سے تھا لیکن 1998ء میں اس کی آبادی 1.220.666 ہو گئی۔ اب یہ خاصا گنجان آباد شہر ہے۔ یہاں کے موسم تقریباً پاکستان کی طرح ہیں۔ گرمیوں میں گرمی، سردیوں میں سردی لیکن موسموں میں پاکستان کے موسموں کی سی شدت نہیں۔ کیلیفورنیا ہری بھری سٹیٹ ہے۔ پہاڑی علاقے بھی ہیں۔ میدانی بھی۔ خلیجیں بھی ہیں۔ بحرِ اوقیانوس بھی کئی جگہ کناروں سے لپٹا ہوا ہے۔

سان ڈیگو میکسیکو کے تسلط میں تھا۔ جب 1846ء میں میکسیکن جنگ ہوئی جو 1848ء تک جاری رہی۔ یونائیٹڈ سٹیٹس کی فوجوں نے اس شہر کو میکسیکن تسلط سے آزاد کرا لیا۔ 1850ء میں اسے الگ شہر کا درجہ دے دیا گیا۔

سینڈ ییگو کی انتظامیہ آٹھ ممبران اور ایک میئر پر مشتمل ہے۔ ہر چار سال بعد الیکشن ہوتے ہیں اور نئی انتظامیہ چارج سنبھال کر انتظام چلاتی ہے۔

اس شہر میں دو بہت بڑی اور مشہور یونیورسٹیاں ہیں جنہیں سٹیٹ چلاتی ہے۔ ایک کا نام لاس اینجلس یونیورسٹی اور دوسری کا سان ڈیگو یونیورسٹی ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار کالجز، سکول اور تحقیقاتی ادارے ہیں۔ تفریحی مقامات کی کمی نہیں۔ کیسینوز، شراب خانے، سینما، تھیٹرز، میوزیم، کھیلوں کے میدان سٹیڈیم، سٹورز اور شاپس بھی بہت ہیں۔ یہ جگہیں ویسی ہی ہیں جیسی نیوجرسی یا نیویارک میں تھیں۔ امریکہ میں Chain of Store کا سسٹم

کامیابی سے چل رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی سٹورز سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سان ڈیگو میں بھی وہی سٹورز ہیں جو نیویارک اور نیوجرسی میں دیکھے۔ یہاں سٹورز قدرے چھوٹے تھے لیکن بے شمار تھے۔

یہاں کشادگی کا احساس بہت ہوتا ہے۔ سڑکیں بے انتہا چوڑی ہیں۔ ہموار اور خوبصورت۔ رہائشی علاقے بھی کھلے کھلے ہیں۔ رقبے کے لحاظ سے یہاں آبادی شاید کم ہے۔ اس لیے ہر جگہ کشادہ اور کھلی کھلی لگتی ہیں۔ باقی سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا نیوجرسی یا نیویارک میں دیکھا۔ وہی صفائی، وہی سسٹم، وہی قانون کی بالادستی۔ قانون شکنی کا کوئی تصور عوام میں نہیں۔ وہی عوام کی زندگی کا انداز اور رویے۔ اپنے کام سے کام۔ دوسرے کے معاملے میں نہیں الجھتے۔ صحت مند لوگ اپنے اپنے کاموں میں سنجیدگی سے مصروف۔

یہ سب کچھ نیوجرسی اور نیویارک میں بھی دیکھا تھا۔ اس لیے لگا امریکہ کے سب شہر ایک جیسے ہی ہیں۔ سان ڈیگو تھوڑا سا اس لیے مختلف تھا کہ یہ خلیج سان ڈیگو پر واقع ہے اور اس کے کئی کنارے، بحرِ اوقیانوس سے چھوتے ہیں۔ یہاں کے Beaches دنیا بھر میں اپنی خوبصورتی اور قدرتی پن کے لیے مشہور ہیں۔

یہ ایک بہت پُرسکون اور خوبصورت شہر ہے۔

ہاں تو

میں ریشو کے پاس تھی۔ امیر اور ایمل بھی تھے۔ لاس اینجلس میں جو ریشو کے غلط پیغام سے پریشانی ہوئی تھی، اب دور ہو چکی تھی۔ امیر نے ریشو سے باز پرس بھی کی لیکن میں نے بات ختم کرا دی۔ ''دیکھو امیر۔ ریشو کو تمہاری بات سمجھنے میں غلطی لگی۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اب تو میں بخیر و عافیت گھر آ گئی ہوں۔ اب میری بچی سے پوچھ گچھ نہ کرو۔''

''نانی۔ آپ نے اتنی پریشانی اٹھائی۔'' وہ بولا۔

''اتنی ہی اب خوشی ہو رہی ہے۔ تم لوگوں کے درمیان بیٹھی ہوں۔ پیارا سا ایمل میری گود میں بیٹھا ہے۔''

ہم کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ریشو کھانے پینے کی چیزیں لے آئی۔

چائے بنائی۔ ہم تینوں نے کھایا پیا اور ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔ ریشو اور امیر پاکستان ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ امریکہ میں آ بسنے والے ہر بندے کی طرح انہیں یہاں ہر قسم کی سہولتیں حاصل تھیں۔ صرف عزیزوں، رشتہ داروں کی جدائی تکلیف دہ تھی۔ ماں باپ، بہن بھائیوں سے دوری ان کو اداس کر رہی تھی۔ وطن کی یاد بھی ستاتی تھی۔

لیکن

آہستہ آہستہ

ان لوگوں کو ان باتوں کا عادی ہونا ہی پڑتا ہے۔

دو تین دن میں اور ریشو گھر پہ ہی رہے۔ ریشو کے ساتھ میں کام میں ہاتھ بٹاتی۔ سارے کام وہاں خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ مجھے ان بچیوں پر ترس بھی آتا تھا۔ پاکستان میں یہ سب نوکروں کی عادی تھیں۔ کبھی کسی کام کو ہاتھ نہ لگایا تھا اور یہاں سر سے پاؤں تک سارے کام کرنا پڑتے تھے۔ بشرہ، حمیرا، آمنہ، صائمہ سب ہی ایسی تھیں اور اب گھر کے چھوٹے بڑے کام خود ہی کرتی تھیں۔ یہ لوگ تو اب کام کرنے کی عادی ہو گئی تھیں لیکن مجھے انہیں کام کرتے دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی اور میں کوشش کرتی تھی کہ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹا کر ان کا بوجھ ہلکا کروں لیکن یہ بچیاں مجھے کام کرنے نہ دیتیں۔ زبردستی تھوڑا بہت کر لوں تو کر لوں۔

خیر

ریشو کا بھی یہی وطیرہ تھا۔ "نانی آپ ایمل سے کھیلا کریں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ کام سے زیادہ مجھے آپ سے باتیں سننے کی ضرورت ہے۔ مجھے پاکستانی عزیزوں کی ایک ایک بات بتائیں۔ امی، ابو، خالائیں، پھوپھو سب کی باتیں۔ ان کے بچوں کی باتیں۔" وہ کام کرتے مجھ سے باتیں پوچھتی۔

اور

میں ایمل کو کھلاتے ہوئے اسے اپنے ہاں کے قصے، واقعے اور باتیں بتاتی۔ کام ختم کر کے وہ میرے پاس آ بیٹھتی۔ کبھی کبھی میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی۔ مجھے پیار

کرتی۔ لپٹ لپٹ جاتی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب سے بے حد اداس ہے۔

ریشو کا سنگل بیڈ روم اپارٹمنٹ تھا۔ امیر اور ریشو نے اپنا بیڈ روم مجھے دے دیا تھا۔ خود دونوں لیونگ روم میں قالین پر گدا ڈال کر سوتے۔ مجھے یہ بات اچھی نہ لگتی۔ میں دونوں سے کہتی۔ میں لیونگ روم میں صوفے پر آرام سے سو جایا کروں گی۔ تم لوگ اپنے بیڈ پر سویا کرو۔

لیکن توبہ

ریشو تو ریشو امیر بھی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ہماری پیار سے لڑائی بھی ہوتی لیکن امیر کا ایک ہی جواب ہوتا۔ "آپ ہماری بزرگ ہیں۔ میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا کہ نانی آپ صوفے پر سوئیں لیونگ روم میں اور ہم بیڈ پر۔" تقریباً روز ہی میں ان سے صوفے پر سونے کا کہتی لیکن وہ نہ مانتے۔ امیر ماشاءاللہ چھ فٹ لمبا صحت مند نوجوان ہے۔ گدے پر دونوں پورے نہ آتے تھے۔ وہ پاؤں کی طرف کشن رکھ کر اس پر پیر رکھ کر سوتا تھا۔

لیکن

میری بات نہیں مانتا تھا۔ پٹھان فطرتاً مہمان نواز ہوتے ہیں۔ یہ بات میں جانتی تو تھی۔ اس کا عملی تجربہ امیر کے رویے سے ہوا۔ بہت پیار کرتا تھا۔ بڑی عزت دیتا تھا۔ جب تک میں کھانا نہ کھانے بیٹھوں، مجال ہے جو کھانے کو ہاتھ لگائے۔ اکثر میں صوفے پر بیٹھی ہوتی تو وہ میرے قدموں میں بیٹھ کر بازو میری گود میں رکھ لیتا۔

"امیر ادھر میرے پاس بیٹھو بیٹے۔" میں اصرار کرتی۔

"نانی مجھے یہاں مزہ آتا ہے۔ کچھ ثواب تو حاصل کرنے دیں مجھے۔" وہ مسکرا کر جواب دیتا۔

مجھے ان دونوں پر بہت پیار آتا۔ ہم رات گئے تک اسی طرح باتیں کرتے رہتے۔ ریشو بار بار قہوہ اور چائے بنا لاتی۔ انہیں دیکھ کر میں خوش ہوتی۔ سوچتی اگر میں یہاں نہ آتی تو کتنی بڑی خوشی سے محروم ہو جاتی۔

تیسرے دن امیر کو چھٹی تھی۔ اس دن گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا۔

"نانی کو آج لاہویا دکھا لاتے ہیں۔" اس نے ریشو سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ریشو بولی۔ "بس دس منٹ میں سب تیار ہو جائیں۔"

لاہویا...... یا لاجویا پہاڑی علاقہ ہے۔ سمندر سے چٹانیں ابھری ہوئی ہیں۔ عمودی چٹان ہے۔ کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو بہت نیچے سمندر کی لہریں ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ حد نگاہ تک نیلے پانیوں والا بحرِ اوقیانوس پھیلا ہوا ہے۔ لاہویا اتنی اونچائی پر ہے کہ وہاں سے پورا سان ڈیگو نظر آتا ہے۔ اس چٹان پر ایک دو فٹ اونچے چبوترے پر کوئی پانچ سات فٹ اونچا پلر بنا ہوا ہے جس پر صلیب کا نشان بنا ہے۔ اس پر لکھا ہوا کچھ نہیں، پتہ نہیں یہ کوئی یادگار ہے یا کسی اور بات کا نشان۔ اس کے اردگرد ہموار جگہ ہے جہاں گاڑیاں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔

ہم نے اس پلر کے قریب سے اردگرد دیکھا۔ دور نیچے سمندر ہی سمندر تھا۔ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف اونچے نیچے ٹیلے۔ یہاں کافی لوگ سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے۔

یہاں سے گھماؤ دار راستوں سے اترتے ہم نیچے آ گئے۔ یہاں ایک خوبصورت Beach تھا۔ یہ جگہ بھی سمندر سے کافی اونچی تھی لیکن لاہویا جتنی نہیں۔ کافی بڑا میدان تھا جو سبزے، پھولوں اور ہرے بھرے درختوں سے گھرا تھا۔ یہاں لوگ پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ یہاں کار پارکنگ کے لیے سڑک کے ساتھ ساتھ جگہ بنی تھی اور سڑک کے پار خوبصورت، ہوٹل، موٹل اور بنس بنے ہوئے تھے۔ بڑی پُر فضا اور پُر سکون جگہ تھی۔ مختلف لوگ تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے۔ بچے دوڑ بھاگ رہے تھے۔ عورتیں، مرد ادھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ کوئی گھاس پر لیٹا تھا۔ کوئی بیٹھا تھا۔ چٹان کے ایک سرے پر عین سمندر کے اوپر ایک شیشے کا کیبن بنا تھا جس میں بیٹھنے کے لیے سیٹیں بھی تھیں۔ وہاں دو امریکن گٹار بجا رہے تھے۔ لوگ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ ہم بھی کھانے پینے کی چیزیں لے گئے ہوئے تھے۔ ایک درخت کے نیچے بنچوں پر بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ بحرِ اوقیانوس کے ٹھاٹھیں مارتے پانیوں کے اوپر چٹان پر بیٹھ کر کھانا پینا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہم نے بھی

خوب انجوائے کیا۔ ڈیڑھ سالہ ایمل تو ہاتھ ہی نہیں آتا تھا۔ کھلی جگہ ملی تو ادھر سے ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ کناروں کی طرف دوڑ جاتا تو دل دہل جاتے۔ کہیں نیچے ہی نہ لڑھک جائے لیکن کوئی نہ کوئی اسے پکڑ ہی لیتا۔

ریشو نے نئی نئی گاڑی چلانا سیکھی تھی۔ لائسنس مل گیا تھا لیکن ابھی وہ زیادہ گنجان علاقوں کی طرف نہیں جاتی تھی۔ قریب قریب کے سٹوروں اور دکانوں پر مجھے لے جاتی تھی۔

ہم میسی گئے۔ کے مارٹ دیکھا۔ سیون الیون بھی گئے۔ پے لیس شو سٹور، پک اینڈ سیو بھی دیکھے۔ ریشو مجھے ایک انڈین سٹور بھی دکھانے لے گئی۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کی سکھ عورت چلا رہی تھی۔ ہر انڈین چیز اس کے سٹور سے مل جاتی تھی۔ مصالحے، سبزیاں، دیسی چیزیں سونف، میتھرے، کلونجی، پھٹکری، انار دانہ، املی اور دیگر کئی ایسی چیزیں۔ اس کے علاوہ انڈین مٹھائیاں بھی اس کے سٹور پر تھیں۔ آٹا، میدہ، سوجی بھی دستیاب تھے۔ ریشو اسے ماسی جی کہتی تھی۔

اور

وہ ریشو کو پتری (بیٹی) کہہ کر بلاتی تھی۔

ریشو نے اس سے میرا تعارف کروایا۔ وہ بہت خوشی اور گرمجوشی سے ملی۔

سٹور کے ایک حصے میں انڈین فلموں کی کیسٹیں، فلمی اور غیر فلمی گانوں کی کیسٹیں اور ڈی وی ڈیز رکھی ہوئی تھیں۔ یہ چیزیں وہاں سے کرائے پر مل جاتی تھیں۔ ریشو کو وہ کم کرائے پر فلمیں دیا کرتی تھی۔

ریشو نے مجھے سان ڈیگو کا بہت بڑا مال بھی دکھایا۔ Mira Mesa مال بہت لمبا چوڑا شاپنگ مرکز ہے۔ اس میں بے شمار سٹور، شاپس اور ریسٹورنٹ ہیں۔ چائنیز کی بہت بڑی بڑی اور مال سے لدی ہوئی دکانیں بھی دیکھیں۔ انڈین سٹور بھی نظر آئے۔ جیولری کی شاپس بھی تھیں۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ یہاں آنا تفریح کے مترادف بھی ہے۔ نیو جرسی کی طرح یہاں بھی سٹور کے سامنے بہت ہی بڑا کار پارکنگ لاٹ ہے۔ جہاں

ترتیب سے گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں۔ کوئی اصول کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ معذوروں کی گاڑیوں کی پارکنگ کی جگہ بھی مخصوص تھی۔ نیوجرسی کی طرح یہاں کسی معذور کی گاڑی کھڑی ہو یا نہ ہو۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا گاڑی کھڑی نہیں کرتا۔

سان ڈیگو بھی جتنا ممکن تھا گھوم پھر کر دیکھا۔ جس دن امیر گاڑی چھوڑ جاتا، اس دن ریشم گھماتی پھراتی۔ نہیں تو آفس سے آ کر امیر کہیں نہ کہیں لے جاتا۔ چھٹی کے دن چپر دیکھ لیتے۔ سوائے سمندر کے یہاں بھی سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا نیوجرسی میں۔ موسم کا البتہ فرق تھا۔ یہاں بہار تھی جبکہ شدید سردی ہم نے نیوجرسی میں گزاری تھی۔ مارچ، اپریل میں نیوجرسی بھی سبزے اور پھولوں سے لد جاتی ہے۔ اس خوبصورتی کے لیے اسے گولڈن سٹیٹ بھی کہا جاتا ہے۔

خیر

ایک دن ہمیں امیر دوسرے Beaches دکھانے لے گیا۔ مشن بیچ بھی یہاں کا ایک اہم بیچ ہے۔ یہاں پر میرین بیس ہے۔ جیٹ فائٹر کا ایئرپورٹ بھی ہے۔ بہت وسیع و عریض جگہ ہے۔ یہ نیول بیس (Naval Base) بھی ہے۔ یہاں بحراوقیانوس میں جہاز بھی لنگر انداز تھے۔ بہت ہی بڑے بڑے بحری جہاز، جن کے اوپر ہوائی جہاز بھی کھڑے تھے۔ عراق پر حملے کے لیے یہاں سے ہی جہاز اڑ کر جاتے اور اترتے ہیں۔

بہت بڑی بڑی کشتیاں بھی سمندر میں آ جا رہی تھیں۔ سمندر کی سیر کے لیے لوگ یہاں آتے ہیں۔ کرائے پر کشتیاں حاصل کر کے سمندری لہروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک طرح کی پکنک ہی مناتے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ ہوتا ہے۔ کشتیوں کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ یہ موٹر بوٹس ہوتی ہیں۔

کچھ لوگ ذاتی موٹر بوٹس بھی رکھتے ہیں۔ چھٹیاں ان کشتیوں میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرنے میں گزارتے ہیں۔ کئی لوگوں سے ملے جن کی ذاتی کشتیاں تھیں اور وہ دن رات ان کشتیوں ہی میں رہتے تھے۔ ضرورت کی ہر چیز ان بڑی بڑی کشتیوں میں موجود ہوتی تھی۔ بحری جہازوں پر پکنک منانے کا ان ساحلی علاقوں میں عام رواج ہے۔ لوگ فرصت

کے اوقات اس طرح گزار کر بہت انجوائے کرتے ہیں۔ کھانا پکاتے ہیں۔ کھاتے ہیں، میوزک سنتے ہیں۔ کشتی رانی کے مقابلے کرتے ہیں۔ لطف اندوز ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بعض لوگ تو راتیں بھی انہی کشتیوں میں گزارتے ہیں۔ یہ کشتیاں کیا چھوٹے چھوٹے جہاز ہی ہوتے ہیں جن میں کیبن بھی بنے ہوتے ہیں۔

سان ڈیگو ڈاؤن ٹاؤن، ہاربر ڈرائیو، ہاربر کروز، سب جگہیں دیکھیں۔

یہاں شہر کے بیچوں بیچ ٹرین بھی چلتی ہے جو میکسیکن بارڈر تک جاتی ہے۔ خاصی بارونق جگہ ہے۔ ہوٹل ہیں۔ موٹل ہیں۔ ریسٹورنٹ ہیں۔ سمندر کے کنارے ایک ایک دو دو کمروں کے ہٹس بھی ہیں جو بہت خوبصورت اور آرام دہ ہیں۔ یہ ہٹس لوگوں کے ذاتی بھی ہیں اور کرائے پر بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ باہر سے آنے والے لوگ اکثر کرائے پر لے کر ان ہٹس میں رہتے ہیں۔ خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سمندر کی سیر کرتے ہیں۔ ساحل سمندر سے ہٹ کر یہاں اپارٹمنٹس بھی ہیں۔ خوبصورت صاف ستھری پختہ سڑکیں۔ سبزہ، پھول غرضیکہ یہ علاقہ بہت ہی خوبصورت ہے اور ہر قسم کی سہولتیں یہاں مل جاتی ہیں۔

ایک رات ہم نے Powy تھیٹر بھی دیکھا۔ سینما بھی گئے۔ ان دنوں "ٹائی ٹینک" چل رہی تھی۔ مار دھاڑ کی فلموں کے بعد یہ سوشل رومانٹک فلم کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی تھی۔ امریکی عوام تو جیسے اس کے لیے پاگل ہو رہے تھے۔ یہ واقعی ایک خوبصورت فلم تھی۔ رومانٹک اور تھرل سے بھرپور۔ یہاں ایک دو سینماؤں میں انڈین فلمیں بھی جمعہ، جمعرات کو لگتی تھیں۔ ویسے بھی اس علاقے میں ہندوستانی اور پاکستانی خاصی تعداد میں تھے۔ ہندو، مسلم مل جل کر رہتے تھے۔

Bal Box میں مسجدیں بھی خوبصورت ساخت کی بنی دیکھیں۔ یہاں مسلم اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ جمعہ کے دن تو بڑی تعداد میں مسلمان یہاں نماز جمعہ ادا کرنے آئے تھے۔

ریشو نے مجھے اپنی دو تین پاکستانی دوستوں سے بھی ملایا۔ ایک تو کافی عرصے

سے وہاں رہ رہی تھی۔ دوسری دونوں کو ایک ایک سال ہی وہاں رہتے ہوا تھا۔ یہ سب آپس میں ملتی رہتی تھیں۔ وطن کی دوری اور ماں باپ، بہن بھائیوں کی جدائی سے جو اداسی ہوتی، آپس میں مل کر دور کرنے کی کوشش کرتیں۔ ریشو کے زیادہ ملنے والے یہاں نہیں تھے کیونکہ امیر اور اسے یہاں آئے ابھی دو اڑھائی سال ہی ہوئے تھے جبکہ نیو جرسی اور نیو یارک میں رہنے والی بشرہ، حمیرا، آمنہ اور صائمہ کا ملنا جلنا کافی پاکستانیوں سے تھا۔ شاید اس لیے کہ ان کے شوہروں کو امریکہ میں رہتے دس دس بارہ بارہ سال ہو چکے تھے جس کی وجہ سے ان کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔

سان ڈیگو میں سوائے ساحلی تفریح گاہوں کے اور کوئی خاص قابل دید مقام نہیں تھا۔ Beaches واقعی بے حد خوبصورت اور قدرتی مناظر سے بھرپور تھے۔ ہم نے نیچرسٹ کا Beach بھی باہر سے دیکھا۔ سمندر کے کنارے کافی طویل و عریض جگہ پر پھیلا یہ بیچ درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ بیرونی طرف لکڑی کی اونچی دیوار بھی ہے۔ یہاں صرف ننگے لوگ ہوتے ہیں۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، جوان، بچے سب ننگے ہوتے ہیں۔ کپڑوں میں ملبوس کسی شخص کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ اس بیچ پر صرف وہی لوگ جا سکتے ہیں جو نیچرسٹ کلب کے ممبر ہوتے ہیں۔ کیا لوگ ہیں یہ بھی!

آدم زاد برہنہ رہنے کی کیا للک ہے۔ یہ وہی جانیں۔

ادھر ہی ہم نے چھوٹا سا ٹاؤن Delwer بھی دیکھا۔ بہت خوبصورت ٹاؤن تھا۔ سارے امریکہ کی طرح یہاں بھی صفائی اور ترتیب تھی۔ بغیر باؤنڈری کے نفیس مکان تھے۔ صاف ستھری سرمئی سڑکیں تھیں جن کے کنارے کنارے پھولدار درخت تھے۔ یہاں دکانیں بھی کافی تھیں جو بڑے سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔

ہم ایک دن Sea World بھی دیکھنے گئے۔ سدھائی ہوئی چھوٹی بڑی مچھلیوں کے تماشے دیکھے۔ یہ مچھلیاں لوگوں سے مانوس لگتی تھیں۔ قریب سے گزرتیں تو جیسے جان بوجھ کر پانی کے چھینٹے اڑاتیں۔ پانی سے بہت اوپر جا کر غڑاپ سے غوطہ لگاتیں۔ بڑا دلچسپ تجربہ تھا Sea World دیکھنے کا۔

''تانی۔'' ایک دن امیر نے مجھ سے کہا۔

''جی بیٹے۔'' میں بولی۔

''آپ نے ریشو کے ساتھ میکڈونلڈ، کے ایف سی اور دوسرے چھوٹے ریسٹورنٹ تو دیکھ لیے ہیں نا؟''

''ہاں۔ پورے امریکہ کے میکڈونلڈ، کے ایف سی اور چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ ایک ہی ٹائپ کے ہیں۔''

''وہ تو ہیں۔ میں آپ کو ایک بہت بڑے ہوٹل میں لے چلوں گا۔''

''کیا ضرورت ہے۔''

''آپ کے لیے یہ ایک خوشگوار تجربہ ہوگا۔ بہت خوبصورت ہوٹل ہے۔ عین بیچ کے اوپر۔ وہاں سے لاہویا نظر آتا ہے۔ سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔''

''تانی۔'' ریشو بولی۔ ''وہاں فی کس کھانا 300 ڈالر ہے۔ امیر سے پوچھیں تین بندوں کے 900 ڈالر خرچ کریں گے۔''

''اتنا مہنگا ہوٹل؟'' میں بولی۔

''ہوٹل بھی تو دیکھنے والا ہے۔''

''چلو صرف باہر سے دکھا دینا۔''

''اندر سے دکھاؤں گا تانی۔ کھانا نہ سہی بیس ڈالر کی ایک پیالی کافی پی لیں گے۔''

La-Valencia ہوٹل بہت گرینڈ ہوٹل ہے۔ یہاں امراء، روساء اور بہت بڑے بڑے بزنس مین ہی آتے ہیں۔ کئی منزلہ عمارت بیچ کے اوپر ہے۔ لکڑی کے ملائم اور چمکتے ہوئے فلور، پرانی طرز کا بھاری بھرکم فرنیچر، کینڈلز بڑے بڑے گلاسز، چمکتے فریموں والی نایاب تصاویر، پینٹنگز، بیٹریاں، سنہری ریلنگ والی گول گول گھماؤ سے اوپر جاتی سیڑھیاں، اتنا خوابناک اور ایسا مسحور کن ماحول تھا کہ لگتا تھا ہم کسی اور ہی رنگین اور حسین دنیا میں آ گئے ہیں۔ ویٹریسیں انتہائی سمارٹ اور بے حد خوبصورت۔ پرانی طرز کے گھیردار فراک پہنے ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھیں۔ مسکراہٹوں سے ہوٹل میں آنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں ان کی

مطلوبہ جگہ پر بٹھا رہی تھیں۔ بیرے بھی تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھے۔

ہم ایک میز کے گرد کھڑکی کے قریب بیٹھے۔ وہاں سے لاہویا نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف سبز مخملیں گھاس اور رنگا رنگ پھولوں والا میدان جس سے آگے سمندر ہی سمندر تھا۔ میدان میں رنگین رنگا رنگ چھتریوں اور کرسیوں پر نیم عریاں لباسوں میں طرحدار امریکن عورتیں اور مرد بیٹھے تھے۔ کچھ سبزے پر لیٹے رومانوی پوز بنائے تھے۔ گردوپیش سے بے خبر کئی جوڑے محبت کے اعلانیہ اظہار میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

یہ ہوٹل واقعی دیکھنے کے قابل تھا۔ یہاں ہم کھانے کے لیے تو نہ رک سکتے تھے۔ وہاں کافی کی ایک ایک پیالی ضرور پی۔ مزہ کھانے پینے سے زیادہ رنگین ماحول میں ہوتا ہے۔ یہ بات یہاں درست معلوم ہوتی تھی۔ بہت سے لوگ ہوٹل میں تھے۔ کچھ آ رہے تھے۔ کچھ جا رہے تھے۔ ان کی وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

واپسی پر ہم نے بیس بال اور رگبی کا بہت بڑا اسٹیڈیم بھی دیکھا۔ رگبی امریکی کھیل ہے۔ ایک لمبوترے فٹ بال سے یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس سٹیڈیم کا نام Qual Com ہے۔

ادھر سے ہم ایک کیسینو میں بھی گئے۔ رات کا کھانا ریسٹورنٹ میں کھایا۔ یہ ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ تھا۔ خوب مزے کی چٹخارے دار چیزیں تھیں۔

دوسری اتوار امیر اور ریشو نے مجھے قصبہ جولین دکھانے کا پروگرام بنایا۔ یہ ان کے گھر سے کوئی سوا دو گھنٹے کی ڈرائیو پہ تھا۔ راستے میں کنٹری پارک بھی آتا تھا جہاں اکثر لوگ پکنک منانے جاتے ہیں۔

سو ریشو نے بھی پکنک کے لیے چیزیں تیار کیں۔ سینڈوچ بنائے چکن روسٹ کیا۔ کوک کے ٹن رکھے۔ پھل اور چائے کا بندوبست کیا۔ ساری چیزیں کین کی ٹوکریوں میں ڈالیں۔ ایمل کا دودھ اور بسکٹ وغیرہ بھی رکھے۔ رات کو وہ ساری چیزیں تیار کر کے سوئی۔

دوسرے دن ہم تینوں مع ایمل کے جولین کی طرف جا رہے تھے۔ ایمل مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اس لیے میری گود میں بیٹھا اچھلتا کودتا اور پیاری پیاری حرکتیں کرتا

رہتا۔ امیر گاڑی چلا رہا تھا۔ ریشو اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ گاڑی جدھر جدھر سے گزرتی، وہ دونوں اس جگہ سے میرا تعارف کرواتے جاتے۔ ایک چٹان پر بنے بہت بڑے گھر کے قریب سے گزرے تو امیر نے گاڑی آہستہ کر دی اور بولا۔ ”نانی یہ جو گھر آپ دیکھ رہی ہیں نا۔“

”ہاں کافی بڑا ہے۔“

”یہ مشہور گھر ہے۔“

”کس وجہ سے......؟“

”یہاں بیس بندوں نے اجتماعی خودکشی کی تھی۔“

”خودکشی۔ وہ کیوں؟“

”وہ کلٹ تھے......“

”کلٹ کا کیا مطلب؟“

”یہ اپنے مذہبی نظریے کی وجہ سے کلٹ کہلاتے تھے۔ ان کی اپنی ہی دینی تعلیم اور نظریے ہوتے ہیں۔“

”لیکن خودکشی کیوں کی؟“

”وہ اس دنیا کے مکر و فریب سے تنگ تھے۔ زندگی کو انتہائی خوشگوار اور تکالیف سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں جب یہ سب کچھ نہ ملا تو خودکشی کر لی۔ ایک کاغذ پر انہوں نے خودکشی کی کچھ ایسی ہی وجوہات لکھی ہوئی تھیں۔ مرنے والے ہر شخص کی مٹھی میں پانچ ڈالر کا نوٹ تھا......“

”وہ کس لیے؟“

”پتہ نہیں۔ یہ تو مرنے والے ہی جانیں۔ بہرحال اس حادثے سے لوگ بہت ہی متاثر اور خائف ہوئے تھے۔“

ہم ان کلٹس کے بارے میں ہی باتیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ایک بڑی صاف ستھری اور چوڑی سڑک پر آ گئی۔

”نانی اب ہم میکسیکن بارڈر کے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے

اشارہ کیا۔ ”یہ میکسیکو کا علاقہ ہے۔ یہاں کے مالٹے بہت مشہور ہیں۔“

ان دنوں مالٹوں کا موسم تھا۔ ہر ہٹ نما مکان کے سامنے میزوں پر مالٹے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جو بیچنے کے لیے تھے۔ ایک بات نوٹ کی کہ عام سادہ سے گھروں کے ایک کونے میں گول بڑی بڑی چمنیوں والے عجیب وغریب قسم کے اونچے اونچے صراحی کی شکل کے کمرے سے تھے۔

”یہ کیا چیزیں ہیں۔ ہر گھر کے سامنے کونے میں؟“

”یہ میکسیکن کے اصلی گھروں کے نمونے ہیں۔ پہلے یہ ایسے گھروں میں رہتے تھے۔ اب بڑے بڑے کمروں کے گھروں میں رہنے لگے ہیں لیکن اپنے پرانے اور اصلی گھروں کی شکل میں یہ جگہیں بنائی ہوئی ہیں تا کہ ان کے بچے جان سکیں کہ ان کے اصلی اور پہلے گھر کیسے تھے۔“

”واہ۔ کیا بات ہے۔ ویسے بعض لوگوں نے یہ ماڈل اچھے بنائے ہوئے ہیں۔“

”یہ زیادہ تر غریب لوگ ہیں۔ مالٹے بیچ کر گزارہ کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں سان ڈیگو میں آ کر محنت مزدوری کرتی ہیں۔ کالے لوگوں کی طرح یہ لوگ بھی جدید سہولتوں سے محروم ہیں۔“

”سب لوگ ایسے ہی ہیں......؟“

”نہیں۔ پڑھے لکھے اور مالی طور پر اچھے لوگ بھی ہیں۔ میں ان مالٹے والوں کی بات کر رہا ہوں۔“

باتیں کرتے کرتے ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہم پہاڑی علاقے سے اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ پہاڑی علاقہ کہیں سرسبز و شاداب تھا۔ کہیں سوکھا اور ویران۔ راستے میں کئی جگہ جھیلیں دیکھیں۔ رینجرز اور فارم ہاؤسز بھی نظر آئے۔ ساری جگہیں بے رونق اور بے آباد لگ رہی تھیں لیکن رینجرز اور فارم ہاؤسز سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں لوگ رہتے ہیں۔ میلوں دوری پر یہ فارم ہاؤس اور رینجریں تھیں لیکن یہاں بجلی، پانی اور گیس کی سہولتیں موجود تھیں۔

ہم پہاڑی راستے پر چلے جا رہے تھے۔ کئی موڑ آئے۔ گھماؤ پر مڑے اور اوپر ہی اوپر چلتے گئے۔ راستے میں کہیں کہیں مکان نظر آ جاتے جس سے معلوم ہوتا کہ یہاں بھی لوگ رہتے ہیں۔

ایک بجے کے قریب ہم کنٹری پارک پہنچے۔

یہ ایک بہت ہی بڑا اور بڑا ہی خوبصورت پارک تھا۔ سبزہ زار، پھولوں کی بہار، درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔ پرسکون سی جگہ تھی۔ جگہ جگہ بنچ پڑے تھے۔ میزیں رکھی تھیں اور باربی کیو کے لیے انگیٹھیاں تھیں۔ لوگ یہاں بار بی کیو پارٹیاں کرتے۔ پکنک مناتے۔ بچوں کے لیے جھولے بھی تھے اور ٹائلٹ بھی صاف ستھرے پانی اور ٹشو پیپر وافر مقدار میں تھے۔

پارک بہت بڑا تھا جو دور جا کر جنگل میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس جنگل میں چیتے اور چھوٹے شیر بھی پائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے سانپ اور بچھو بھی وہاں بکثرت تھے۔

ہم نے وہاں کھانا کھایا۔

ایمل کو جھولے جھلائے۔ تصویریں کھینچیں اور ڈیڑھ گھنٹے بعد پھر سامان گاڑی میں رکھا۔ ابھی ہم نے جولین جانا تھا۔

ایک گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو کے بعد ہم جولین جا پہنچے۔ یہ پہاڑ کے عین اوپر ہموار جگہ پر واقع تھا۔ سردی بھی کافی تھی۔ لوگ یہاں سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کافی گاڑیاں سڑک کے کنارے کنارے کھڑی تھیں۔

جولین چھوٹا سا قصبہ ہے۔ بالکل مری کے مال سے مشابہ تھا۔ ایک ہی بازار تھا جس کے ایک طرف کچھ دکانیں تھیں۔ دوسری طرف ایپل پائی کے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے تختوں سے بنے ریسٹورنٹ۔

یہاں سیب کے باغات ہیں۔ نہایت عمدہ قسم کا سیب ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہاں ایپل پائی کی دکانیں ہیں۔ سیاح لوگ یہاں جوق در جوق آتے ہیں اور ایپل پائی کھاتے ہیں جو کافی کے ساتھ بہت لذیذ لگتی ہے۔

یہاں سڑک پر بگھیاں دیکھیں۔ دو دو گھوڑوں والی بگھیاں۔ جن میں بیٹھ کر لوگ سیر کرتے ہیں۔ جب سے امریکہ میں میں آئی تھی، یہاں پہلی بار گھوڑوں والی بگھیاں دیکھیں۔ بچے بڑے سب ان میں بیٹھ کر سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتے اور خوب انجوائے کرتے۔

گھوم پھر کر ہم نے ساری دکانیں دیکھیں۔ ضرورت کی چیزیں وہاں سے مل جاتی تھیں۔ یہاں ایک دکان انٹیکس کی بھی تھی۔ اس میں صدی در صدی پرانی چیزیں رکھی تھیں۔ پرانی سنگر سوئنگ مشین، پھاوڑے، کلہاڑے، بیلچے، کھیتی باڑی میں صدیوں پہلے استعمال ہونے والی چیزیں، پرانی نالی دار بندوقیں، طمنچے، رائفلیں۔ غرضیکہ بہت سی پرانی پرانی چیزیں یہاں رکھی ہوئی تھیں۔

جولین پہاڑی کی اونچی چوٹی پر چھوٹا سا بڑا ہی خوبصورت قصبہ تھا۔ یہاں 1869ء میں سونا نکل آیا تھا جو اس کی شہرت کا باعث بنا۔ یہاں آبادی بہت ہی کم ہے لیکن اس کی خوبصورتی اور ایپل پائی کی وجہ سے سیاحوں کا ہجوم رہتا تھا۔ نئے دور کی ہر سہولت یہاں موجود ہے۔ الگ تھلگ اور اتنی اونچائی پر ہونے کے باوجود یہاں بجلی، گیس اور پانی کی کوئی کمی نہیں۔ سڑکیں پکی اور کشادہ ہیں۔ ایک خوبصورت ہوٹل بھی ہے۔ یہاں سڑکوں پر کوئی اشارے نہیں لیکن ٹریفک اصولوں کے مطابق ہی چلتی ہے۔

یہاں کے مقامی اور کچھ دوسرے لوگ بھی نشہ آور سگریٹ پی رہے تھے جنہیں Maravana کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے اٹھارویں صدی کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ بال لمبے لمبے چھوڑے ہوئے تھے اور کندھوں سے شوقیہ بندوقیں لگائے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کسی کسی نے بالوں کی پونیاں بنائی ہوئی تھیں اور داڑھیاں بھی بڑھائے ہوئے تھے۔

جولین کی ایپل پائی اور کافی واقعی بہت مزیدار تھی۔ ہم نے بھی لکڑی کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھائی۔

دو گھنٹے ہم وہاں گھومتے پھرتے رہے۔ پھر شام اترتے ہی واپس ہوئے۔

جولین واقعی بڑی خوبصورت اور قابل دید جگہ تھی۔

ہم گھر پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔

میں دو ہفتے کے لیے یہاں آئی تھی۔ بارہ دن گزر چکے تھے۔ امیر اور ریشم مصر تھے کہ میں ایک ہفتہ اور رک جاؤں۔ میرا جی بھی ان لوگوں کے پاس کچھ دن اور رہنے کو چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی کہ میری سیٹ نیویارک سے لاہور تک کی بک ہو چکی تھی۔ یہاں کا بھی واپسی کا ٹکٹ تھا۔ ہفتہ اور بڑھاتی تو آگے سے نیویارک/لاہور کی سیٹ دو ہفتے تک نہ مل سکتی تھی۔

مجھے دو ہفتے کے بعد واپس جانا ہی تھا۔

میں نے سان ڈیگو کی مشہور جگہیں تو دیکھ لی تھیں۔ اب ڈزنی لینڈ اور سٹوڈیو دیکھنا تھے۔ انہیں دیکھنے لاس اینجلس جانا تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ اگلے دن صبح ہم لوگ لاس اینجلس جائیں۔ ڈزنی لینڈ کا کچھ حصہ دیکھیں۔ رات وہیں رہیں، پھر دوسرا دن ڈزنی لینڈ اور ہالی وڈ میں گزاریں۔ پھر رات وہیں رکیں۔ صبح امیر اور ریشو مجھے ایئرپورٹ پر چھوڑ کر واپس آ جائیں۔ اتفاق سے امیر کو دو دن کی چھٹی بھی تھی۔ اس لیے پروگرام طے پا گیا۔

لیکن

اللہ کو منظور نہیں تھا۔ رات کو میری کمر میں چک پڑ گئی۔ اتنی تکلیف کہ نہ ٹھیک سے بیٹھا جاتا نہ لیٹا جاتا۔

پروگرام مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔

اور

مجھے یہ دونوں مشہور زمانہ جگہیں دیکھے بغیر واپس نیویارک آنا پڑا جس کا بے حد افسوس ہوا۔ قریب جا کر بھی میں ڈزنی لینڈ اور ہالی وڈ نہ دیکھ سکی اور زندگی رہی تو پھر کبھی سہی کہہ کر دل کو تسلی دیتے ہوئے واپس چلی آئی۔ ریشو مجھے وداع کرتے ہوئے خوب روئی۔ مجھے بھی اسے چھوڑتے ہوئے افسوس ہوا۔ نمناک آنکھوں سے اسے پیار کیا، تسلی، دلاسہ دیا۔ ایمل اور امیر کو پیار کیا۔

اور

ایئر پورٹ کے متعلقہ گیٹ سے اندر چلی گئی۔ اب میں گھبرائی نہ پریشان ہوئی۔ سیدھی لاؤنج میں پہنچی اور جب فلائٹ اناؤنس ہوئی تو دوسرے مسافروں کے ساتھ جہاز میں چلی گئی۔ واپسی بھی ٹاور ایئر لائن سے تھی۔ صائمہ کو فون کر دیا ہوا تھا۔ وہ نسیم اور دونوں بچوں کے ساتھ مجھے لینے آئی ہوئی تھی۔ رات اتر چکی تھی۔ میں ان کے ساتھ ان کے گھر آ گئی۔ رات دیر تک ہم ریشو، امیر اور ایمل کی باتیں کرتے رہے جن سے جدا ہو کر میں اداس ہو رہی تھی۔

اب میں نے واپس پاکستان آنا تھا۔ نیو جرسی جا کر پھر نیویارک آنے کی بجائے میں نے بشرہ کو فون کر دیا کہ وہ میرا سامان صائمہ کے گھر لے آئے تا کہ میں یہیں سے دوسرے دن پاکستان روانہ ہو جاؤں۔

لیکن

شمیم کا فون آ گیا کہ میں اس کی طرف پہنچ جاؤں۔ ایک دن اس کے ساتھ گزاروں۔ پھر وہی مجھے ایئر پورٹ پر چھوڑ جائے گی۔ اس نے بشرہ سے بھی یہی بات کہہ دی تھی۔ چنانچہ بشرہ اور فاران میرا سامان لے کر صائمہ کے ہاں آ گئے۔ وہاں چائے وغیرہ پی۔ گپ شپ لگائی اور پھر وہ مجھے شمیم کے ہاں لے گئے۔ صائمہ اور نسیم نے بڑی تعظیم اور محبت دی مجھے۔ انہیں خوش دیکھ کر دلی خوشی ہوئی تھی۔

میں شمیم کے ہاں آ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد بشرہ اور فاران مجھے چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ ان سے جدا ہوتے ہوئے بھی میں دلگرفتہ تھی۔ کتنے پیار سے دونوں نے مجھے اپنے ہاں رکھا تھا۔ ان سب کی محبتیں میں فراموش نہیں کر سکتی۔ خدا سب کو شاد و آباد رکھے۔

صبح جب میں بیدار ہوئی تو شمیم ہوسپٹل جا چکی تھی۔ گھر میں میں بالکل اکیلی تھی۔ اتنا بڑا گھر، ہر طرف سناٹا تھا۔ باہر سے بھی کسی کے چلنے پھرنے ہنسنے بولنے کی آواز نہ آ رہی تھی۔ میرا جی اوبھنے لگا۔ شمیم کا خیال آیا۔ اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتی تھی۔ کیسے وقت گزارتی ہو گی۔ تنہائیوں سے نپٹنا کتنا مشکل کام ہے۔ میں سوچ سوچ کر ہراساں ہو رہی تھی

لیکن شمیم!

شاید وہ ان خوفناک تنہائیوں سے نباہ کر کے ان کی عادی ہو چکی ہے۔

مجھے اپنا وطن اپنی سرزمین اپنا گھر اپنے پیارے بیٹیاں نواسے نواسیاں جن کی قربتیں مجھے ہمہ وقت میسر تھیں، بے طرح یاد آنے لگے۔ ساتھ ہی شمیم کے اکیلے پن اور سونی زندگی کا سوچ سوچ کر دل دکھنے لگا۔ جب تک نسیم، رقیہ اور گڈی یہاں تھے۔ بہت رونق تھی۔ بھولے سے بھی خیال نہ آیا تھا کہ یہاں اکیلے رہنا کتنا عذاب ہے۔

دوپہر کو احمد کنیکٹیکٹ سے اتفاقاً ہی آ گیا۔ اب ہم گھر میں دو بندے تھے لیکن سنگین خاموشی پھر بھی ڈستی تھی۔

شمیم دو گھنٹے جلدی آ گئی۔ مجھے ایئر پورٹ ڈراپ کرنے جانا تھا۔ گھر میں کچھ چہل پہل آمنہ اور آصف کے آنے سے بھی ہو گئی۔ وہ بھی مجھے خدا حافظ کہنے آئے تھے۔

میرا سامان تیار تھا۔ میں خود بھی تیار تھی۔ کینڈی ایئر پورٹ تک تقریباً تین گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ ابھی جانے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس لیے ہم سب چائے پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میرا دل اندر ہی اندر شمیم کی سونی زندگی کا سوچ سوچ کر دکھ رہا تھا۔ آخر میں نے کہہ ہی دیا۔ ''شمو..... میرے جانے کے بعد تو تم اتنے بڑے گھر میں بالکل اکیلی رہ جاؤ گی۔'' وہ ہنس پڑی۔ بولی۔ ''آپا آپ کو اب احساس ہوا ہے۔ میں تو ہمیشہ سے اکیلی ہوں۔ بچے پڑھائیوں کے سلسلے میں یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔ اب شادیاں کر کے الگ ہو گئے۔ تنہائیاں میرا مقدر تھیں۔ اب تو ان سے نباہ کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔''

میں نے بے اختیارانہ سے گلے لگا لیا۔

اور

ہم دونوں آبدیدہ ہو گئیں۔

شام احمد اور وہ مجھے ایئر پورٹ چھوڑ آئے۔ اب میں پورے اعتماد سے اپنی

فلائٹ کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ کویت میں بھی جہاز بدلنے کا کوئی دھڑکا نہ تھا۔ میں بڑے آرام سے اپنے پیارے پاکستان میں واپس آ گئی۔

لاہور ایئرپورٹ پر میری بیٹیاں مجھے لینے آئی ہوئی تھیں۔ ان سے یوں لگا برسوں سے بچھڑی تھی۔ گھر پہ بچے، بڑے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ان سے مل کر جتنی خوشی ہوئی، بیان سے باہر ہے۔ اپنا وطن اپنا گھر اپنے بچے' لگ رہا تھا اس سے بڑی دنیا میں کوئی چیز ہی نہیں۔

امریکہ جیسا بہت بڑا بہت امیر بہت متمدن ملک بھی نہیں۔

ہاں موقع ملے تو امریکہ دیکھنا ایک خوشگوار تجربہ ضرور ہے۔ بالکل نئی دنیا۔ جہاں کے لوگ، سسٹم، صفائی، طور طریق ہمارے ملک سے بالکل مختلف۔

لیکن

اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے۔

رضیہ بٹ

THE END

